اردو شرح

انوار الباری

صحیح البخاری

مجموعۂ افادات

امام العصر علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ

ودیگر اکابر محدثین رحمہم اللہ تعالیٰ

مؤلفہ تلمیذ علامہ کشمیری

حضرۃ مولانا سید احمد رضا صاحب بجنوری رحمہ اللہ

ادارۂ تالیفاتِ اشرفیہ چوک فوارہ ملتان پاکستان

(061-4540513-4519240)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انوار الباری
اردو شرح
صحیح البخاری

انوار الباری (جلد ۳-۴)

تاریخ اشاعت............ شعبان المعظم ۱۴۲۷ھ
ناشر........................ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان
طباعت.....................سلامت اقبال پریس ملتان

جلد ۳-۴

مجموعۂ افادات

امام العصر علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ

و دیگر اکابر محدثین رحمہم اللہ تعالیٰ

مؤلفہ

حضرت مولانا سید احمد رضا صاحب بجنوری

(تلمیذ علامہ کشمیریؒ)

ادارۂ تالیفات اشرفیہ

چوک فوارہ ملتان پاکستان

☎061-540513-519240

فہرست مضامین

مضمون	صفحہ
مقدمہ	۱۵
کتاب الوحی	۱۹
وحی اور اس کی عظمت	۲۰
گھنٹی کی آواز کی طرح	۳۱
انبیاء علیہم السلام کا سب سے بڑا وصف امتیازی وحی ہے	۳۵
برکات وانوار نبوت ونزول وحی	۳۶
ابتداء نبوت ونزول قرآن مجید	۳۶
نبی کے دل میں فرشتے کا القاء بھی وحی ہے	۳۷
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول وحی کا ایک منظر	۳۷
وحی کے انتظار میں آسمان کی طرف نظر اٹھانا	۳۷
شدۃ وحی کی کیفیت	۳۷
وحی الٰہی کا ثقل عظمت	۳۸
سب سے بڑا معجزہ قرآن مجید اور علمی ترقیات کا دور	۳۸
قرآن مجید کا ادب واحترام	۳۸
شرح حدیث	۴۲
عالم مثال	۴۲
عالم خواب	۴۲
انتخاب حراء	۴۲
عطاء نبوت ونزول وحی	۴۳
دبانے کا فائدہ	۴۴
عہد نبوت کا ایک زریں باب	۵۶
حروب روم وفارس	۵۷
فارس کی فتح اور روم کی شکست کے اثرات	۵۷
غلبۂ روم وشکست فارس	۵۷
فتوحات اسلامیہ وصلح حدیبیہ	۵۸
صلح حدیبیہ کے فوائد ونتائج	۵۸
فتح مبین	۵۹
فتح مکہ معظمہ کے حالات	۵۹
سیاسی تدابیر کے فوائد	۵۹
ابوسفیان پر مکارم اخلاق کا اثر	۵۹
اسلامی حکومت رحمت عالم تھی	۶۰
حدیث ہرقل	۶۰
ایمان ہرقل	۶۱
مکاتیب رسالت	۶۱
زوال کسریٰ وعروج حکومت اسلام	۶۱
کتاب الایمان	۶۲
حقیقت ایمان	۶۳
ایمان واسلام کا فرق	۶۳
ایمان واعمال کا رابطہ	۶۴
ایمان کا درجہ	۶۴

عنوان	صفحہ
حضرت نانوتویؒ کی تحقیق	۶۴
حضرت مجدد صاحبؒ کی تحقیق	۶۴
شیخ دباغ کے ارشادات	۶۵
بخاریؒ کا ترجمۃ الباب	۶۶
امام بخاریؒ کی شدت	۶۶
اہل حق کا اختلاف	۶۸
حضرت شاہ صاحبؒ کا ارشاد	۶۸
امام بخاریؒ کا امام صاحب کو مرجی بتلانا	۶۹
طعن ارجاء کے جوابات	۷۰
امام صاحب کی تائید دوسرے اکابر سے	۷۰
علامہ شعرانی سے تشریح ایمان	۷۲
ابن حزم	۷۲
امام غزالی	۷۲
قاضی عیاض	۷۲
نواب صاحب	۷۳
امام بخاری اور دوسرے محدثین	۷۳
اساتذہ امام بخاری	۷۳
امام بخاریؒ کے چھ اعتراض	۷۳
ایمان کے ساتھ استثناء کی بحث	۷۸
ایک اہم غلط فہمی کا ازالہ	۸۲
امام بخاریؒ اور ان کا قیاس	۸۲
امام بخاریؒ کے دلائل پر نظر	۸۴
مراتب ایمان واعمال پر دوسری نظر	۸۸
حضرت شاہ صاحب کا جواب	۹۰
امام صاحب کی دقت نظر	۹۰
حافظ عینی کے ارشادات	۹۱
داغ عبدیت وتاج خلافت	۹۴
عبادات کی تقسیم	۹۵
روزہ وحج کا ارتباط	۹۵
ایمان کی کتنی شاخیں ہیں	۹۷
یک اہم علمی فائدہ	۱۰۲
اختلاف جوابات کی وجوہ	۱۰۴
حسد وغبطہ کا فرق	۱۰۴
جہاد کی تشریح سے اجتناب	۱۰۸
طاعات وعبادات کی ضرورت	۱۱۰
باب حلاوۃ الایمان	۱۱۲
''حلاوت ایمان کے بیان میں''	۱۱۲
شیخ ابوالعباس اسکندرانی کا ارشاد	۱۱۴
حضرت ابراہیم ادہم کا ارشاد	۱۱۴
حضرت جنید رحمہ اللہ کا ارشاد	۱۱۴
شیخ اسکندرانی کا بقیہ ارشاد	۱۱۴
علمی فائدہ	۱۱۵
اشکال وجواب	۱۱۵
حضرت شاہ صاحبؒ کی رائے	۱۱۶
حضرت شاہ صاحبؒ کی نکتہ رسی	۱۱۶
انصار مدینہ کے حالات	۱۱۷
ایک انصاری جنتی کا واقعہ	۱۱۸
حدود کفارہ ہیں یا نہیں؟	۱۲۰

عنوان	صفحہ
بیعت اوران کی اقسام	۱۲۲
امام اعظمؒ سے تعصب	۱۲۶
عصمت انبیاء علیہم السلام	۱۲۷
انبیاء کی سیرت، صفات، ملکات	۱۲۹
عصمت انبیاء کے متعلق مختلف نظریات اور حقیقت عصمت	۱۳۱
وجوہ واسباب عصمت	۱۳۲
صحابہؓ معیار حق ہیں	۱۳۳
ایک شبہ اوراس کا ازالہ	۱۳۳
شرک فی التسمیہ والی لغزش بے بنیاد ہے	۱۳۴
شک فی الاحیاء والی لغزش بے بنیاد ہے	۱۳۵
عصمت انبیاء کے متعلق حضرت نانوتویؒ کی تحقیق	۱۳۸
بقیہ فوائد متعلقہ حدیث باب	۱۳۹
اشکال وجواب	۱۴۰
دوسرا اشکال وجواب	۱۴۰
حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کا ارشاد	۱۴۰
عتاب نبوی کا سبب	۱۴۰
حضرت شاہ صاحب کے بقیہ جوابات	۱۴۳
شیخ اکبرؒ کی رائے	۱۴۴
امام بخاریؒ کے استدلال پر ایک نظر	۱۴۴
نکتہ بدیعہ	۱۴۵
ایمان وکفر امم سابقہ میں	۱۴۶
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات وخدمات	۱۴۶
ترجمان القرآن کا ذکر	۱۴۸
مولانا آزاد کی سیاسی خدمات	۱۴۹
وزن اعمال	۱۴۹
امام غزالی کا استنباط	۱۵۰
حکم تارک صلوٰۃ	۱۵۵
خلفاء راشدین کا منصب	۱۵۶
حکم تارک صوم	۱۵۷
ایک خدشہ کا جواب	۱۵۸
چند سوال وجواب	۱۵۸
تبلیغ دین کی ضرورت اوراس کا کامیاب عملی پروگرام	۱۵۹
قتال وجہاد	۱۵۹
حج پر جہاد کا تقدم	۱۶۰
فرض کفایہ کی اہمیت	۱۶۰
اسلام جہاد کا مقصد	۱۶۰
فضائل جہاد وشہادت	۱۶۱
جہاد وشہادت کے اقسام	۱۶۳
مسئلہ قتال تارکین واجبات اسلام	۱۶۳
دارالاسلام ودارالحرب کے متعلق علامہ کشمیریؒ کی تحقیق	۱۶۴
پہلا مکتوب	۱۶۶
دوسرا مکتوب گرامی	۱۶۷
مکتوب گرامی حضرت شیخ الحدیث مولانا العلام محمد زکریا سہارنپوری رحمہ اللہ	۱۶۷
مکتوب گرامی حضرت المحدث العلام مولانا المفتی سید محمد مہدی حسن شاہ جہانپوری رحمہ اللہ	۱۶۷
مکتوب گرامی حضرت المحدث العلام مولانا المفتی محمد شفیع دیوبندی رحمہ اللہ کرم فرماء محترم مولانا احمد رضا صاحب دام فضلہٗ	۱۶۸

مکتوب گرامی حضرت المحدث العلام مولانا ابوالوفا افغانی زبدۃ الخلان واخلص الاخوان سیادت مآب مولانا سید احمد رضا صاحب دام مجدہ	۱۶۹
تبصرۂ گرامی مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی رحمۃ اللہ علیہ	۱۷۰
مکتوب گرامی جناب مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی (صدر شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)	۱۷۰
مکتوب گرامی محترم مولانا عزیز احمد صاحب بہاری دامت فیوضہم	۱۷۱
مکتوب گرامی محترم مولانا امتیاز علی صاحب	۱۷۱
مکتوب گرامی محترم مولانا محمد ایوب صاحب قادری رحمۃ اللہ	۱۷۱
مکتوب گرامی شیخ التفسیر مولانا ذاکر حسن صاحب دامت فیوضہم	۱۷۲
مکتوب گرامی مولانا حکیم محمد یوسف صاحب قاسمی بنارسی دامت فیوضہم	۱۷۶
جلد چهارم	۱۷۹
جہاد فی سبیل اللہ	۱۸۶
خوف قتل کی وجہ سے اسلام لانا	۱۸۸
استسلام کی صورت	۱۸۸
اَرٰی اور اُرٰی کا فرق	۱۸۸
اومسلما کا مطلب	۱۸۸
جعیل بن سراقہ کی مدح	۱۸۹
ایک اشکال وجواب	۱۸۹
حدیث سے ترجمہ کی مطابقت	۱۸۹
شوہر کے حقوق	۱۹۵
بقیہ تشریح حدیث الباب	۱۹۵
کل تعداد احادیث بخاری شریف	۱۹۶
حافظ ابن حجر کی رائے پر تنقید	۱۹۸
حافظ ابن تیمیہ کی تحقیق	۱۹۸
امام بخاریؒ وحافظ ابن تیمیہؒ کے نقاطِ نظر کا اختلاف	۱۹۹
امام بخاریؒ کا بلند پایہ علمی مقام	۱۹۹
ایک اشکال اوراس کا حل	۲۰۰
حضرت گنگوہیؒ کا ارشاد	۲۰۰
امام بخاری کا مقصد	۲۰۱
ایک اہم مغالطہ اوراس کا ازالہ	۲۰۱
جنگ جمل وجنگ صفین	۲۰۳
معاصی سے مراد کبائر ہیں	۲۰۷
ایک اشکال اور جواب	۲۰۷
اصل مقصد ترجمہ بخاری	۲۰۸
تائید حق	۲۰۸
شرک وکفر میں فرق	۲۰۸
ایک اہم اشکال اور جواب	۲۰۹
ایک اہم علمی ودینی فائدہ	۲۰۹
مشاجرات صحابہ رضی اللہ عنہم	۲۱۰
حضرت علیؓ اور خلافت	۲۱۰
تکمیل بحث	۲۱۰
ظلم وقتل کا فرق	۲۱۱
مقصد سوالِ معرور اور عربوں کا حال	۲۱۳
زمانہ رسالت کے چند حالات	۲۱۴
فیض رسالت	۲۱۵
حضرت ابوذرؓ کا مقام رفیع	۲۱۵
سب صحابہ کا مسئلہ	۲۱۶

عنوان	صفحہ
حکم روافض	۲۱۶
حضرت ابوذر غفاریؓ کا مسلک	۲۱۶
حضرت عمر بن عبدالعزیز کی رائے	۲۱۶
کنز سے کیا مراد ہے	۲۱۷
تحقیق صاحب روح المعانی	۲۱۷
حضرت ابوذرؓ کی رائے دوسرے صحابہؓ کی نظر میں	۲۱۸
واقعہ ابی ذر اور شیعی تحریف	۲۱۸
اسلام کا معاشی نظام	۲۱۸
معاشی مساوات	۲۲۰
سوال وجواب	۲۲۴
اعتراض وجواب	۲۲۴
دقیق علمی فائدہ	۲۲۴
باب علامة المنافق	۲۲۵
منافق کی علامتوں کا بیان	۲۲۵
حضرت شاہ صاحب کی تحقیق	۲۲۹
تحقیق بیضاوی پر تنقید	۲۲۹
حافظ ابن تیمیہؒ کا مسلک	۲۲۹
ایک شبہ اور جواب	۲۲۹
علامہ نووی وقرطبی کی تحقیق	۲۳۰
عینی وحافظ کی تحقیق	۲۳۰
باب قيام ليلة القدر من الايمان	۲۳۰
شب قدر کا قیام ایمان سے ہے	۲۳۰
ایمان واحتساب کی شرط	۲۳۲
حضرت شاہ صاحب کی تحقیق	۲۳۲
باب الجهاد من الايمان	۲۳۳
(جہاد ایمان کا ایک شعبہ ہے)	۲۳۳
شبِ قدر وجہاد میں مناسبت	۲۳۵
حضرت شاہ صاحب کی رائے	۲۳۶
درجہ نبوت اور تمنائے شہادت	۲۳۶
مراتب جہاد	۲۳۶
ہجرت وجہاد	۲۳۷
باب تطوع قيام رمضان من الايمان	۲۳۸
(تطوع قیام رمضان بھی ایمان کا شعبہ ہے)	۲۳۸
جماعتِ نوافل اور اکابرِ دیوبند	۲۴۱
بعض کبار ائمہ حدیث تراویح کو بھی مساجد میں غیر افضل کہتے ہیں	۲۴۵
حدیث الباب کا اوّلی مصداق	۲۴۶
افادات انور	۲۵۵
حافظ ابن تیمیہؒ کی غلطی	۲۵۵
حدیث الباب کی اہمیت	۲۵۷
ایک غلط فہمی کا ازالہ	۲۵۷
قبلہ کے متعلق اہم تحقیق	۲۶۰
حافظ ابن قیمؒ کی رائے	۲۶۱
قبلہ کی تقسیم حسب تقسیم بلاد	۲۶۱
دونوں قبلے اصالۃً برابر تھے	۲۶۲
اہم علمی نکات	۲۶۲
تاویلِ قبلہ والی پہلی نماز	۲۶۲
حافظ وعلامہ سیوطیؒ	۲۶۳

عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ
مدینہ میں استقبالِ بیت المقدس کی مدت	۲۶۳	علامہ قسطلانی کی رائے	۲۷۲
یہود واہلِ کتاب کی مسرت وناراضگی	۲۶۳	نواب صاحب کی تنقید	۲۷۳
تحویلِ قبلہ سے قبل کے مقتولین	۲۶۴	تنقیح وتبصرہ	۲۷۳
نسخ احکام کی بحث	۲۶۵	حافظ کی فروگزاشت	۲۷۳
دلیل جوازِ نسخ سنت بہ قرآن مجید	۲۶۶	بڑا بننے کا طعنہ	۲۷۳
علمی افادہ	۲۶۶	نواب صاحب کی دوسری غلطی	۲۷۴
باب حسن اسلام المرء	۲۶۷	اساءۃِ اسلام والی حدیث پر بحث	۲۷۴
انسان کے اسلام کی خوبی	۲۶۷	امام بخاریؒ کی رائے	۲۷۴
اجرِ عظیم کے اسباب ووجوہ	۲۶۸	علامہ خطابی کا ارشاد	۲۷۴
صدقہ وامداد کا اجرِ عظیم	۲۶۸	حافظ ابن حجر کی تنقیح	۲۷۴
نماز کی غیر معمولی فضلیت	۲۶۹	اختلاف کی اصل بنیاد	۲۷۵
اسلام کی اچھائی یا برائی کے اثرات	۲۶۹	جمہور کی طرف سے جواب	۲۷۵
حضرت شاہ صاحب کی رائے	۲۶۹	قابل توجہ	۲۷۵
طاعات وعبادات کا فرق	۲۶۹	امام احمدؒ کے جوابات	۲۷۵
عذاب ہائے کفار کا باہم فرق	۲۷۰	امامِ اعظم کا عمل بالحدیث	۲۷۶
اسلام کی اچھائی وبرائی کا مطلب	۲۷۰	حضرتِ عمرو کا سفرِ آخرت	۲۷
امام نوویؒ کی رائے	۲۷۰	بحث زیادۃ ونقص ایمان	۲۷
حضرت شاہ صاحبؒ کی رائے	۲۷۰	علامہ نوویؒ کی غلطی کا ازالہ	۲۷
علامہ قسطلانی کی رائے	۲۷۰	قاضی عیاض وغیرہ کا اختلاف	۲۷
ضروری تبصرہ	۲۷۱	تنقیح مسئلہ	۲۷
قدیم الاسلام مسلمانوں کے لیے لمحہ فکر	۲۷۱	کفار کی دنیوی راحتیں	۲۷
نماز اور پردہ کی اہمیت	۲۷۱	مومنین کا معاملہ	۲۷
ہمارا اسلام اور شیر کی تصویر!	۲۷۱	نومسلموں کے لیے اصول	۲۷
حافظ اور عینی کا مقابلہ	۲۷۲	شوافع واحناف کا اختلاف	۲۸

امام الحرمین	۲۸	حافظ عینی کی رائے	۲۸
امام رازی	۲۸	حافظ ابن حجر کی رائے	۲۸
شارح حاجبیہ	۲۸	حضرت شاہ صاحب کی رائے	۲۹
ایمان میں قوت وضعف مسلم	۲۸	اتمام وقضاء نوافل	۲۹
شیخ اکبر کی رائے	۲۸	شوافع کا استدلال	۲۹
علامہ شعرانی کا فیصلہ	۲۸	حافظ کا تسامح اور عینی کی گرفت	۲۹
حضرت شاہ صاحب کی رائے	۲۸	حنفیہ کے دلائل	۲۹
ایمان میں اجمال وتفصیل	۲۸	مالکیہ حنفیہ کے ساتھ	۲۹
حافظ عینی کی محققانہ بحث	۲۸	سب سے عمدہ دلیل حنفیہ	۲۹
حافظ ابن تیمیہؒ کی رائے	۲۸	حضرت شاہ صاحب کا فیصلہ	۲۹
حافظ ابن تیمیہؒ کا مقصد	۲۸	بحث وجوب وتر	۲۹
علامہ عثمانی کا ارشاد	۲۸	عدم زیادۃ ونقص	۲۹
امام اعظم کی گرانقدر رہنمائی	۲۸	حضرت شاہ صاحبؒ کی رائے	۲۹
طعن ارجاء درست نہیں	۲۸	علامہ سیوطیؒ کے قول پر تنقید	۲۹
تکمیل بحث	۲۸	اہل حدیث کا غلط استدلال	۲۹
حافظ ابن تیمیہؒ کے قول پر نظر	۲۸	درجہ وجوب کا ثبوت	۲۹
نواب صاحب کا مغالطہ	۲۸	مراعات واستثناء	۲۹
اجمال وتفصیل کا فرق	۲۸	حلف غیر اللہ کی بحث	۲۹
بدع الالفاظ کی بات	۲۸	حضرت شاہ صاحب اور علامہ شوکانی	۲۹
افادہ انور	۲۸	علامہ شوکانی پر تنقید	۲۹
مسلمانوں کی عید کیا ہے	۲۸	قسم لغوی وشرعی	۲۹
افادات انور	۲۸	شعراء کے کلام میں قسم لغوی	۲۹
نواب صاحب اور عدم تقلید	۲۸	نواب صاحب کی تحقیق	۲۹
حضرت ضمام کا سال حاضری	۲۸	قاضی بیضاوی کا جواب	۲۹

عنوان	صفحہ
نماز جنازہ کہاں افضل ہے	۲۹
مسلک شوافعؒ	۲۹
امام صاحب پر تعریض	۳۰
ائمۂ حنفیہ کے عقائد	۳۰
محدث ایوب کی حق گوئی	۳۰
حافظ ابن تیمیہؒ اور عقائد حنفیہؒ	۳۰
ابن تیمیہؒ منہاج السنہ میں	۳۰
امام بخاری کی جزء القراءۃ	۳۰
امام صاحب اور امام احمدؒ	۳۰
علامہ طوفی حنبلی کا دفاع عن الامام	۳۰
مولانا عبیداللہ مبارکپوریؒ کا تعصب	۳۰
علامہ زبیدی کا ارشاد	۳۰
معتزلہ اور امام صاحب	۳۰
عمرو بن عبید اور امام صاحب	۳۰
امام بخاریؒ کی کتاب الایمان	۳۰
امام بخاری اور امام اعظم	۳۰
امام بخاریؒ اور حافظ ابن تیمیہؒ	۳۰
امام بخاری رحمہ اللہ	۳۰
امام اعظم رحمہ اللہ	۳۰
ایمان کے بارے میں مزید تحقیق	۳۰
مراتب ایمان کا تفاوت	۳۰
شب قدر باقی ہے	۳۰
حدیث کا ربط ترجمہ سے	۳۰
حضرت شاہ صاحب کی تحقیق	۳۰
بحث و نظر....ترجمہ حدیث کی مطابقت حافظ عینیؒ کی نظر میں	۳۰
حافظ ابن حجر پر تنقید	۳۰
دو ترجمے اور دو حدیث	۳۰
قاضی عیاض کی تحقیق اور سوال و جواب	۳۰
افادات انور رحمہ اللہ	۳۰
حافظ ابن حجر کی تصریحات	۳۱
حافظ کے نزدیک ماحصل کلام بخاریؒ	۳۱
حافظ کا فیصلہ	۳۱
فیصلہ حافظ کے نتائج	۳۱
حدیث جبریل کی اہمیت	۳۱
حضرت شاہ صاحب کی مزید تحقیق	۳۱
امام بخاری کا جواب محل نظر ہے	۳۱
دونوں حدیث میں فرق جواب کی وجہ	۳۱
واعظ و معلم کی مثال	۳۱
ایمان کا تعلق مغیبات سے ہے	۳۱
لقاء اللہ کا مطلب	۳۱
حضرت شاہ صاحب کی تحقیق	۳۱
فلسفہ یونان اور عقول	۳۱
دیوتا و اوتار	۳۱
اسلام میں لقاء اللہ کا عقیدہ	۳۱
مسافتہ درمیان دنیا و آخرت	۳۱
احسان کی حقیقت	۳۱
دو مطلوب حالتیں اور ان کے ثمرات	۳۱
علامہ نووی کی شرح	۳۱

کون سی شرح راجح ہے	۳۱	خرم کا جواز وعدم جواز	۳۲
علامہ عثمانی کے ارشادات	۳۱	علمی تحقیق	۳۲
استغراق ومحویت کے کرشمے	۳۱	حضرت شاہ صاحب کے تشریحی ارشادات	۳۲
افادات انور	۳۱	حافظ تقی الدین وعلامہ شوکانی کا ذکر	۳۲
شریعت، طریقت وحقیقت	۳۱	حدیث الباب اور علامہ نوویؒ	۳۲
امام غزالی کا ارشاد	۳۱	مشتبہات اور خطابی	۳۲
ایمان واسلام کا باہمی تعلق	۳۲	علامہ قسطلانی کی رائے	۳۲
قرب قیامت اور انقلاب احوال	۳۲	نواب صاحب کی رائے	۳۲
فی خمس اور علم غیب	۳۲	بحث ونظر.... تحقیق مشتبہات	۳۲
علم غیب سے مراد	۳۲	حضرت شاہ صاحبؒ کی رائے	۳۲
کون سا علم خدا کی صفت ہے	۳۲	دوسرا اشکال وجواب	۳۲
پانچ کا عدد کس لیے	۳۲	قلب کے خصائص وکمالات	۳۲
امام بخاریؒ کے وجوہ استدلال پر نظر	۳۲	تحقیق لطائف	۳۲
''زبردست شہادت'' پر نقد ونظر	۳۲	عقل کا محل کیا ہے	۳۲

انوار الباری

۳

اردو شرح

صحیح البخاری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مُقدّمہ

نحمده ونصلی علیٰ رسوله الکریم

مقدمہ انوار الباری کی دو جلدوں کے بعد انوار الباری (شرح بخاری شریف) کی تالیف حق تعالیٰ جل ذکرہ کے بھروسہ پر شروع کر دی گئی اور محض اس کی توفیق وتیسیر سے اس کی پہلی جلد پیش ہے' کسی حدیث کی شرح یا اس پر بحث ونظر کے سلسلہ میں جو کچھ مواد مل سکا' اس کو یکجا کرنے کی سعادت حاصل کی گئی۔ امید ہے کہ ناظرین پسند کریں گے' اور استفادہ کے ساتھ اپنی خصوصی دعوات وتوجہات نیز ضروری اصلاحات سے نوازیں گے۔ تمام مخلصین خصوصاً اہل علم کے مشورے قدر ومنزلت کے ساتھ قبول کئے جائیں گے۔

انوار الباری کی تشریحات اور بحث ونظر سے بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ علماء کرام ومحدثین عظام نے علوم نبوت کی خدمت گذاری میں کیسی کچھ کاوشیں کی ہیں اور اس آخری دور میں ہمارے حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ نے اپنے وسیع علم ومطالعہ سے جو گراں قدر خدمات انجام دیں۔ وہ کس قدر بلند پایہ ہیں' مولانا عطاء اللہ شاہ صاحب بخاریؒ نے جو حضرت شاہ صاحب کے بارے میں فرمایا تھا کہ "صحابہ کا قافلہ جارہا تھا' یہ پیچھے رہ گئے تھے' (یقیناً یہ مختصر جملہ حضرت شاہ صاحب کے علمی وعملی کمالات کا صحیح تعارف ہے اور انوار الباری کے انوری افادات امید ہے کہ اسی اجمال کی امکانی تفصیل ہوں گے' انشاء اللہ تعالیٰ۔

انوار الباری پڑھ کر آپ ضرور حیرت کریں گے کہ صدیوں کے بعد ہزاروں میل بلاد اسلامیہ عربیہ سے دور ایک گمنام ہندی قریہ سے ایسا بلند پایہ متبحر' محقق محدث ومفسر جامع معقول ومنقول عالم پیدا ہوا' جس نے تقریباً تیرہ سو سال کے تمام علمی دفاتر کا نہایت گہری نظر سے مطالعہ کیا' امت محمدیہ کے بڑے اور چھوٹے ایک ایک عالم کی علمی گہرائیوں کے اندازے لگائے' اور خوب لگائے اس نے اپنے علم وعقل کی کسوٹی پر ہر ایک کو پرکھا اور اس کے حق وناحق کو الگ کیا' جس میں اپنے وغیر کا ذرہ برابر فرق نہیں کیا' اس نے جس طرح کھلے دل سے غیروں کے کمالات کا اعتراف کیا' اپنوں کی خامیاں پیش کرنے سے بھی باک نہیں کیا' بلکہ کسی بڑے پر نقد کی ضرورت محسوس کی تو اس کے اظہار واعلان میں بھی تردد نہیں کیا۔

حضرت شاہ صاحبؒ سے قبل یا بعد کسی کے درس حدیث کی یہ خصوصیت سامنے نہیں آئی کہ کسی حدیث کی شرح یا بحث ونظر کے وقت متقدمین ومتاخرین کی تحقیقات پر پوری بصیرت کے ساتھ فیصلے کئے گئے ہوں' ہر ایک کی شرح وتحقیق کو قرآن وسنت کے معیار پر رکھ کر خدا لگتی بات کہی گئی ہو۔ آپ نے صحیح بخاری شریف کا درس دیا تو اس شان سے کہ نہ "صحیح" کی شان رفیع نظروں سے گری' نہ امام بخاری کے

خداداد بہترین اوصاف و کمالات اوجھل ہوئے اور ساتھ ہی امام بخاری کی بشری خامیاں اور نقائص بھی پردے میں نہ رہے۔ انوارالباری میں جگہ جگہ امام بخاری کے تراجم ابواب ان کے فقہی نظریات ائمہ اربعہ کی موافقات و مخالفات پر بےلاگ تبصرے آئیں گے جو علم و تحقیق کی جان ہیں امام بخاریؒ بدء وحی کے بعد سب سے بڑا موضوع کتاب الایمان کا لائے ہیں جس کے تحت بہت سے ابواب اور بہ کثرت احادیث و اقوال جمع کیے۔ علامہ قسطلانی شافعیؒ شارح بخاری شریف نے لکھا کہ امام بخاری کی غرض ان تمام ابواب سے یہی ثابت کرنا ہے کہ اعمال اجزاء ایمان ہیں اور یہ بھی علامہ موصوف نے امام بخاری کے ترجمۃ الباب باب من قال ان الایمان ھو العمل '' کے تحت لکھا کہ امام بخاری کا مقصد اس قسم کے ابواب سے ان حضرات کا رد کرنا ہے جو عمل کو داخل ماہیت ایمان نہیں کہتے لیکن امام بخاریؒ نے جو اپنے دعویٰ پر دلیل پیش کی ہے اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ عمل کا تعلق ایمان سے جزئیت کا ہے البتہ صرف ایمان پر عمل کے اطلاق کا جواز نکل سکتا ہے جس سے کسی کو اختلاف نہیں ہے کیونکہ اس کو سب ہی مانتے ہیں کہ ایمان بھی تصدیق قلبی ہونے کی حیثیت سے ایک عمل قلب ہے'' (اس لیے اعمال میں اس کا بھی شمار ہو سکتا ہے حالانکہ نزاع جو کچھ ہے وہ اعمال جوارح میں ہے عقائد یا اعمال قلب میں نہیں ہے)

غرض امام بخاری نے ایک ایک عمل جوارح کو لے کر باب کا عنوان باندھا کہ یہ بھی ایمان کا جزو ہے وہ بھی ایمان کا جزو اور یہ بھی فرمایا کہ میں نے کسی ایسے شخص سے اپنی صحیح میں روایت نہیں کی جو ایمان کو قول و عمل کا مجموعہ مرکب نہ مانتا ہو۔ نیز فرمایا کہ میں ایک ہزار سے زیادہ علماء سے ملا جو سب ہی ایمان کو قول و عمل کہتے تھے ظاہر ہے کہ یہ سب تعریضات مرجئہ اہل بدعت سے متعلق نہیں ہو سکتیں بلکہ ان کے چھینٹے ائمہ حنفیہ پر بھی ضرور پڑتے ہیں اس لیے امام بخاری کے اس قدر شدید رویہ کے مقابلہ میں معمولی مدرسی جوابات سے کام نہیں چل سکتا اب ملاحظہ فرمایئے کہ ہمارے حضرت شاہ صاحب نوراللہ مرقدہ نے کس طرح جواب دہی فرمائی اور اس سے ناظرین اندازہ کرلیں گے کہ درس بخاری کا حق حضرت شاہ صاحب ایسے محقق واسع الاطلاع بحر مواج ہی کا تھا ۔ ہر ہوسنا کے نداند جام و سنداں باختن

آپ نے ارشاد فرمایا (۱) امام بخاریؒ نے فرمایا کہ سلف کا قول ایمان کے بارے میں قول و عمل یزید و ینقص تھا انہوں نے سلف کے قول کو اختصار مخل کے ساتھ پیش کیا سلف کا پورا قول یہ تھا الایمان یزید بالطاعۃ وینقص بالمعصیۃ امام بخاری نے طاعت و معصیت کے الفاظ کم کردیے۔ چنانچہ علامہ عینیؒ نے صفحہ ۱۲۶ میں حافظ ابوالقاسم لالکائی کی کتاب شرح اصول اعتقاد اہل السنۃ والجماعۃ سے بھی یہی الفاظ نقل کیے جس کی تفصیل ہم نے صفحہ ۹۷/۱۱ اور صفحہ ۱۲۷/۱۲ انوارالباری میں پیش کی ہے اور علامہ قسطلانی نے شرح بخاری میں کتاب الایمان کی پہلی حدیث کے تحت بھی یہی لکھا کہ ایمان میں طاعت و معصیت سے زیادتی و کمی کو ابونعیم نے حلیہ میں ذیل ترجمہ امام شافعی نقل کیا ہے۔

نیز فرمایا (۲) امام بخاری کا یہ فرمانا کہ ایک ہزار سے زیادہ علماء سے ملا الخ یہ خود بھی اس نظریہ کی کمزوری ظاہر کرتا ہے کیونکہ ضروریات دین کے بارے میں اس طرح ہزار پانچ سو کے اقوال نقل نہیں ہوا کرتے نہ ان کے بارے میں سوال ہوا کرتا ہے (وہ تو عوام و خواص سب ہی کو معلوم ہوا کرتے ہیں) عاجز راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ بظاہر امام بخاری نے ایک ہزار کے عدد کو اہمیت دی ہے حالانکہ اس وقت کی اسلامی دنیا لاکھوں علماء سے پٹی پڑی تھی۔ چپہ چپہ پر محدثین کبار بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک ایک محدث کے درس میں تیس تیس ہزار اور چالیس چالیس ہزار تلامذہ جمع ہوتے تھے اور وہ سب اپنے وقت کے متبحر محدث و مفسر ہوتے تھے کوفہ بصرہ مکہ معظمہ مدینہ منورہ اور ملک شام تو بڑے بڑے علمی مرکز تھے اس لیے ایک ہزار کی اقل قلیل اقلیت کی کیا اہمیت ہے پھر بقول حضرت شاہ صاحب ان ایک ہزار کے اقوال بھی صرف ان تک ہی محدود ہیں کسی نے یہ نہیں کہا کہ ہم نے یہ قول صحابہ و تابعین سے حاصل کیا ہے یہ تو ایسا ہے کہ جیسے ایک حلقۂ خیال کے لوگ یا ایک استاذ کے سب تلامذہ ایک ہی بات کہا کرتے ہیں اس سے زیادہ اس کی اہمیت نہیں ہے اس کے علاوہ ہم نے متعدد جگہ انوارالباری میں دوسرے اکابر و ائمہ محدثین کے اقوال بھی پیش کیے ہیں جو ائمہ حنفیہ کی تائید و موافقت میں ہیں۔ انوارالباری کی پہلی دو جلدوں میں کتاب

2

الایمان بخاری کی مختلف جہات پر سیر حاصل ابحاث آ گئی ہیں ۔ یہ بات حضرت شاہ صاحبؒ کے درسی وغیر درسی ارشادات نیز دوسرے کثیر مطالعہ کی روشنی میں ثابت وواضح ہو چکی ہے کہ جہاں تک امام بخاری کی صحیح'' کا تعلق ہے وہ نہایت اہم مستند ترین ذخیرہ حدیث ہے اور جن احادیث کے رواۃ میں کلام کیا گیا ہے وہ بھی دوسرے اعلیٰ رواۃ ثقات کے ذریعہ قوی ہو چکی ہیں ۔ اس لیے بخاری کی تمام احادیث کو صحیح قوی اور نا قابل تنقید کہنے میں کوئی ادنیٰ تامل نہیں کیا جا سکتا' اس کے بعد صحیح بخاری کے اندر جس قدر حصہ تراجم ابواب کا ہے۔ یا امام بخاری نے جو کچھ اپنی دوسری حدیثی تالیفات میں یا تاریخ ورجال پر لکھا ہے اس پر تنقید میں کوئی مضائقہ نہیں اسی لیے ہم نے بھی امام بخاریؒ کے تذکرہ میں ان کی تالیفات پر مفصل کلام کیا' صحیح بخاری کے تراجم میں امام بخاری کے نظریات کلامی فقہی وغیرہ پر بھی بحث برابر آئے گی' جس طرح کتاب الایمان میں آئی ہے' فقہی مسائل میں حسب تحقیق حضرت شاہ صاحبؒ امام بخاری نے دوسری فقہوں کے مقابلہ میں فقہ حنفی کی موافقت زیادہ کی ہے' لیکن وہ بعض مشہور مسائل میں شوافع کی موافقت اور حنفیہ کی شدید مخالفت کے سبب نظروں سے اوجھل ہو گئی ہے' جن مسائل میں امام بخاری نے ائمہ اربعہ سے الگ ہو کر اپنا اجتہاد کیا ہے۔ ان پر بھی خاص طور سے بحث آئے گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

اس کے علاوہ ایک اہم گزارش یہ ہے کہ انوار الباری کا مقصد وحید شرح معانی احادیث ہے یہ امر آخر ہے کہ بقول امام عبداللہ ابن مبارکؒ (جن کو خود امام بخاری نے بھی اپنے زمانہ کا سب سے بڑا قرآن وحدیث کا عالم تسلیم کیا ہے) امام اعظم کے تمام فقہی مسائل ان کی ذاتی رائے نہیں ہیں بلکہ وہ سب معانی حدیث کی شرح ہیں اس لئے جتنی تائید مسلک حنفیہ کی آئے گی وہ بھی معانی حدیث کی اصح ترین شرح ہی کہلائے گی اور جہاں کہیں حدیث وقرآن' اجماع یا قیاس صحیح شرعی کی' وسے کسی حنفی مسئلہ میں کمزوری ہوگی وہ ضرور تسلیم کی جائے گی کیونکہ حضرت شاہ صاحب کے درس میں یہی طریقہ استعمال ہوتا تھا' فقہ حنفی کی جس برتری کی طرف امام حدیث عبداللہ بن مبارک نے اشارہ فرمایا اس کی نیک نامی کو معاند مخالفین کے غلط و مسلسل پروپیگنڈے سے اگر چہ کافی نقصان پہنچا ہے مگر پھر بھی بہت سے مخالفین نے اس کی بلندی مرتبت کا اقرار کسی نہ کسی نہج سے ضرور کیا ہے مثلاً حافظ ابن حجر (جنھوں نے اپنی پوری قوت اور قابلیت فقہ حنفی کی مخالفت اور فقہ شافعی کی موافقت میں صرف کی ہے) بہت سے حنفی علماء سے فرمایا کرتے تھے کہ میرا دل چاہتا ہے کہ تمہارے مذہب کو اختیار کروں' کیونکہ تمہارے مذہب کے فروع واصول میں بڑی مطابقت ہے مگر یہاں یہ بات بھی بڑی حیرت واستعجاب کے ساتھ لکھنی ہے کہ حافظ ابن حجرؒ نے اپنی اتنی بڑی تحقیق پر صرف اس لئے عمل نہ کیا کہ ابن برہان ظاہری کو وفات کے بعد خواب میں دیکھا پوچھا کیا گزری؟ کہا اب تو خیریت ہے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم آپ سے ناخوش ہیں' میں نے کہا کیوں؟ کیا تمہارے حنفیہ کی طرف میلان کے سبب سے' یہ سارا قصہ خود حافظ نے ہی ''المجمع الموسس'' میں لکھا ہے' علامہ کوثری نے مجموعہ ذیول تذکرۃ الحفاظ کے حواشی صفحہ ۳۲۸ میں لکھا کہ اس واقعہ میں بڑی عبرت ہے خصوصاً اس لئے کہ خواب کی وجہ سے حافظ نے ساری علمی تحقیق پر پانی پھیر دیا' اور خواب میں بھی ابن برہان ظاہری جیسے شخص کے کہنے کی وجہ سے جس کے علم و دیانت پر شذرات الذہب وغیرہ میں کافی نقد وجرح کی گئی ہے' ائمہ حنفیہ کے جامع ومستحکم اصول فقہیہ وحدیثیہ اور مطابقت فروع ومسائل پر ہم کسی دوسری فرصت میں سیر حاصل بحث کریں گے' انشاء اللہ تعالیٰ۔

''انوار الباری'' کے مطالعہ سے ناظرین اس امر کا اندازہ بھی بخوبی لگا سکیں گے کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے درس حدیث کا معیار کس قدر بلند کر دیا' اور آپ کے محققانہ طرز تدریس کے اثرات دوسرے علوم وفنون پر بھی پڑ رہے تھے' جس سے دار العلوم کی مرکزیت کو صحیح معنی میں چار چاند لگ گئے تھے' مگر نہایت افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ بیس سالہ ٹھوس علمی خدمات کے بعد ۴۶ھ میں جب شاہ صاحبؒ نے انتظامی نقائص کی اصلاح چاہی تو وہ درخور اعتناء نہ ہو سکی۔ آپ نے مجبور ہو کر ایک کلمہ حق (مدرسہ وقف ہے ارث نہیں) ''ارشاد فرما کر دار العلوم کی صدر مدرسی سے استعفیٰ دے دیا اور آپ کے ساتھ دوسرے اکابر وافاضل بھی احتجاجاً مستعفی ہو گئے' اس طرح دار العلوم کے آسمان علم سے

بڑے بڑے آفتاب و ماہتاب اور نجوم رشد و ہدایت ٹوٹ کر جدا ہو گئے' اور مادی اقتدار کے مقابلہ میں روحانی اقتدار کو شکست ہوئی' جس کے غیر معمولی نقصانات کی تلافی آج تک نہ ہو سکی' اور اس جیسے تابناک دور علم و اتقاء کے پھر آنے کی بحالات موجودہ کوئی توقع ہے الا ماشاء اللہ حضرت شاہ صاحب اور آپ کے رفقاء نے جن نقائص کی اصلاح سے مایوس ہو کر وہ اقدام کیا تھا' اس کے ۳۷ سال کی طویل مدت میں وہ کتنے بڑھے اور علمی انحطاط کہاں تک پہنچا' اہل علم و نظر سے مخفی نہیں' کاش! اصلاح حال کے لیے کوئی موثر سعی عمل میں آئے۔

جس سے مادر علمی دار العلوم کا علمی و عالمی وقار بھی مجروح نہ ہو۔ **واللہ الموفق والمیسر لکل عسیر۔**

دورۂ حدیث کا سال ہمارے مدارس عربیہ میں علوم و فنون کی تکمیل کا آخری سال ہوتا ہے اس لیے حضرت شاہ صاحبؒ کے درس حدیث میں تمام علوم و فنون کے مشکل و اہم مباحث پر بھی فیصلہ کن تبصرے ہوتے تھے' اور فن حدیث میں خصوصیت سے رجال' طرق و متون حدیث مذاہب ائمہ و دیگر محدثین وغیرہ پر بھی سیر حاصل بحث ہوتی تھی' اور حضرت شاہ صاحبؒ نہایت احتیاط و انضباط کے ساتھ دوسروں کے اقوال اور کتابوں کے حوالے ذکر فرماتے تھے۔ اس ہمارے درس کی یہ بھی بڑی خامی ہے کہ اساتذہ بغیر پوری مراجعت و انضباط کے اور اپنی اہم ترین ذمہ داریوں کا لحاظ کیے بغیر دوسروں کی چیزیں نقل کرتے ہیں' خصوصیت سے رجال اور طرق اسانید وغیرہ پر تو ان کی نظر بہت ہی محدود بلکہ ناقص ہے جب کہ فن حدیث میں ان امور کی اہمیت کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی افسوس ہے کہ اس دور کے بعض اساتذۂ حدیث تو یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ رجال پر بحث کی ضرورت نہیں اس سے تو پہلے لوگ فارغ ہو چکے ہیں۔ حالانکہ فن رجال کی ضرورت اور ان پر بحث و فحص کی اہمیت قیامت تک باقی رہے گی' بلکہ یہ وقت علماء احناف کے لیے اس علم میں پوری سعی و محنت و مطالعہ سے مہارت حاصل کرنے کا ہے' عمدۃ القاری' اور شروح طحاوی میں حافظ عینیؒ نے جس قدر رجال پر کلام کیا ہے' اس کا مطالعہ نہایت ضروری و مفید ہے' علامہ قاسم بن قطلو بغا کی تاج التراجم بھی چھپ گئی ہے' اسی طرح تذکرۃ الحفاظ و ذیول تذکرۃ الحفاظ مع تالیقات الکوثری وغیرہ کے مطالعہ سے کوئی استاذ حدیث مستغنی نہیں ہو سکتا' واللہ الموفق۔

''مؤلف''

ضروری نوٹ:

یہ جلد کئی بار طبع ہوئی ہے اور سوء اتفاق سے ہر طبع میں اغلاط کا اضافہ ہوتا رہا ہے۔ اس بار زیادہ وقت صرف کر کے عمدہ تصحیح کر دی گئی ہے اس لیے سابقہ طباعت والے نسخے بھی صحیح کر لیے جائیں۔ (مولف)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وحدہ والصلوٰۃ والسلام علیٰ من لا نبی بعدہ

کتاب الوحی

باب: کیف کان بدء الوحی الیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و قول اللہ عزوجل "انا اوحینا الیک کما اوحینا الیٰ نوح والنبیین من بعدہ"

ترجمہ:۔ نبی الانبیاء والامم، سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی الٰہی کی ابتدا کس طرح ہوئی؟ اور حق تعالیٰ جل ذکرہ کا ارشاد ہے کہ "ہم نے آپ کی طرف وحی بھیجی جس طرح نوح اور ان کے بعد والے انبیاء پر بھیجی تھی۔

تشریح:۔ حضرت شیخ التفسیر مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ نے لکھا کہ اس سے معلوم ہوگیا کہ وحی خاص اللہ کا حکم اور پیام ہے جو پیغمبروں پر بھیجا جاتا ہے اور انبیاء سابقین پر جیسے وحی نازل ہوئی تھی، ویسے ہی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی بھیجی تو جس نے اس کو مانا اس کو بھی ضرور ماننا چاہیے اور جس نے اس کا انکار کیا گویا وہ ان سب کا منکر ہوگیا۔ اور حضرت نوح علیہ السلام اور ان سے پچھلوں کے ساتھ مشابہت کی وجہ شائد یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے وقت سے جو وحی شروع ہوئی تو اس وقت بالکل ابتدائی حالت تھی، حضرت نوح علیہ السلام پر اس کی تکمیل ہوگئی، گویا اول حالت محض تعلیمی حالت تھی۔ حضرت نوحؑ کے زمانے میں وہ حالت پوری ہو کر اس قابل ہوگئی کہ ان کا امتحان لیا جائے اور فرمانبرداروں کو انعام اور نافرمانوں کو سزادی جائے۔ چنانچہ انبیاء اولوالعزم کا سلسلہ بھی حضرت نوح علیہ السلام سے ہی شروع ہوا اور وحی الٰہی سے سرتابی کرنے والوں پر اول عذاب حضرت نوح علیہ السلام کی وقت سے شروع ہوا، خلاصہ یہ کہ پہلے حکم الٰہی اور انبیاء کی مخالفت پر عذاب نازل نہیں ہوتا تھا بلکہ ان کو معذور سمجھ کر ڈھیل دی جاتی تھی، حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں جب مذہبی تعلیم خوب ظاہر ہوچکی اور لوگوں کو حکم خداوندی کی متابعت کرنے میں کوئی خفا باقی نہ رہا۔ تو اب نافرمانیوں پر عذاب نازل ہوا، اول حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں طوفان آیا، اس کے بعد حضرت ہودؑ حضرت صالحؑ، حضرت شعیب علیہم السلام کے زمانے میں کافروں پر قسم قسم کے عذاب آئے تو آپ کی وحی کو حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے پچھلوں کی وحی کے ساتھ تشبیہ دے کر اہل کتاب اور مشرکین مکہ کو پوری تنبیہ کردی گئی کہ جو آپؐ پر نازل شدہ وحی کو نہ مانے گا وہ عذاب عظیم کا مستحق ہوگا۔

اس آیت مبارکہ کے بعد صراطاً مستقیما تک غور سے پڑھا جائے تو معلوم ہوگا کہ وحی کی عظمت وشان کس کس طرح سے بیان کی گئی ہے شاید کسی دوسرے موقع پر اتنی تاکیدات نہ ملیں۔ اس سے امام بخاریؒ کے فہم وتتبع کی شان معلوم ہوتی ہے اس کے بعد چند روایات و آیات ذکر کیں جن سے ظاہر ہوا کہ خدا کے نبی کی نیت اعلیٰ اور خالص، نسبت نہایت ہی عالی، اور اخلاق واعمال کامل ہوتے ہیں، وہ نقص عہد، جھوٹ اور دوسری اخلاقی کمزوریوں و برائیوں سے مبرا ہوتے ہیں، حتیٰ کہ مخالفین بھی ان کے صدق، دیانت، عمدگی اخلاق وافعال کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، خدا کے نبی میں اعلیٰ ملکات علم وعمل ودیعت ہوتے ہیں، پھر ان باطنی کمالات کو مجاہدات، ریاضات، خلوت وکثرت عبادات سے جلادی جاتی ہے تاکہ ان کے پیرو بھی ظاہر وباطن کو اسی طرح مزین کریں۔

وحی اوراس کی عظمت

ہم یہاں حضرت استاذ الاساتذہ شیخ الہندؒ کی تحقیق درج کرتے ہیں۔

وحی لغت عرب میں اشارہ، کتابت، مکتوب، رسالت، الہام، القاء کو کہتے ہیں، اور اصطلاح وعرف میں اس کلام و پیام کا نام ہے جو حضرت رب العزت کی طرف سے انبیاء علیہم السلام پر نازل ہوا، واسطہ بلاواسطہ کے تفاوت اور وسائط کے اختلاف سے اس کے اقسام متعدد ہیں مگر کلام الٰہی ہونے میں سب شریک ہیں۔ زید کا کلام بلاواسطہ سنو یا بواسطۂ ہیلوگراف یا کتابت یا پیغام زبانی ہر حال میں اس کو کلام زید کہنا درست ہوگا۔

اصل کلام مضمون ومعنی ہیں، الفاظ وحروف اس کے لیے عنوان ہیں لہٰذا قرآن مجید، احادیث قدسیہ ودیگر احادیث واقوال نبویہ سب کلام الٰہی اور وحی من اللہ ہیں، عوارض خاصہ اور بعض احکام میں تو ان کا باہم امتیاز ہوا اور ضرور ہونا چاہئے مگر کلام الٰہی ہونے میں کوئی خفا نہیں، چنانچہ جملہ اکابر کے نزدیک بھی مسلم ہے کہ احادیث رسول علیہ السلام حتیٰ کہ ان کا خواب بھی وحی سمجھا جاتا ہے۔

حضرت رب العزت جل ذکرہ، سے ہم تک اس کا کلام پہنچنے میں دو واسطے ہیں، ایک وحی لانے والا فرشتہ، دوسرے جس پر وحی لے کر آیا یعنی نبی ورسول اور دونوں کی صداقت وعصمت باتفاق اہل عقل ونقل ثابت ہے، کون نہیں جانتا کہ ملائکۃ الرحمان اور انبیاء کرام مقربین بارگاہ الٰہی ہیں؟

وحی الٰہی چونکہ نہایت عظیم المرتبت چیز ہے، اور اس کے نزول کی بھی خاص شان ہوتی ہے، اس لیے جو وحی حضرت رسول اکرم نبی الانبیاء والامم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی وہ چونکہ آپ کے خصوصی فضل وامتیاز اور علو مرتبت وقرب الٰہی کے باعث سب سے اعلیٰ درجہ کی وحی ہے 'امام بخاریؒ' نے اس کے خاص حالات وکیفیات کو بیان کرنے کے لیے سب سے پہلے اسی کا باب قائم کیا جس سے اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ جملہ اصول وفروع حتیٰ کہ ایمان وعلم کا ماخذ ومنشاء بھی وحی الٰہی ہے اور تمام فروع واصول وہی معتبر ہو سکتے ہیں جن کا ماخذ وحی ہو۔ اور اس کتاب میں بھی جو کچھ مذکور ہوگا، اصول ہوں یا فروع، عبادات ہوں یا معاملات وغیرہ سب کا ماخذ وحی ہوگی۔

غرض دو باتوں کا خیال یہاں ضروری ہے اول یہ کہ لفظ وحی میں جملہ اقسام وحیٔ، وحی متلو قرآن مجید اور غیر متلو (حدیث وغیرہ) داخل ہیں، دوسرے یہ کہ ابتداء وحی سے کوئی خاص ابتداء مقصود نہیں بلکہ عام ہے خواہ بلحاظ زمانہ ہو یا بلحاظ مکان، باعتبار احوال ہو یا بلحاظ اوصاف اسی لیے امام بخاریؒ آیت مذکورہ لائے، جس سے معلوم ہوا کہ مبدء وحی (جہاں سے یہ کلام صادر ہوئے) وہ حق تعالیٰ جل ذکرہ کی برتر ذات ہے اور جن پر ہر زمانے میں اور مختلف حصص عالم میں اس کی وحی آتی رہی، وہ انبیاء کرام علیہم السلام کی مقدس ومطہر ذوات ہیں۔ اسی طرح وحی الٰہی کا سب سے اعلیٰ اور تمام سابقہ وحیوں کا خلاصہ ومجموعہ خاتم النبیین سرور انبیاء ومرسلین سیدنا ومولانا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات منبع البرکات پر نازل ہوا اور چونکہ سلسلۂ نبوت ختم ہو چکا تھا اس لیے اس کی ظاہری حفاظت کا وعدہ بھی حق تعالیٰ جل ذکرہٗ نے فرمایا اور اس کے اولین وارث (یعنی حاملین علوم نبوت، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہوئے جو علوم شرعیہ میں کامل اور حق پرستی میں طاق تھے، ان ہی کے ذریعے سے وحی متلو (قرآن مجید) ساری امت کو پہنچا، اور ان ہی سے وحی غیر متلو یعنی احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ ہوئی چنانچہ موجودہ ذخیرہ حدیث ہمیں دس ہزار صحابہ سے پہنچا ہے پھر اس کی صحیح وراثت تابعین، تبع تابعین وغیرہم تک ہوتی ہوئی ہم تک پہنچی اور قیامت تک حسب ارشاد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم **لا تزال طائفة من امتی علی الحق ظاهرين، لا یضر هم من خالفهم حتی یاتی امر الله** (میری امت میں قیامت تک ہمیشہ ایک جماعت حق پر رہے گی جو دوسروں پر غالب رہے گی اور مخالفین کی مخالفت اس کو کچھ ضرر ونقصان نہ پہنچا سکے گی۔)

نیز حسب ارشاد **و لن تجتمع امتی علی الضلالة** (میری امت گمراہی پر ہرگز جمع نہ ہوگی) علوم نبوت کی حفاظت کا وعدہ ہو چکا حق تعالیٰ کے اس عظیم فضل وانعام پر امت محمدیہ جتنا شکر وسپاس بھی بجالائے کم ہے۔

یہ جماعت جس کے ہمیشہ حق پر رہنے کی بشارت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے وہی ہے جس نے وحی الٰہی کو اپنا ہادی و پاسر اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اپنا مقتدا و پیشوا بنایا' یہی جماعت اہل حق و اہل سنت کہلانے کی مستحق اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد **ماانا علیه و اصحابی** (جس طریقہ پر میں ہوں اور میرے صحابہ) کا مصداق ہے۔

اس کے برخلاف جن لوگوں نے بوجہ نقصان فہم یا بوجہ غرض و ہوا یا بسبب کج فطرتی و کٹ حجتی اپنی رائے وتوہمات کو امام بنایا' اپنی ہوا و ہوس کی پیروی کی یا خالص مذہبی و دینی مسائل میں سلف کی آراء کو مہتم کیا' ائمہ دین کو ہدف لعن وطعن کیا' وہ سب طریق حق سے دور ہو گئے اور اختلاف مذموم کے مرتکب ہوئے' جماعت اہل حق کا فرض ہے کہ وہ قرآن وحدیث کے صراط مستقیم اور حضرات صحابہ وتابعین' ائمہ مجتہدین وعلمائے راسخین اور جملہ صلحائے امت وصدیقین کے طریق قویم سے سرمو انحراف کو جائز نہ سمجھے۔ **واللہ الموفق والمیسر لمایحب و یرضی۔**

نوٹ: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم (فداہ ابی وامی) کے ارشاد **ماانا علیه و اصحابی** میں مسلک حق کی جو نشاندہی کی گئی ہے اس کی مکمل علمی وعملی تفسیر سب سے پہلے حضرت امام اعظم اور آپ کے اصحاب شرکاء تدوین فقہ اسلامی نے دنیا کے سامنے پیش کی جس کا اعتراف ابن ندیم نے اس طرح کیا علوم نبوت کا شرق وغرب اور بر و بحر میں پھیلاؤ امام اعظم رحمہ اللہ کی تدوین شریعت کے ذریعہ ہوا۔ اور علامہ محقق شعرانی شافعی میزان میں یوں گلفشاں ہوئے۔

''پہلے گزر چکا کہ جب حق تعالیٰ نے مجھ پر احسان فرما کر شریعت اسلامیہ کے سرچشمہ سے واقف کیا تو میں نے دیکھا کہ تمام مذاہب فقہیہ اس شریعت حقہ سے مرتبط ہیں' پھر یہ بھی دیکھا کہ ائمہ اربعہ کے تمام مذاہب کی نہریں جاری ہیں اور باقی مذاہب جومٹ گئے ہیں۔ وہ پتھریاں بن گئی ہیں اور یہ بھی دیکھا کہ سب سے لمبی نہر امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب کی ہے اس کے بعد امام مالک رحمہ اللہ کی اس کے بعد امام شافعیؒ کی' اس کے بعد امام احمدؒ کی اور ان سب سے چھوٹی امام داؤد کی جو کہ پانچویں قرن میں ختم ہوگئی اس سے میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ نہروں کی بڑائی چھوٹائی سے ان مذاہب کے رواج کی مدت مراد ہے' اور چونکہ امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مذہب سب سے پہلے مدون ہو کر رائج ہوا' تو وہی سب سے آخر میں ختم ہوگا' اور یہی اہل کشف کی بھی رائے ہے۔''

1 - حدثنا الحمیدی[1] قال حدثنا سفیان[2] قال حدثنا یحی بن سعید[3] الانصاری قال اخبرنی محمد[4] بن ابراهیم التیمی انه سمع علقمة بن وقاص اللیثی یقول سمعت عمر بن الخطاب رضی الله عنه علی المنبر یقول سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول انما الاعمال بالنیات وانما لامری ما نوی' فمن کانت هجرته الی دنیا یصیبها او امراة یتزوجها فهجرته الی ما هاجر الیه.

ترجمہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا' آپ فرماتے تھے کہ بلاشبہ تمام اعمال کا تعلق دل کے ارادوں سے ہے اور ہر کسی کو اس کی نیت کے مطابق ہی ثمرہ حاصل ہوتا ہے۔ جس کسی کی ہجرت دنیا حاصل کرنے یا کسی عورت سے نکاح کرنے کی نیت سے ہوگی تو اس کی ہجرت اسی غرض کے لیے شمار ہوگی۔

تشریح: اعمال ظاہری کی اچھائی برائی کا مدار دل کے اچھے برے ارادوں پر ہے' حتیٰ کہ ہجرت جیسے بڑی سعادت وعبادت بھی بری نیت کے سبب اکارت ہو جاتی ہے امام بخاریؒ نے اپنی کتاب کو اس حدیث سے شروع کیا تاکہ یہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے کہ ہر عمل خیر

[1] علامہ محدث حمیدی کا مفصل تذکرہ مقدمہ انوار الباری صفحہ ۲۲۵/۱ میں ہو چکا ہے [2] یہ محدث جلیل سفیان بن عیینہ تلمیذ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ۔ (دیکھو مقدمہ صفحہ ۲۱۷/۱)
[3] بہت بڑے محدث وفقیہ تابعی ہیں' آپ کثیر الحدیث' ثقہ' حجت وثبت تھے امام اعظم ابوحنیفہ' امام مالک' امام اوزاعی وغیرہ کبار محدثین نے آپ سے روایت کی ہے (جامع المسانید وتہذیب) [4] مشہور جلیل القدر تابعی ہیں آپ سے بھی امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے شیوخ نے حدیث کی روایت کی ہے (جامع المسانید صفحہ ۳۵۶/۲)

سے پہلے دل کے ارادے کو صحیح کرنے کا اہتمام کیا جائے' نیت صحیح ہو اور اچھی ہو اور ہر بھلائی و نیکی صرف خدا کی خوشنودی کے لیے ہو اگر ایمان' اسلام' تحصیل علم' تمام اعمال صالحہ' طاعات' عبادات' جہاد' صرف مال' زکوٰۃ وصدقات حج بیت اللہ و ہجرت وغیرہ بھی اخلاص' للّٰہیت اور اچھی نیت سے نہ ہوں بلکہ کسی غرض دنیوی یا ریا و نمود کے لیے ہوں تو ان کی کوئی قدر و قیمت خدا کے یہاں نہیں' اور للّٰہیت و اخلاص کے ساتھ ہر چھوٹی و بڑی نیکی حتیٰ کہ زبان سے کوئی کلمہ خیر کہہ دینا اور راستوں سے کوئی معمولی تکلیف کی چیز ہٹا دینا بھی موجب اجر و ثواب ہے۔

بحث ونظر: امام بخاریؒ نے سب سے پہلی حدیث حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کی' جو احادیث صحاح مجردہ کی جمع و تدوین کا سب سے پہلا اقدام تھا (کیونکہ اس سے پہلے جو ایک سو سے زیادہ احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مجموعے مدون ہوئے تھے۔ ان میں احادیث کے ساتھ آثار صحابہ و فتاویٰ تابعین بھی تھے۔)

اس سے یہ اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جمع و روایت احادیث کے خلاف ہرگز نہ تھے' اپنے دور خلافت میں آپ نے صحابہ سے اس بارے میں مشورہ بھی کیا تھا' جس میں تمام صحابہ کی رائے باقاعدہ کتابت و جمع احادیث کی تھی' مگر اس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس مہم کو صرف اس احتیاط کے پیش نظر ملتوی کر دیا تھا کہ قرآن مجید کے ساتھ احادیث کا اختلاط نہ ہو جائے۔ باقی زبانی روایت احادیث کا سلسلہ دستور آپ کے عہد میں بھی جاری رہا مگر اس میں آپ غایت احتیاط کو پسند کرتے تھے' اسی لیے خود بہت کم روایت کی ہے اور دوسروں پر بھی سختی کرتے تھے' حتیٰ کہ بعض مواقع پر مزید اطمینان کے لیے روایت کرنے والوں سے گواہ بھی طلب کر لیتے تھے۔

سب سے پہلے امام بخاریؒ نے اس حدیث کو اس لیے درج فرمایا کہ ہر عمل خیر کے لیے تصحیح و تحسین نیت کے لیے ترغیب ہو' اسی طرح دوسرے اکابر محدثین و مؤلفین نے بھی اسی حدیث سے ابتداء کرنے کو پسند فرمایا ہے۔ محدث عبدالرحمان[1] بن مہدی نے فرمایا کہ اگر میں کوئی

---

[1] یہ امام مالک' شعبہ' سفیان بن عیینہ' سفیان ثوری وغیرہ کے تلمیذ حدیث اور امام احمد اسحاق و اصحاب صحاح ستہ کے شیوخ میں' ہیں' امام اعظمؒ کے مداحین میں سے ہیں' امام صاحب کو قاضی قضاۃ العلماء کا لقب دیا تھا' بلکہ بعض واسطوں سے ان کے تلامذہ میں بھی داخل ہیں مگر آپ کا میلان بعض مذاہب اہل حدیث اور رائے اہل مدینہ کی طرف تھا' جبکہ آپ کے معاصر محدث کبیر سید الحفاظ رئیس ناقدین رجال یحییٰ بن سعید القطان کا میلان رائے اہل کوفہ کی طرف تھا (ملاحظہ ہو تہذیب صفحہ ۲۷۹)

راقم الحروف کا حاصل مطالعہ یہ ہے کہ امام بخاریؒ نے جو بہت سے مسائل میں فقہ حنفی کی شدت سے مخالفت کی ہے وہ شیخ عبدالرحمٰن ابن مہدی نضر بن شمیل اور اسحٰق بن راہویہ وغیرہ کا اثر ہے' نضر بن شمیل' مسائل فقہ حنفی میں مامون الرشید سے بحث کیا کرتے تھے اور مامون جو خود بڑا محدث و فقیہ تھا ان کو لاجواب کر دیا کرتا تھا نیز وہ اسحٰق بن را: یہ ان چند لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے کتب فقہ حنفی کو دریا میں بہا دیا تھا جس پر خلیفہ مامون نے ان سب کو ملا کر تنبیہ کی تھی (ملاحظہ ہو مقدمہ انوارالباری صفحہ ۹۱) اسی طرح امام بخاریؒ پر جو اثرات امام اعظم رحمہ اللہ کے بارے میں ہیں وہ ان کے شیوخ حمیدی' نعیم خزاعی' اسماعیل بن عرعرہ وغیرہ کے باعث ہیں واللہ اعلم شیخ عبدالرحمٰن بن مہدی اپنے زمانے کے جلیل القدر محدث و فقیہ تھے (۱۹۸ھ میں ان کی وفات ہوئی رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ)

اوپر کے حوالے میں حافظ ابن حجرؒ نے اعتراف کیا کہ امام یحییٰ القطان فقہاء کوفہ کی طرف مائل تھے' امام موصوف کے حالات مقدمہ انوارالباری صفحہ ۲۰۲/۱ میں ذکر ہو چکے ہیں' امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے تلمیذ حدیث و فقہ اور شریک مجلس تدوین فقہ تھے' خلیلی نے آپ کو اپنے زمانے کا امام بلامدافعت کہا اور فرمایا کہ آپ کے ساتھ سارے ائمہ حجت پکڑتے تھے اور مکمل اعتماد کی وجہ سے کہتے تھے کہ جس کو یحییٰ بن القطان نے چھوڑ دیا' ہم بھی اس کو چھوڑ دیں گے۔ ابن حبان کا قول ہے کہ آپ سے امام احمد' یحییٰ بن معین' علی مدینی اور ہمارے تمام ائمہ نے علم حاصل کیا' ابن منجویہ نے آپ کو علم و حفظ وغیرہ کے اعتبار سے سادات اہل زمانہ سے کہا اور یہ کہ آپ ہی نے اہل عراق کے لیے رسم حدیث کے راستے ہموار کئے' ثقات کی تلاش اور ترک ضعفاء کا بڑا اہتمام کیا' عجلی نے ثقہ فی الحدیث' حافظ ابوزرعہ نے ثقات حفاظ میں شمار کیا' حافظ ابوحاتم نے حافظ حجت کہا' امام نسائی نے ثقہ ثبت مرضی کہا' امام یحییٰ بن معین نے آپ کو عبدالرحمٰن بن مہدی سے اوپر کا درجہ دیا' حافظ ابن خزیمہ نے بغداد سے امام اہل زمانہ کا لفظ نقل کیا' صالح بن احمد نے اپنے والد سے نقل کیا کہ یحییٰ القطان' عبدالرحمٰن بن مہدی اور وکیع وغیرہ سب سے زیادہ اثبت ہیں' علی بن المدینی و شیخ امام بخاری کا قول ہے کہ میں نے یحییٰ القطان سے زیادہ اثبت کسی کو نہیں دیکھا (یعنی روایت حدیث میں پوری احتیاط کرنے والا) ابراہیم بن محمد تیمی نے فرمایا کہ یحییٰ القطان سے زیادہ رجال حدیث کا جاننے والا میں نے نہیں دیکھا' عبداللہ احمد کا بیان ہے کہ میں نے اپنے والد امام احمد کو سنا کہ وہ یحییٰ القطان سے احادیث روایت کرتے تھے پھر فرماتے کہ میں نے ان جیسا کوئی بھی نہیں دیکھا میں نے کہا کہ ہشیم بھی نہیں؟ فرمایا کہ ہشیم بس شیخ وقت ہیں' میں نے کہا کہ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کتاب ابواب میں تصنیف کرتا تو اس کے ہر باب کو انما الا عمال بالنیات سے شروع کرتا' اور جو شخص تصنیف کا ارادہ کرے اس کو اسی حدیث سے شروع کرنا چاہیے۔

بعض ائمہ حدیث نے اس حدیث کو اسلام کا ایک تہائی قرار دیا ہے اور بعض نے چوتھائی اور سب نے ہی اس کی عظمت وقدر کا بیان کیا ہے یہ حدیث مسند امام اعظم میں بھی بہ لفظ "الاعمال بالنیات" امام صاحب سے روایت کی گئی ہے اس حدیث کا شان ورود طبرانی میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہ منقول ہے کہ ایک شخص نے ام قیس کو پیغام نکاح بھیجا اس نے انکار کر دیا اور ہجرت کی شرط لگائی تو اس شخص نے ہجرت کی اور نکاح کر لیا اسی لئے ہم نے اس کا نام مہاجر ام قیس رکھ دیا تھا۔

ہمارے شاہ صاحبؒ نے اس موقع پر فرمایا کہ جس طرح آیات قرآنی کے شان نزول بیان کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے' احادیث کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) عبدالرحمٰن بن مہدی؟ فرمایا یحییٰ القطان جیسا کوئی نہیں دیکھا گیا' امام احمد کا قول یہ بھی ہے کہ بصرہ میں یحییٰ القطان پر تثبت کی انتہا تھی' خود عبد الرحمان بن مہدی کا قول ہے کہ یحییٰ القطان سے بہتر حدیث کی طلب وتلاش کرنے والا اور حدیث کو اخذ وضبط کرنے والا میں نے نہیں دیکھا۔

خلیل سے یہاں تک سب اقوال ہم نے تہذیب سے نقل کئے ہیں اور مقصد یہ ہے کہ اتنا بڑا شخص جو جامع کمالات اور امام فن حدیث ورجال تھا اور جو امام احمد' علی بن المدینی' اسحٰق بن راہویہ' ابوبکر بن ابی شیبہ (صاحب مصنف مشہور) اور امام فن رجال یحییٰ بن معین وغیرہ کبار ائمہ ومحدثین کا قابل صد فخر استاذ تھا' وہ امام اعظم کے تلمذ حدیث وفقہ پر نازاں اور فقہ حنفی کا متبع تھا اسی طرح امام یحییٰ بن زکریا بن ابی زائدہ کوفی جن کے حالات مقدمہ انوار الباری صفحہ ۱۸۶/۱ میں درج ہوئے اور خود امام بخاریؒ نے تاریخ کبیر صفحہ ۲/۴/۲۷۳ میں ابوخالد الاحمر کا قول ان کے بارے میں نقل کیا کہ آپ حدیث کے اخذ وضبط میں کامل مہارت رکھتے تھے اور حضرت حسنؒ' قول نقل کیا کہ آپ اہل کوفہ میں سب سے بڑے فقیہ تھے' یہ اور اس زمانے کے سینکڑوں ہزاروں کبار محدثین نے فقہ حنفی پر اعتماد کیا اور سینکڑوں محدثین نے امام صاحب سے احادیث کی روایت بھی کی۔ جس کا بڑا ثبوت جامع المسانید وغیرہ موجود ہیں اس کے باوجود کچھ لوگوں کا یہ کہنا کہ فقہ حنفی احادیث کے خلاف ہے یا امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے پاس احادیث کا ذخیرہ نہیں تھا دروغ بے فروغ نہیں تو اور کیا ہے؟ ایک محترم بزرگ عالم نے ہمیں لکھا کہ غیر مقلدوں کا ایک شر ذمہ قلیلہ ہے اس کو زیادہ اہمیت نہ دی جائے لیکن ہمارے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں' تہذیب التہذیب کے مندرجہ بالا حوالے کو پھر سے بغور پڑھئے تو معلوم ہوگا کہ فقہ حنفی کے مقابلہ میں شروع سے ہی' اور بعد کو دوسرے ائمہ مجتہدین کو فقہوں کے مقابلہ میں بھی اہل حدیث کے مذاہب رائج ہو گئے تھے' جن پر حافظ نے تعریض کی ہے' کیونکہ حافظ ابن حجر خود بھی شافعی ہیں۔ پھر درمیانی تاریخ سے گذر کر قریبی دور کے مصری حجازی نجدی وہندی علماء کے رجحانات وحدیثی تالیفات کو بھی سامنے رکھئے اور اس وقت مدینہ طیبہ (زادہا اللہ شرفا) جو سعودی عرب کی سرپرستی میں لکھوکھا روپوں کے سرمایہ سے یونیورسٹی قائم ہوئی ہے اور تمام دنیائے اسلام کے طلباء کو گراں قدر وظائف ماہوار دے کر تعلیم علوم اسلامیہ کے لیے جمع کیا جا رہا ہے اس کے نصاب تعلیم کو دیکھئے' اس کے نتائج پر بھی نظر رکھئے اور وہاں کے اساتذہ کے متعلق بھی معلومات فراہم کیجئے! معلوم ہوا کہ وہاں کے اساتذہ حنفی مذہب کے طلبہ کو حنفیت کا طعنہ دیتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ کو صرف تیرہ یا سترہ حدیثیں یاد تھیں۔ قیاس کن زگلستان من بہار مرا اتنی بڑی عالمی یونیورسٹی کے اساتذہ کو تمام تعصبات سے بالاتر ہونا چاہیے۔ اور اگر وہاں کے اساتذہ کی کڑی نگرانی نہ کی گئی تو اس کے نقصانات بہت زیادہ ہوں گے۔

ضرورت ہے کہ حضرت مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی شیخ الحدیث دارالعلوم ٹنڈو آلہ یار' [illegible]رت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور' حضرت مولانا سید فخر الدین صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند' حضرت مولانا محمد شفیع [illegible]حب شیخ الحدیث دارالعلوم کراچی' اور حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری شیخ الحدیث دارالعلوم جامع مسجد نیو ٹاؤن کراچی ایسے حضرات کو بھی مدینہ یونیورسٹی کے مشیران میں شامل کیا جائے۔ تاکہ وہاں کی علمی مرکزیت کے شایان شان علوم نبوت کے صحیح خدمت ہو سکے۔

ہمارے علم میں نجد وحجاز کے بھی چند ایسے علماء محققین حنبلی وغیر حنبلی ہیں جن کو یونیورسٹی کی انتظامیہ میں رکھنے سے اس کا صحیح علمی وقار واعتماد قائم ہو سکتا ہے' یہ سطور لکھی جا چکی تھیں کہ ایک مشہور علمی ادارے کے مدیر محترم کا خط ڈاک سے ملا جو اسی سال حج وزیارت حرمین سے مشرف ہو کر آئے ہیں انہوں نے مدینہ یونیورسٹی کے متعلق لکھا کہ اس سے ہم لوگوں کو بہتر توقعات قائم نہیں کرنی چاہئیں' نجدیوں کا بڑا مقصد اس کی تاسیس سے نجدیت کو پھیلانا اور دوسری سیاسی مصالح کا حصول معلوم ہوتا ہے ہمارا اندازہ یہی ہے۔ والعلم عند اللہ

کچھ اس قسم کے تاثرات دوسرے لوگوں کے بھی ہیں' خدا کرے اپنے اس عظیم تر روحانی ودینی مرکز کے بارے میں اس قسم کے تاثرات بہتر توقعات وخوشتر نتائج سے بدل جائیں اور وہاں کے ارباب حل وعقد اس عالمی اسلامی ادارے کو تمام سیاسی مصالح اور ہر قسم کے تعصبات سے بلند تر رکھنے کا تہیہ کر لیں۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز۔

شان ورود کا بھی اگر اہتمام ہوتا تو نہایت مفید ہوتا اور کوئی مستقل کتاب اس موضوع پر لکھدی جائے تو بڑا نفع ہو علامہ ابن دقیق العید کا قول ہے کہ سواء ابوحفص عکبری کے کسی نے اس طرف توجہ نہیں کی۔

امام بخاریؒ حدیث مذکور "الاعمال بالنیات" کو اپنی صحیح میں سات جگہ لائے ہیں، پہلی تو یہی ہے دوسری صفحہ ۱۳ میں "باب ماجاء ان الاعمال بالنية والحسبة ولكل امرى مانوى" کے الفاظ سے لائے ہیں، پھر فرمایا کہ اس میں ایمان، وضو نماز زکوۃ حج روزہ وغیرہ سب داخل ہوگئے، مطلب یہ کہ اعمال خیر کا اجر وثواب جب ہی حاصل ہوگا کہ ارادہ طلب ثواب کا ہو اگر نیت فاسد ہے یا طلب ثواب کا ارادہ نہیں تو وہ عمل ثواب سے خالی ہوگا۔

تیسری کتاب العتق میں لائے چوتھی باب الہجر میں پانچویں نکاح میں، چھٹی تذور کے بیان میں، ساتویں کتاب الحیل میں، کسی جگہ ان کا مقصد صحت اعمال کا مدار نیت پر بتلاتا ہے اور کہیں ثواب اعمال کو نیت پر موقوف بتلاتا ہے جس سے معلوم ہوا کہ امام بخاریؒ کے نزدیک حدیث کا مفہوم عام ہے جو دونوں صورتوں کو شامل ہے۔

ہمارے حضرت شاہ صاحب کی بھی یہی رائے ہے کہ حدیث مذکور سے صرف صحت اعمال کی تخصیص جیسا کہ شوافع کرتے ہیں درست نہیں جس طرح ثواب اعمال کی تخصیص مناسب نہیں جو بعض فقہا احناف نے کی ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے ان ہر دو تخصیصات سے پیدا ہونے والی خرابیوں کا مفصل تذکرہ فرما کر بتلایا کہ فقہا حنفیہ کو سب سے زیادہ وضو کے بارے میں مطعون کیا گیا ہے حالانکہ ان کی فقہی پوزیشن اس مسئلہ میں بھی بہت قوی ہے جس کے وجوہ حسب ذیل ہیں۔

۱- حدیث مذکور عبادات میں وارد ہوئی ہے نہ کہ قربات وطاعات میں اور اس امر کو حنفیہ نے بھی تسلیم کیا ہے کہ وضو بغیر نیت کے عبادات کے درجہ میں نہیں آئے گی نہ اس پر ثواب عبادت کا ملے گا لیکن یہ کہ وہ مفتاح صلوٰۃ بھی نہ بن سکے گی اس سے حدیث مذکور بالکل ساکت ہے (چنانچہ امام بخاریؒ نے بھی جہاں مفصل احکام وضو نماز وغیرہ کا ذکر کیا ہے وہاں حدیث سے مراد ثواب اعمال ہی لیا ہے صحت اعمال نہیں۔

شیخ زکریا انصاریؒ نے تفصیل سے بتلایا ہے کہ عبادت میں نیت کے ساتھ اس ذات کی معرفت حاصل ہونا بھی ضروری ہے جس کا تقرب اس عبادت سے مقصود ہے قربت میں نیت ضروری نہیں صرف معرفت مذکور ضروری ہے جیسے تلاوت قرآن مجید اطاعت میں کوئی شرط نہیں (صرف اس کا عمل خیر ہونا کافی ہے) جیسے ان امور کا غور وفکر اور مطالعہ جن سے اسلام قبول کرنے کی رہنمائی حاصل ہو۔

۲- تمام مسائل دین پر ایک اجمالی نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دین اسلام کی ترکیب پانچ چیزوں سے ہے عبادات، عقوبات، معاملات، اعتقادات، اخلاق، فقہی کتابوں میں صرف پہلی تین چیزوں کا ذکر ہوا ہے، عبادات مقصودہ میں بالاتفاق سب کے نزدیک نیت شرط صحت ہے، معاملات کا اطلاق پانچ چیزوں پر ہوتا ہے، مناکحات، معاوضات مالیہ، خصومات ترکات، امانات، ان سب میں کسی کی یہاں بھی نیت شرط نہیں ہے، عقوبات کی بھی پانچ اقسام ہیں، حدودۃ، حد قذف، حد زنا، حد سرقہ اور قصاص ان میں بھی کسی نے نیت کو شرط قرار نہیں دیا۔ (حد شرب خمر کا ذکر اس لئے نہیں کیا جاتا کہ اس کا اجرا ذمیوں پر نہیں ہوتا)۔

پس اگر وسائل کے بارے میں حنفیہ پر طعن کیا جاتا ہے کہ حدیث مذکور کے خلاف کرتے ہیں تو معاملات وعقوبات میں تو دوسرے بھی مخالفت حدیث کے مرتکب ٹھہریں گے، اس کا ان کے پاس کیا جواب ہے؟

۳- بہت سے وسائل میں حنفیہ کے یہاں بھی نیت شرط صحت ہے، جیسے تیمم، نبیذ سے وضو وغیرہ حالانکہ مشہور ومعروف محدث فقیہ شام حضرت امام اوزاعیؒ (امام اوزاعی کا تذکرہ مقدمہ انوار الباری حصہ اول کے صفحہ پر ہو چکا ہے)

اور حافظ حدیث حسن بن صالح بن حیؒ تیمم میں بھی نیت کو شرط صحت نہیں مانتے تھے (عینی) اس طرح پر دونوں ائمہ حدیث ہمارے امام اعظمؒ سے بھی نیت کو شرط صحت نہ ماننے میں آگے بڑھے ہوئے ہیں پھر صرف فقہاء احناف کو مطعون کرنا کیا انصاف ہے؟

وضو اور تیمم میں وجہ فرق ہمارے یہاں یہ ہے کہ پانی میں بالطبع و بالذات پاک کرنے کا وصف موجود ہے کیونکہ قرآن مجید میں تصریح ہے وانزلنا من السماء ماء طهورا ہم نے پانی کو پاک کرنے والا اتارا ہے لہٰذا نیت کی ضرورت نہیں لیکن مٹی اور زمین میں یہ وصف ذاتی نہیں ہے حق تعالیٰ نے امت محمدیہ کے خصوصی اکرام اور دفع حرج کے لئے پانی نہ ملنے کے وقت اس کو پاک کرنے کا وصف عطا فرما دیا ہے اس لئے اس میں نیت کی ضرورت ہوگی اور یہ ایسا ہی ہے جیسے شوافع نے جمع بین الصلوتین میں جمع تقدیم اور جمع تاخیر کی نیت کو ضروری قرار دیا ہے۔

وضو بالنبیذ میں نیت حنفیہ کے نزدیک اس لئے ضروری ہے کہ وہ ماء مطلق و مقید کے بین بین ایک صورت ہے اگرچہ طاہر و طہور ہے جس طرح حقیقت قاصرہ کو حقیقت مطلقہ و مجاز کے درمیان ایک درجہ دیا گیا ہے اور اس کو مجاز سے اوپر اور حقیقت مطلقہ سے نیچے مانا گیا ہے حاصل یہ کہ ہمارے یہاں وسائل میں بھی فی الجملہ نیت کی شرط موجود ہے لہٰذا جن لوگوں نے مبنی اختلاف وسائل و مقاصد کو سمجھا ہے انہوں نے نقل مذاہب میں غلطی کی ہے۔

۴-اگر زیادہ دقت نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ماء مطلق سے وضو میں بھی حنفیہ کے یہاں نیت کا لحاظ موجود ہے کیونکہ نیت سے مراد اگر زبان سے نیت کرنا ہے تو وہ کسی کے یہاں بھی لازمی و ضروری نہیں ہے چنانچہ علامہ ابن تیمیہؒ اور بہت سے علماء نے تصریح کی ہے کہ زبان سے نیت کے الفاظ ادا کرنے کا ثبوت نہ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے نہ صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم اور نہ ائمہ اربعہ رحمہم اللہ تعالیٰ سے اور اگر اس سے مراد وہ دل کا ارادہ ہے جو ہر فعل اختیاری سے پہلے ہوا ہی کرتا ہے تو اس میں ہم اور دوسرے مخالفت کرنے والے برابر ہیں یعنی ہم بھی اس سے منکر نہیں ہیں ظاہر ہے کہ نماز سے پہلے نیت کرنے کا مطلب یہی ہے کہ نماز پڑھنے والے کے دل میں اس امر کا شعور ہو کہ میں کون سی نماز پڑھ رہا ہوں تو کیا کوئی حنفی المسلک ایسا ہوگا جس کو وضو کرتے وقت اس امر کا شعور نہ ہو کہ میں نماز کے لئے فرض طہارت ادا کر رہا ہوں غرض نیت صرف ایک امر قلبی ہے جو تمام اختیاری افعال میں ہوا کرتی ہے۔

لہ مشہور حافظ حدیث فقیہ عابد زاہد تھے۔ حافظ ابوزرعہ حافظ ابوحاتم امام نسائی وغیرہ نے ثقہ کہا سید الحفاظ امام یحییٰ القطان نے فرمایا کہ سفیان ثوری ان کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے تھے اسی طرح دوسرے کچھ حضرات نے بھی ان پر نقد کیا ہے مثلاً کہا کہ وہ امت میں تلوار چلانے کو پسند کرتے تھے۔ (یہ بعینہ وہی اعتراض ہے جو امام بخاریؒ نے اپنے رسالہ قرأۃ خلف الامام میں امام اعظمؒ پر کیا ہے۔ (دیکھو صفحہ ۱۹) حافظ ابن حجرؒ نے یہاں اس اعتراض کو دفع کیا اور کہا کہ بیشک حافظ حسن بن حی ائمہ جور کے خلاف خروج بالسیف کو جائز سمجھتے تھے اور یہی سلف کا قدیم مسلک بھی تھا۔ لیکن جب سیاسی حالات کی نزاکت حد سے بڑھ گئی تو اس رائے کو ترک کرنا پڑا لہٰذا اس جیسی رائے کی وجہ سے کسی ایسے شخص پر جرح کرنا صحیح نہیں جس کی عدالت ثابت ہو چکی ہو اور وہ حفظ اتقان اور ورع تام میں مشہور ہو چکا ہو پھر یہ بھی ہے کہ باوجود اپنی اس رائے کے بھی حسن بن حی نے کسی حکومت کے خلاف خروج کا عملی مظاہرہ نہیں کیا باقی یہ اعتراض کہ وہ جمعہ کی نماز نہیں پڑھتے تھے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی رائے میں فاسق کے پیچھے نماز درست نہیں تھی اس کے بعد حافظ نے کہا کہ حسن بن حی کی طرف سے یہ عذر پیش ہو سکتا ہے اور اگر صواب اس کے خلاف بھی ہو تو بہر حال وہ امام مجتہد تھے۔" (تہذیب صفحہ ۲/۲۸۸)

آپ نے دیکھا کہ حافظ نے حسن بن حی کی طرف سے خروج بالسیف اور ترک نماز جمعہ کے اعتراض کو کس خوبی سے دفع کیا۔ مگر یہی اعتراض ری السیف علی الامۃ کا امام بخاریؒ نے امام اعظم پر کیا تو حافظ نے ان کی طرف سے اس کا دفاع نہیں کیا حالانکہ امام صاحب کی پوزیشن حسن بن حی سے زیادہ صاف تھی لیکن حسن موصوف امام صاحب کے مخالفوں میں تھے ان کی ہر طرح نصرت و حمایت اور توثیق و تقویت ضروری سمجھی گئی امام صاحب اور ائمہ احناف کی طرف سے دل صاف نہیں تھا اس لئے وہاں زبان و قلم میں بھی رکاوٹ ہو جاتی ہے۔ واللہ المستعان۔

حافظ کی مذکورہ بالا عبارت میں کئی باتیں بڑے کام کی ہیں امید ہے کہ ناظرین ان کو یاد رکھیں گے ایک ضروری امر یہ بھی قابل ذکر ہے کہ حسن بن حی موصوف کو اکابر محدثین نے متشیع بھی کہا ہے جس کی کوئی مدافعت حافظ نے نہیں کی اور آخر میں حافظ نے زکریا بن یحییٰ الساجی کے حوالے سے محدث کبیر شیخ عبداللہ بن داود الخریبی (حنفی) کے بارے میں بھی خلاف شان بات نقل کر دی حالانکہ ساجی روایت میں غیر معتمد اور شیخ المتعصبین تھے۔ (ملاحظہ ہو تانیب الخطیب صفحہ ۱۸)

حسن بن حی کی ولادت ۱۰۰ھ میں اور وفات ۱۶۹ھ میں ہوئی (رحمۃ اللہ رحمۃ واسعۃ)

اگر نیت میں اس سے زیادہ کسی چیز کو مانا جائے تو اس کا حدیث میں کوئی ثبوت نہیں ہے اس کے بعد اختلافی صورت صرف ایک فرضی شکل بطور فرض منطقیین رہ جاتی ہے کہ ایک شخص اتفاقی طور پر بارش میں بھیگ جائے' جس سے اعضاء وضو بھی دھل جائیں اس صورت میں بظاہر اس کے دل کا ارادہ بھی وضو کا نہیں ہے آیا ایسی صورت میں وہ نماز پڑھ سکتا ہے یا نہیں' تو بہتر یہ ہے کہ ایسی اتفاقی نادر صورت کو حدیث کے عام و وسیع اور واضح و بدیہی مطلب کے تحت داخل نہ کیا جائے بلکہ ایک نظری و اجتہادی مسئلہ سمجھا جائے اور اس کے بارے میں ائمہ مجتہدین کے فیصلے کو "مخالفت حدیث"[1] سے مطعون نہ کیا جائے۔

---

[1] یہاں ہمارے حضرت شاہ صاحب قدس سرہ نے ایک نہایت اہم نکتہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے یہ سب کو تسلیم ہے کہ قرآن و حدیث کی مراد سمجھنے کے لئے اعلیٰ درجہ کی فقہی و اجتہادی صلاحیت کی ضرورت تھی جو خدا کے فضل و کرم سے ہمارے امام اعظمؒ اور دوسرے آپ کے تلامذہ و مستفیدین میں بدرجہ اتم موجود تھی' ان کا زمانہ بھی خیر القرون کا تھا ان کے زمانے میں اکثر احادیث ثنائیات تھیں کہ صرف ایک صحابی اور ایک تابعی کے واسطے سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی تھیں اس لئے جھوٹ وغیرہ کا امکان تقریباً ندارد تھا اس مبارک دور میں امام الائمہ امام اعظم رحمتہ اللہ تعالیٰ کی سرپرستی میں سینکڑوں کبار محدثین و فقہا کی موجودگی اور چالیس جلیل القدر ائمہ محدثین و فقہا کی تقریباً تیس سال کی شبانہ روز بحث و تمحیص کے بعد ساڑھے بارہ لاکھ فقہی مسائل کی تدوین عمل میں آئی' جو عملی طور سے بھی تمام اسلامی ممالک میں رائج ہوئے اور سلطنت عباسیہ کے طول و عرض میں حکومتی سطح پر بھی نافذ کئے گئے' خلیفہ مامون نے جو اس دور کے بلند پایہ محدثین امام مالک وغیرہ کا شاگرد تھا) ایک موقع پر جب اس کے سامنے اسحاق بن راہویہ' احمد بن زہیر' نضر بن شمیل وغیرہ نے فقہ حنفی کو احادیث کے خلاف بتلایا تھا تو اس نے خود فقہ حنفی کی طرف سے پوری مدافعت کی اور احادیث روایت کر کے ان لوگوں کو لاجواب کر دیا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ اگر ہم دیکھتے فقہ حنفی احادیث کے خلاف ہے تو ہم خود ہی اس کو اپنے قلمرو میں نافذ نہ کرتے۔

کہنا یہ ہے کہ قرآن و حدیث سے جو اصول کلیہ مستنبط ہوتے ہیں ان ہی کی روشنی میں فقہ مرتب ہوئی ہے اور جیسا کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے ارشاد فرمایا ہے کہ کچھ احکام تو ایسے ہوتے ہیں جو قرآن و حدیث کی عبارت' دلالت' اشارت و اقتضاء سے بدیہی طور پر نکل آتے ہیں' ان کا تعلق براہ راست علوم نبوت سے ہے دوسرے درجہ پر وہ احکام ہیں جن کا تعلق ائمہ مجتہدین کے وظیفہ اجتہاد سے ہے' چنانچہ اعمال کی صحت و بطلان' جواز و کراہت کا فیصلہ اجتہاد سے وابستہ ہے اور جہاں تک نبوت و رسالت کے فیصلوں کی حدود وسیع ہیں وہاں تک مجتہدین کو اپنی رائے و اجتہاد کو دخل دینے کا اصلاً کوئی حق نہیں اور نہ ان حضرات نے ایسی غلطی کا ارتکاب کیا' البتہ مدارک اجتہاد مجتہدین کو پوری طرح نہ سمجھنے کی وجہ سے ان کے خلاف اس قسم کے مغالطے اسحٰق بن راہویہ وغیرہ کی طرح بعد کے محدثین و فقہا کو بھی پیش آئے اور آج تک بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔

محدث شہیر ابوبکر بن ابی شیبہ نے بھی اسی قسم کا اعتراض کیا تھا' پھر امام بخاریؒ نے بھی صحیح بخاری اور دوسری تالیفات میں اسی غلط فہمی کے باعث تیز کلامی کی پھر ابن حزم آئے' وہ تو اور بھی زیادہ حد سے بڑھ گئے پھر طبقہ اہل حدیث و غیر مقلدین نے تو کوئی کسر ہی اٹھا کر نہ رکھی۔ ہمارے زمانہ میں ایک عالم حدیث مرعاۃ شرح مشکوٰۃ شریف لکھ رہے ہیں جس کی دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں ان کا طریقہ نقد ملاحظہ ہو۔ صفحہ ۲/۲۰۲ میں باب الوتر کی ایک حدیث پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ حدیث حنفیہ کے لئے بہت مشکل ہے کیونکہ وہ فرض و نفل کی ہر دو رکعت پر بیٹھنا اور تشہد پڑھنا واجب کہتے ہیں اور انہوں نے اس کے جوابات جن وجوہ سے دیئے ہیں وہ مردود و باطل ہیں' پھر پانچ وجوہ لکھ کر سب کو بزعم خود باطل و مردود قرار دیا پھر لکھا کہ سب وجوہ "حدیث صحیح" کی تحریف' اس کے مقصد کو باطل ٹھہرانے والی' سنت ثابتہ ظاہرہ کا استہزاء اور اس کو ترک کرنے کے حیلے حوالے ہیں اس سے ان لوگوں کا شدت تعصب اور تقلید غیر معصوم میں غلو ظاہر ہے بلکہ ان کو سنت سے بغض و عناد معلوم ہوتا ہے ہم نے ان مضحکہ خیز توجیہات کو صرف اس لئے عرض کر دیا ہے تاکہ عقل و بصیرت والے عبرت حاصل کریں"۔

یہ تمام تبرا اور خصوصیت سے محدثین و فقہا احناف پر سنت سے بغض رکھنے کا گراں ترین الزام و افتراء آپ نے ایک ایسے عالم محقق کی زبان قلم سے سنا جن کے علم و فضل' متانت و سنجیدگی سے راقم الحروف کو بڑی اچھی توقعات تھیں اسی لئے مقدمہ حصہ دوم کے آخر میں ان کا تعاون بھی اچھے ہی الفاظ سے کرایا تھا جس پر بعض اہل علم نے جو ان سے زیادہ قریب ہیں۔ مجھے اس مدح سرائی پر شکوہ بھی لکھا تھا۔" لو استقبلت من امری ما استدبرت"

لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مؤلف موصوف نے شرح مذکور بڑی محنت سے ترتیب دی ہے جو ہر طرح قابل قدر ہے اور بیشتر جگہ احناف کا تذکرہ بھی وقیع الفاظ میں کیا ہے' جس کے ہم شکرگزار ہیں' جس طرح ان کی بے جا عصبیت و تیز لسانی کا شکوہ بھی ضرور ہے۔

محترم مؤلف کے تبرا مذکور پر تفصیلی بحث تو ہم اپنے موقع پر کریں گے' یہاں مختصر طور پر اتنی گزارش ہے کہ نماز کی ہر دو رکعت پر بیٹھنا اور التحیات پڑھنا اول تو یہ صرف حنفیہ کا مسلک نہیں ہے بلکہ حنابلہ' بھی ان دونوں کو واجب کہتے ہیں' ملاحظہ ہو (کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ طبع مصر! صفحہ ۱۶۹) بلکہ تشہد اول حنفیہ کے یہاں ایک روایت میں سنت بھی نقل ہوا ہے (فتح الملہم صفحہ ۱۰۰) شوافع قعدۂ اولیٰ و تشہد اول کو سنت اور اخیرین کو فرض کہتے ہیں۔

غرض اول تو جو کچھ تبرا مؤلف نے حنفیہ پر کیا ہے' وہ حنابلہ پر بھی عائد ہو جاتا ہے' دوسرے یہ کہ حنفیہ قعدۂ اولیٰ و تشہد اول کو اس لیے واجب کا (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

۵۔ اگر حدیث کو صرف عبادات کے ساتھ خاص سمجھا جائے' جیسا کہ طرفین کے کلام ونزاع سے معلوم ہوتا ہے اور اس کو صرف ثواب سے متعلق کریں' جیسا کہ ہمارے فقہاء حنفیہ نے کہا تو اس کو ہم مانتے ہیں کہ وضوء بغیر نیت کے عبادت کے درجہ میں نہ آئے گا مگر اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ ایسا وضو بھی صحت نماز کے لیے کافی ہے کیونکہ اس کا پاک کرنے کا وصف ظاہری وحسی طور سے موجود و ناقابل انکار ہے اور ایسے

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) وجہ دیتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ جب تم ہر دو رکعت پر بیٹھو تو التحیات پڑھو (یہ روایت نسائی میں اور مسند احمد میں بھی ہے' جس کے تمام رجال سند ثقہ ہیں (دیکھو نیل الاوطار شوکانی صفحہ ۲/۱۶۵ اعلاء السنن صفحہ ۱۲۸) نیز صحیح مسلم باب صفۃ الصلوٰۃ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مفصل حدیث مروی ہے' جس میں انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز مبارک کی پوری تفصیل بیان کی ہے' اس میں یہ بتلایا ہے کہ حضور فرمایا کرتے تھے کہ ہر دو رکعت پر تحیہ ہے (یعنی تشہد) ایک حدیث حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مسند احمد میں اس طرح ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے تشہد سکھلایا درمیان نماز کے بھی اور آخر میں بھی (مجمع الزوائد ہیثمی صفحہ ۲/۱۴۲ ہیثمی نے وہاں یہ بھی کہا ہے کہ اس حدیث کے تمام رجال ثقہ ہیں' بخاری ومسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ جب تم میں سے کوئی تشہد اخیر سے فارغ ہو تو عذاب جہنم سے پناہ مانگے الخ (نصب الرایہ صفحہ ۱/۴۲۲) صحیح بخاری باب سنۃ صفحہ ۱۱۴ میں ابی حمید ساعدی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت صلوٰۃ کا پورا ذکر ہوا ہے' جس میں دو رکعت کا بیٹھنے کا ذکر موجود ہے کہ اس حدیث کو سوائے مسلم کے اور بھی صحاح والوں نے روایت کیا ہے۔

غرض حنفیہ کے سامنے بیسیوں احادیث حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت صلوٰۃ کی موجود تھیں جن کی وجہ سے انہوں نے اور حنابلہ نے بھی فیصلہ کیا کہ ہر رکعت پر جلوس وتشہد ہونا چاہیے' وہی حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جو مسلم میں مروی ہے اور غلطی سے حافظ ابن حجرؒ وصاحب مشکوٰۃ نے اس کو بخاری کی طرف بھی منسوب کردیا ہے حالانکہ انہوں نے اس حدیث کو روایت نہیں کیا بلکہ علماء نے یہاں تک کہا ہے کہ امام بخاری چونکہ فصل کے قائل ہیں۔ اس لیے اس کو روایت نہیں کیا۔ کیونکہ ان کی عادت ہے جس جانب کو اختیار کرتے ہیں صرف اسی کے موافق احادیث کی روایت کرتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ اس حدیث مسلم کو علامہ ابن عبدالبر نے معلول قرار دیا ہے' جس کی تفصیل زرقانی نے شرح المواہب میں ذکر کی ہے' اس میں یہ بھی ہے کہ احادیث فصل اثبت اور اکثر طرق سے مروی ہیں (فتح الملہم صفحہ ۲/۲۹۰) نیز حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے رات کی نماز کے بارے میں یہ بھی مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم چھ رکعت پڑھتے تھے اور ہر دو رکعت پر سلام پھیرتے تھے پھر بیٹھ کر تسبیح وذکر کرتے تھے اس کے بعد پھر دو رکعت پڑھتے تھے (کنز العمال صفحہ ۳/۱۰۸) اس لیے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے جو آخر کی پانچ رکعات کا ایتار کا ذکر کیا ہے اور فرمایا ہے کہ ان میں صرف آخر میں بیٹھتے تھے وہاں یہی مراد ہوگا کہ تہجد کے نوافل دو دو کرکے درمیان میں جس طرح بیٹھ کر تسبیح کرتے تھے' وہ صورت وتروں کی نماز میں نہ ہوتی تھی (فتح الملہم صفحہ ۲/۲۹۱)

آپ نے دیکھا کہ حنفیہ کے جس مسلک پر مؤلف مرعاۃ اتنے بگڑے وہ پوری طرح احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مؤید ہے اور انہوں نے خلاف سنت کوئی دوسرا طریقہ ہرگز اختیار نہیں کیا ہے ہر دو رکعت پر بیٹھنا اور تشہد پڑھنا بہت سی احادیث قطعیہ سے ثابت اور ائمہ اربعہ کے یہاں معمول بہا ہے' شافعیہ کے یہاں چونکہ وجوب کا درجہ نہیں ہے اور صرف فرض وسنت دو ہی درجات ہیں اس لیے انہوں نے ان دونوں کو درجہ سنت دیا مالکیہ کے یہاں بھی تقریباً یہی صورت ہے' حنابلہ کا مذہب حنفیہ کے مطابق ہے اور حنابلہ کا عمل بالحدیث غیر مقلدین کے یہاں بھی مسلم ہے'

الفتح الربانی فی ترتیب مسند الامام احمدؒ کے محشی نے صفحہ ۴/۱۰ پر لکھا کہ جمہور محدثین کے نزدیک ہر دو تشہد واجب ہیں اور امام احمدؒ اول کو واجب اور دوسرے کو فرض کہتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ ومالک رحمہا اللہ تعالیٰ اور جمہور فقہاء دونوں کو سنت کہتے ہیں' اب جمہور محدثین کے بارے میں مؤلف مرعاۃ کیا فرمائیں گے؟ تشہد اول اور قعود اول کو واجب کہنے والے تو تارکین سنت بلکہ مبغضین سنت تھے' شیخ احمد عبدالرحمان البنا کی تحقیق نے تو سارا الزام حنفیہ سے اٹھا کر جمہور محدثین پر رکھ دیا۔

غالباً محدث مبارکپوری کے مطالعہ میں امام احمد یا حنابلہ وجمہور محدثین کا مسلک پوری طرح نہیں آیا اور صرف حنفیہ سامنے آگئے جن پر تبرا کا ثواب حاصل کرنے میں عجلت سے کام لینا پڑا ورنہ جمہور محدثین یا حنابلہ سے صرف نظر کی جرأت وہ بھی نہ کرسکتے تھے' غرض ایسے مسئلہ میں حنفیہ پر نہ صرف اعتراض کرنا بلکہ ایک عالم کی شان سے اتر کر سخت ترین الفاظ استعمال کرنا' پھر جس حدیث مسلم کی توجیہات پر انہوں نے حنفیہ کو تارکین سنت اور سنت رسول سے بغض رکھنے والے بھی کہہ دیا' اس کو امام بخاریؒ نے معلول سمجھ کر یا اور کسی وجہ سے روایت نہ کیا' علامہ ابن عبدالبر نے اس کو معلول قرار دیا' دوسری بہت سی احادیث صحیحہ قویہ کی وجہ سے اس کی توجیہ ضروری ٹھیری' پھر آثار صحابہ وتابعین رضی اللہ عنہم کی روشنی میں بھی اس پر عمل دشوار' کیونکہ حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو رات کے وقت دفن کیا' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے ابھی تک وتر نہیں پڑھے وہ وتر پڑھنے کے لیے کھڑے ہوئے ہم نے ان کے پیچھے صف باندھ لی' انہوں نے وتر کی تین رکعات پڑھائیں اور صرف آخری رکعت پر سلام پھیرا اس کی سند صحیح ہے (معانی الآثار صفحہ ۱۷۴)

حضرت ابوالزناد سے نقل ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے فقہاء کے فیصلہ سے مدینہ طیبہ میں نماز وتر کی تین رکعات مقرر کردی تھیں جن کے صرف آخر میں سلام پھیرا جاتا تھا۔ (معانی الآثار صفحہ ۱۷۵) (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

وضوء پر اجر وثواب بھی ملے گا جیسا کہ پہلے شیخ الاسلام زکریا انصاری کی تحقیق گذر چکی کہ طاعات وقربات میں نیت ضروری نہیں حالانکہ اجر و ثواب ان پر بھی حاصل ہوتا ہے بلکہ ثواب کے اعتبار سے وہ بھی عبادات کہلانے کی مستحق ہیں اس کے بعد اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ صحت نماز کے لیے وضو کا بدرجۂ عبادت ہونا ضروری ہے تو اس کا ثبوت نہیں ہوسکتا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) مستدرک میں یہ بھی ہے کہ یہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا وتر ہے' جس کو اہل مدینہ نے معمول بنایا' جیسا کہ مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے وتر کی تین رکعات دو سلام سے مروی ہیں اس پر حضرت حسن بصری نے فرمایا کہ ان کے باپ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان سے زیادہ اعلم تھے (اس سے زیادہ تحقیق العرف الشذی صفحہ ۲۱۴ میں ہے)

آپ نے دیکھا کہ وتر تین رکعات ایک سلام سے جو حنفیہ کا مسلک و معمول ہے وہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا معمول تھا' اسی کو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے مدینہ طیبہ میں رائج کیا' اور وہی حضرت ابن مسعودؓ ابی بن کعب' ابن عباس' انس' ابوامامہ اور فقہاء سبعہ' نیز حضرت سفیان ثوری اور دوسرے اہل کوفہ کا بھی مذہب ہے محدث جلیل ابن ابی شیبہ نے تو حضرت حسنؒ سے یہ بھی نقل کیا کہ تمام مسلمانوں نے اس پر اجماع کیا ہے کہ وتر تین رکعات ایک سلام سے ہیں (اوجز المسالک صفحہ ۱/۳۳۴) پھر پانچ رکعت والی حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ترک یا سنت سے بغض رکھنے کا الزام کس کس کو دیا جائے گا؟ اور ان سب اکابر امت نے کس غیر معصوم کی تقلید میں ایسا غلط راستہ اختیار کیا تھا؟ اپنا تو یہ حال ہے کہ ایک معمولی مسلمان کے متعلق بھی ایسے سخت الفاظ کہنے سے دل ڈرتا ہے مگر علماء اہل حدیث کی جرأت و ہمت کی داد دیجئے کہ وہ اکابر ائمہ محدثین و فقہاء کے متعلق بھی بے جھجک زبان لعن وطعن دراز کر دیتے ہیں بعض حضرات کا خیال ہے کہ جس طرح شیعی فرقے کے لوگ یزید وغیرہ پر لعن وطعن کرنے کی مشق کرنے کے بعد سب صحابہ اور تبرا تک ترقی کر گئے' کچھ اسی طرح غیر مقلدین کی حنفی عصبیت نے بھی ترقی کے مدارج طے کئے ہیں۔

مؤلف مرعاۃ شرح مشکوٰۃ کی گراں قدر حدیثی خدمت کی ہم دل سے قدر کرتے ہیں اس لیے ہماری دلی تمنا ہے کہ مطبوعہ دو ضخیم جلدوں میں جو اس قسم کی غیر ذمہ دارانہ یا خلاف شان اہل علم وتحقیق باتیں درج ہوگئی ہیں ان کے بارے میں وہ معذرت کر دیں اور آئندہ جلدوں میں وہ احتیاط کریں۔

واللہ الموفق۔ یہاں تکمیل فائدہ کے لیے اتنا اور لکھنا مناسب ہے کہ علماء اہل حدیث جو اس قدر بڑھ چڑھ کر ائمہ متبوعین اور ان کی فقہ پر بے جا نقد کی جسارت کرتے ہیں' یہ ان کے لیے کسی طرح مفید نہیں بلکہ مضر ہوگی' اس وقت اگر وہ حکومت سعودیہ نجدیہ کے غرہ میں اور دوسرے اسباب و وسائل سے غلط فائدہ اٹھا کر حدود سے تجاوز کریں گے تو اس کے نتائج بہتر نہیں ہوسکتے۔

جو حضرات ان سے پہلے محض تعصب سے جتنا لکھ گئے ہیں اس کی بھی اہل علم میں کوئی وقعت نہیں ہے' ان لوگوں کا تو علم و فضل حافظ الدنیا ابن حجر عسقلانی کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے انہوں نے بھی جہاں محض تعصب سے کام لیا' وہ درجہ تحقیق سے گر گیا' یاد آیا کہ ہمارے حضرت شاہ صاحب نے درس بخاری شریف میں بحث وتر میں حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ذکر فرمایا' جس کو مسلم میں روایت کیا ہے اور اس میں تصریح ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز تہجد کے بعد وتر کی تین رکعات پڑھیں' اس حدیث کو حافظ نے فتح الباری صفحہ ۲/۳۳۱ میں ذکر کر کے لکھا کہ اس حدیث کی اسناد میں حصین بن عبدالرحمان ہیں اور ان میں کلام کیا گیا ہے

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہ حصین بخاری کے بھی رواۃ میں سے ہیں'...... بخاری باب السواک یوم الجمعہ میں ان سے روایت ذکر ہوئی ہے اور وہاں حافظ نے ان پر کچھ کلام نہیں کیا' دوسرے یہ کہ اس حدیث کو روایت کرنے والے حصین کے سواء اور بہت سے ہیں' حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ میں نے اپنے رسالہ وتر میں اس کے چھ متابع ذکر کئے ہیں اس لیے حافظ ابن حجر کا اس حدیث مسلم کو راوی مذکور کے باعث یہ سمجھ کر یاد دکھلا کر کہ وہ متفرد ہیں' مرجوح قرار دینا درست نہیں۔

اس کے بعد بطور مزاح کے یہ بھی فرمایا کہ اگر حافظ ابن حجر کا منشاء ایسا ہے کہ وہ اور ان کے ہم مسلک جنت میں جائیں اور حنفیہ نہ جاسکیں تو ایسا نہیں ہوسکتا' البتہ وہ اور ہم ساتھ جائیں تو ٹھیک ہے' غرض تعصب و تنگ نظری کی بات تو حافظ جیسے جلیل القدر محدث کی بھی نہیں چل سکی' مبارک پوری صاحب اور ان کے ہم مسلک علماء کی کیا چل سکتی ہے' ہاں اس سے برائے چندے دنیا کی سرخروئی' عزت و دولت ضرور مل سکتی ہیں جو آخرت کی ابدی عزت و دولت کے مقابلے میں پرکاہ کے برابر بھی نہیں ہیں' دوسرے یہ باتیں منصب خدمت علم حدیث کے بھی سراسر منافی ہیں اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ

یہاں یہ تمام تفصیل صرف اس لیے ذکر کی گئی کہ علماء اہل حدیث کے طرز تحقیق اور محدثین وفقہاء حنفیہؒ کے ساتھ ان کے متعصبانہ وغیرہ منصفانہ برتاؤ سے ناظرین کرام مطلع رہیں۔

غرض فقہ حنفی کو ابتداء میں کچھ لوگوں نے مدارک اجتہاد امام اعظم وغیرہ تک رسائی نہ ہونے کی وجہ سے خلاف سنت سمجھا' کچھ حضرات نے یہ سمجھ لیا کہ سنت پر قیاس کو ترجیح دی گئی ہے' کچھ لوگ حسد و رشک کا شکار ہو کر مخالفت کر گئے' اس کے بعد کچھ لوگوں پر محض تعصب کا رنگ غالب آ گیا' جن کی باقیات صالحات آج بھی موجود ہیں۔

عون المعبود' تحفۃ الاحوذی اور مرعاۃ میں بہت سی جگہ بے جا تشدد' تلبیس' مغالطہ آمیزی اور ناانصافی سے کام لیا گیا ہے' جن کی نشاندہی و جوابدہی' انوار الباری میں اپنے مواقع میں ہوتی رہے گی۔

وکم من عائب قولا صحیحا وآفتہ من الفھم السقیم

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

۶۔اس امر پر بھی تنبیہ ضروری ہے کہ حصول ثواب کے لیے نیت مرتبہ علم میں ہمارے نزدیک کافی ہے، جس میں ذہول وعدم شعور وقتی حارج نہیں اور عرفی نیت بھی اسی قدر ہے، باقی منطقیوں کا علم العلم کا درجہ، جس میں شعور واستحضار نیت بھی ہر وقت ضروری ہے حصول ثواب کے واسطے غیر ضروری ہے، دوسرے لوگ غالباً نیت کو مرتبۂ علم العلم میں ضروری سمجھتے ہیں۔

مذکورہ بالا وجوہ کا ذکر یہاں اس لیے کر دیا گیا ہے کہ ائمہ حنفیہ کے مدارک اجتہاد وفہم معانی حدیث کا کچھ نمونہ سامنے آجائے اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ اس قسم کے اجتہادی مسائل میں مختارات حنفیہ پر طعن کرنا موزوں نہیں۔

پس حدیث مذکور تمام اقسام وانواع اعمال کو شامل ہے اس میں نیت وعدم نیت سے تعرض نہیں ہے بلکہ اچھی نیت کے ساتھ اعمال حسنہ کرنے والوں کی مدح اور بری نیت والوں کو تنبیہ مقصود ہے تاکہ وہ اپنے تمام نیک اعمال خالص لوجہ اللہ کریں۔اور ان کو غلط وفاسد ارادوں سے محفوظ رکھیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) یعنی بہت سے لوگ صحیح بات میں عیب نکالنے والے ملیں گے، حالانکہ سارا عیب خود ان کی کمی عقل وفہم کا ہے

ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے اس زریں اصول کی طرف اشارہ فرمایا کہ وظیفۂ نبوت کلیات واصول مہمہ اور عمومی ہدایات میں جزئیات وفروعی مسائل کا استنباط واستخراج وظیفہ مجتہد ہے، اس لیے کسی کامل الاجتہاد یعنی مجتہد مطلق کے متعلق ایسی کچی بات کہنا کہ اس نے سنت صحیح ثابتہ کی مخالفت یا اس کے صحیح جانشینوں نے سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بغض رکھا، بڑی بے محل بات ہے جو اہل علم واصحاب انصاف کی شان سے بہت بعید ہے، درحقیقت تمام مجتہدین علوم نبوت کے صحیح خادم تھے پھر امام اعظمؒ کا درجہ تو تمام مجتہدین میں سے بہت بلند ہے اور ان کی فقہ ہر ہر فقہ پر فائق ہے، ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے تیس سال کے شبانہ روز درس و مطالعۂ حدیث وتفسیر وغیرہ کے بعد فیصلہ فرمایا تھا کہ بجز ایک دو مسئلوں کے ہم نے تمام فقہ حنفی کو قرآن وحدیث سے مؤید پایا ہے امید ہے کہ انوار الباری کی اشاعت سے یہ حجت تمام ہو جائے گی **وما ذلک علی اللہ بعزیز**۔ائمہ مجتہدین کے کمال علم وفضل، بے نظیر ورع وتقویٰ اور خلوص وللہیت کے پیش نظر ہرگز یہ امر باور نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے اپنے محدود منصب اجتہاد سے آگے بڑھ کر حدود منصب نبوت میں کوئی قدم رکھا ہو، جن حضرات نے بھی اس قسم کا سوء ظن ائمہ مجتہدین کے بارے میں کیا ہے، وہ ان کی کھلی غلطی ہے، جس کی وجہ سے بڑے بڑے فتنوں کے دروازے کھلے ہیں اور ایک جماعت کو ان لوگوں کے اقوال وآراء کی آڑ میں نئی نئی فتنہ سامانیوں کے لیے مواد ملتا رہتا ہے۔ **واللہ المستعان**۔

امام وکیعؒ (تلمیذ امام اعظم وشیخ اصحاب صحاح ستہ) سے کسی نے کہا تھا کہ امام صاحب نے خطا کی، تو آپ نے برجستہ اس کو جواب دیا تھا کہ امام ابوحنیفہ کیسے خطا کر سکتے ہیں؟ حالانکہ ان کے ساتھ امام ابو یوسف وزفر جیسے علم قیاس واستنباط کے ماہر وفاضل یحیٰ ابن ابی زائدہ حفص بن غیاث، حبان ومندل جیسے حفاظ حدیث، قاسم بن معن جیسے لغت وعربیت کے حاذق اور داؤد طائی، فضیل بن عیاض جیسے زہد وورع کے امام ہیں، کیونکہ امام صاحب اگر کہیں خطا بھی کرتے تو یہ لوگ ان کو صواب کی طرف لوٹا دیتے (انتہا، علامہ ابن عبدالبر وتاریخ خطیب بغدادی)

یہ بھی امام وکیع نے فرمایا تھا کہ لوگوں نے مغالطہ آمیزیاں کر کے ہمیں امام ابوحنیفہ سے چھڑانا چاہا تھا حتیٰ کہ وہ دنیا سے رخصت ہوئے، اب تم اسی طرح ہمیں امام زفر سے چھڑانے کی سعی کرتے ہو تاکہ ہم ابن اسید اور ان کے اصحاب کے محتاج ہو جائیں (صفحہ ۳۱۳/ مقدمہ انوار الباری)

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے حجۃ اللہ میں اعتراف کیا کہ امام صاحب قوانین کلیہ سے جزئیات کا حکم دریافت کرنے کا غیر معمولی ملکہ رکھتے تھے، فن تخریج، مسائل کی باریکیوں پر اپنی دقیقہ رسی سے پوری طرح حاوی ہو جاتے تھے، فروع کی تخریج پر کامل طور پر توجہ فرماتے تھے، حضرت ابراہیم نخعی اور امام صاحب کے اقوال ومسائل کو اگر مصنف ابن ابی شیبہ، مصنف عبدالرزاق اور کتاب الآثار امام محمد کی مرویات سے موازنہ کر کے دیکھو گے تو چند مسائل کے سوا سب میں اتفاق واتحاد پاؤ گے۔(حجۃ اللہ صفحہ ۱۵۱)

امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کی حالات میں ہم نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ امام صاحبؒ کے زمانہ کے بڑے بڑے محدثین وفقہاء نے اعتراف کیا تھا کہ امام صاحب ناسخ ومنسوخ احادیث وآثار کے بہت بڑے عالم تھے۔

پھر بھی خود امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی غایت احتیاط تھی کہ یہ بھی فرما گئے جب بھی کوئی حدیث صحیح میرے قول وفیصلہ کے خلاف مل جائے تو وہی میرا مذہب ہے۔

مذکورہ بالا احوال وظروف میں حنفیہ کے لیے یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ کسی صحیح حدیث غیر منسوخ پر عمل نہ کریں یا اس پر عمل نہ کرنے کے لیے حیلے حوالے تلاش کریں، البتہ جو زریں اصول حدیث انبساط احکام کے سلسلے میں ائمہ حنفیہ نے اپنے پیش نظر رکھے ہیں ان سے پوری واقفیت ہونی ضروری ہے ورنہ ہر الزام والہام کی گنجائش نکالی جا سکتی ہے ان میں ۱۱۶ اہم اصول علامہ کوثریؒ نے تانیب کے صفحہ ۱۵۲ تا صفحہ ۱۵۴ میں ذکر کر دیے ہیں ان سے واقفیت علماء حنفیہ خصوصاً اساتذہ حدیث کو ضرور ہونی چاہیے تاکہ وہ مخالفوں کی مغالطہ آمیزیوں کا جواب دے سکیں جس طرح ان کے لیے کتب علم رجال کا پورا مطالعہ اور اس فن کے تمام نشیب وفراز پر متیقظانہ نظر رکھنا ضروری ہے اور اس سلسلہ میں تانیب الخطیب، جواہر مضیۂ فوائد بہیہ تقدمہ نصب الرایہ ذیول تذکرۃ الحفاظ ومع تعلیقات الکوثری) کا مطالعہ بہت مفید ہوگا۔ **واللہ الموفق والمیسر**

حدیث کا دوسرا جملہ ولکل امریٔ مانوی ہے اس سے مراد غایت وثمرۂ عمل ہے یا بعینہ وہی عمل؟ حضرت شاہ صاحبؒ کی رائے دوسری شق کی طرف ہے کیونکہ ہر شخص آخرت میں اپنے عمل کو بعینہ موجود پائے گا۔ قرآن مجید میں ہے و وجدو اما عملو ا حاضراً (کہ سب لوگ آخرت میں اپنے کئے ہوئے اعمال کو حاضر و موجود پائیں گے) گو جزاء عین عمل ہوگی پس آگے حدیث کے جملے میں شرط و جزا کے متحد ہونے کا اعتراض بھی ختم ہوجاتا ہے اور تقدیر کا مسئلہ بھی حل ہوجاتا ہے۔ کیونکہ یہی دنیا کے نیک اعمال آخرت میں نعمتوں و راحتوں کی صورت اختیار کرلیں گے جس طرح برے اعمال تکالیف و عذاب کی شکل میں ہوجائیں گے اس سے زیادہ تفصیل مسئلہ قدر میں آئے گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

ثواب اعمال کے سلسلہ میں یہ امر بھی لائق ذکر و یادداشت ہے کہ امام غزالیؒ نے یہ تفصیل کی ہے کہ اگر کسی کام میں غرض دنیوی کی نیت غالب ہے تو اس میں کوئی ثواب نہیں ملے گا اور اگر غرض دینی غالب ہے تو بقدر اس کے ہی ثواب ملے گا اگر دونوں برابر ہیں تب بھی اجر نہیں ملے گا اگر کسی عبادت کی ابتداء میں نیت خالص تھی پھر نیت میں اخلاص کے خلاف کوئی چیز آگئی تو ابوجعفر بن جریر طبری نے جمہور سلف سے نقل کیا کہ اعتبار ابتداء کا ہے اور بعد کو جو فساد نیت طاری ہوا خدا کے فضل و احسان سے امید ہے کہ اس کو بخش دے اور اس کا عمل خیرا کارت نہ ہو لہٰذا ہر نیک عمل کرنے والے کو چاہیئے کہ خشوع و خضوع لوجہ اللہ کے ساتھ ابتداء میں بھی نیت کی تصحیح کا پورا اہتمام کرے پھر اس پر استقامت کی بھی پوری سعی کرے اور خدا کی توفیق و نصرت کی ضرورت سے ہرگز غافل نہ ہو انسان نہایت ضعیف و کمزور پیدا کیا گیا ہے اس کے لیے یہ بات لائق صد ہزار شکر ہے کہ کسی نیک عمل کی توفیق حسن نیت و اخلاص تام کے ساتھ اس کو حاصل ہوجائے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اس عالم میں اجسام ظاہر ہیں اور دلوں کے ارادے مستور ہیں محشر میں صورت برعکس ہوجائے گی اور تمام لوگ نیتوں کو اجساد کی طرح برملا دیکھیں گے پس محشر محل ظہور نیات ہوگا اسی لیے اگر کسی ایک عالم میں ایک ہزار نیتیں ہوں گی تو قیامت کے دن وہ عمل ایک ہزار اعمال کی شکل میں ظاہر ہوگا۔ واللہ علیٰ کل شیء قدیر۔

۲- حدثنا عبداللہ[۱] بن یوسف قال اخبرنا مالک عن هشام بن عروة عن ابیه عن عائشة ام المومنین رضی الله عنها ان الحارث بن هشام سأل رسول الله صلی الله علیه وسلم فقال یا رسول الله! کیف یاتیک الوحی فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم :- احیانا یاتینی مثل صلصلة الجرس وهو اشده علی فیفصم عنی وقد وعیت عنه ماقال، واحیانا یتمثل لی الملک رجلا فیکلمنی فاعی ما یقول، قالت عائشة رضی الله عنها ولقد رایته ینزل علیه الوحی فی الیوم الشدید البرد فیفصم عنه وان جبینه لیتفصد عرقا۔

ترجمہ:۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ حارث بن ہشام نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ کے پاس وحی کس طرح آتی ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ کبھی تو وہ میرے پاس گھنٹی کی آواز کی طرح آتی ہے جو مجھ پر سب سے زیادہ بھاری ہوتی ہے اس کے آثار ختم ہونے تک میں وحی الٰہی کو پوری طرح محفوظ کرلیتا ہوں اور کبھی فرشتہ انسانی شکل میں میرے سامنے ہوتا ہے پھر جو کلمات میں اس سے سنتا ہوں ان کو محفوظ کرلیتا ہوں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ میں نے سخت سردی کے دنوں میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہونے کے وقت دیکھا کہ ختم وحی پر بھی آپ کی اطراف پیشانی مبارک سے پسینہ اس طرح بہتا تھا جیسے فصد لگا کر رگیں کھول دی گئی ہوں۔

تشریح:۔ انبیاء علیہم السلام پر وحی کا نزول بہت سے طریقوں پر ہوتا ہے ان کے خواب بھی وحی ہیں الہامات بھی وحی ہیں خدا کا فرشتہ جو کچھ نبی کے دل میں ڈالتا ہے وہ بھی وحی ہیں، کبھی فرشتہ اپنی اصل صورت میں پیغمبر کے پاس آتا ہے اور خدا کی طرف سے کلام کرتا ہے، وہ بھی وحی۔ ہے، کبھی حق تعالےٰ

[۱] حافظ حدیث حجہ ثقہ متفق علیہ امام مالک امام لیث بن سعد اور شیخ عیسیٰ بن یونس کوفی (تلامذہ حدیث امام اعظمؒ) وغیرہ کے تلمیذ حدیث ہیں امام بخاری ترمذی ابوداؤد نسائی وغیرہ نے آپ سے روایت کی۔ ۲۱۸ھ میں وفات ہوئی رحمہ اللہ تعالےٰ (تہذیب و تذکرۃ الحفاظ)

جل ذکرہ، بلاواسطہ بھی نبی سے بات کرتے ہیں وہ بھی وحی ہے، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کوہ طور پر، اور حضور اکرم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے شب معراج میں کلام فرمایا وغیرہ، اس لیے یہاں جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف دو طریقے نزول وحی کے بیان فرمائے اس سے چونکہ مقصود حصر نہیں ہے بلکہ آپ کے پاس جو خدا کی وحی سینکڑوں مرتبہ آئی ہے، ان میں سے بکثرت نزول وحی کے یہی دو طریقے تھے، ان کو ہی بیان فرمایا۔

گھنٹی کی آواز کی طرح

مقصد یہ ہے کہ جس طرح گھنٹی کی آواز مسلسل بلا انقطاع سنی جاتی ہے اور ہمارے کلام کی طرح اس میں الفاظ وکلمات کے جوڑ توڑ ابتدا وانتہا نہیں ہوتے اسی طرح اس قسم کی وحی بھی اترتی ہے خواہ اس کو فرشتہ کی آواز وحی کہیں یا اس کے پروں کی آواز (اس کو حافظ ابن حجر نے اختیار کیا ہے، یا حق تعالیٰ جل شانہ، کی صورت بلا تشبیہ۔ (اس آخری صورت کو ہمارے حضرت شاہ صاحب "ترجیح دیتے تھے)

اگر اس صورت وحی کو فرشتہ کی آواز وحی قرار دیں گے تو حضرت شاہ صاحبؒ نے اس کو نقرات ٹیلیگرام سے تشبیہ دی ہے، یعنی جس طرح ٹیلی گرام کی کٹ کٹ کی مسلسل آواز سے اس کا جاننے والا مطلب سمجھ لیتا ہے، اسی طرح فرشتہ جو پیغام خدا کی طرف سے اس کے نبی کو پہنچا رہا ہے وہ اس کو سمجھ کر محفوظ کر لیتا ہے اور فرشتہ ایسی صورت میں اس نبی کو نظر نہیں آتا اور نہ وہ صورت متعارف کلام کی ہو جائے گی۔ (مشکلات القرآن صفحہ ۲۴۴)

بحث ونظر: ہمارے حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ نے اس موقعہ پر جو کچھ تحقیق فرمائی ہے وہ چونکہ نہایت اہم ہے اس لیے ہم مختلف یاداشتوں سے جمع کر کے یہاں ذکر کرتے ہیں:۔ آیت قرآنی **وما كان لبشران يكلمه الله الا وحياأو من وراء حجاب او يرسل رسولا فيوحي باذنه ما يشاء' انه علي حكيم** (شوریٰ) کی تفسیر میں فرمایا کہ وحی وکلام خداوندی کی تین صورتیں ہیں' اول یہ کہ نبی وموحی الیہ کے باطن کو مسخر کر کے عالم قدس کی جانب متوجہ کر دیا جائے۔ پھر اس میں خدا کا کلام و وحی ڈالی جائے' اس صورت میں نبی کے جو اس ظاہری کو اس کلام کے سننے میں کچھ دخل نہیں ہوتا' اور نہ اس میں فرشتہ کا توسط ہوتا ہے' اسی لیے اس کو لفظ وحی سے تعبیر فرمایا۔ جس کے معنی خفی اشارہ کے ہیں' اس صورت میں انبیاء علیہم السلام کے الہامات ومنامات وغیرہ داخل ہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ حق تعالیٰ کسی بندے سے پس پردہ کلام فرمائیں' جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کوہ طور پر اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے شب معراج میں کلام فرمایا[1]۔

---

[1] رہی یہ بحث کہ شب معراج میں کلام کے ساتھ دیدار خداوندی سے بھی مشرف ہوئے یا نہیں؟ حضرت شاہ صاحبؒ کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ آیت میں کلام پس پردہ کی قید سے تو یہی مفہوم ہوتا ہے کہ کلام کے وقت دیدار بوجہ حجاب نہیں ہو سکتا' مگر حدیث صحیح مسلم کی روشنی میں کہ دیدار خداوندی حجاب نوری کے ساتھ ہو سکتا ہے' ہم کہہ سکتے ہیں کہ کلام و دیدار کا اجتماع بیک وقت بھی ممکن ہے۔ امام احمد نے بھی فرمایا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دیدار خداوندی سے مشرف ہوئے' یہ دیکھنا ایسا تھا کہ جیسے ایک محب اپنے عظیم القدر محبوب کو اور غلام اپنے جلیل المرتبت آقا کو دیکھتا ہے کہ رعب جمال وجلال کے باعث نہ پوری طرح نظر بھر کر اس کی طرف دیکھ ہی سکتا ہے اور نہ ایسے قیمتی لمحات میں اس کے جمال جہاں آرا کی طرف سے صرف نظر ہی کر سکتا ہے۔

چو رسی بکوئے دلبر بسپار جان مضطر — کہ مبادا بار دیگر نہ رسی بدیں تمنا

دوسری طرف یہ حال ہے۔

فبدا الینظر کیف لاح فلم یطق — نظر الیہ وردہ اشجانہ

(محبوب کا جمال جہاں آراء سامنے آیا تو بے ساختہ اس طرف نظر اٹھی مگر عاشق کے ہجراں نصیب' غمزدہ دل میں اتنی طاقت نہ تھی کہ اس کی طرف نظر بھر کر دیکھ سکتا' اسی لیے وہ کسی کو کچھ نہیں بتا سکتا کہ محبوب کو کیسے اور کس حالت میں دیکھا۔

اشتاقہ فاذابدا — اطرقت من اجلالہ

عاشق کہتا ہے کہ میں محبوب کے دیدار کا بے حد مشتاق رہتا ہوں مگر کیا کروں' جب وہ سامنے آتا ہے تو اس کے رعب جلال وجمال (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

تیسری صورت یہ ہے کہ کلام خداوندی یا وحی بتوسط ملک آئے' پھر اس کی دو صورتیں ہیں' ایک یہ کہ خدا کا فرشتہ باطن نبی کو مسخر کرے' دوسرے یہ کہ وہ فرشتہ صورت بشر میں ظاہر ہو کر کلام کرے۔

اس تفسیر کے بعد حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ حدیث مذکور میں وراء حجاب والی صورت اور وحی خفی کے علاوہ توسط ملک والی دو کثیر الوقوع صورتوں کا ذکر ہے اور چونکہ حق تعالیٰ کے لیے صوت ثابت ہے' جیسا کہ امام بخاریؒ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے (ملاحظہ ہو بخاری کا باب خلق افعال العباد) اور میں بھی اسی کو حق سمجھتا ہوں' قید یہ ہے کہ صوت باری۔ اصوات مخلوق سے مشابہ نہیں ہے دوسری بات میرے نزدیک یہ ہے کہ صلصلۃ الجرس جیسی صوت وہ صوت باری تعالیٰ ہی ہے' کیونکہ اس کا ثبوت تین جگہ ملتا ہے' (۱) حضرت ربوبیت سے صدور کے وقت' تلقی (۲) ملک کے وقت اور (۳) جس وقت اس کو نبی تک پہنچاتا ہے پس اس وحی کا مبداء عرش الٰہی کے اوپر سے ہے اور منتہی نبی کریم تک ہے۔ اسی لیے طبرانی کی حدیث میں ہے کہ جب وحی اترتی ہے تو اس سے تمام آسمانوں کے رہنے والوں پر خوف وخشیت الٰہی سے کپکپی طاری ہو جاتی ہے اور وہ سب سجدہ میں گر جاتے ہیں پھر سب سے پہلے حضرت جبرئیل علیہ السلام سجدہ سے سر اٹھاتے ہیں اور حق تعالیٰ ان سے کلام فرماتے ہیں' اس حدیث کی تخریج حافظ ابن حجر نے بھی باب قول اللہ عزوجل "ولا تنفع الشفاعۃ" میں کی ہے۔

پھر یہ بات کہ یہ صورت باری تعالیٰ جس طرح اہل سمٰوات کو پہنچتی ہے' اسی طرح بعینہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جاتی ہے یا درمیان میں فرشتہ اس کو لے کر محفوظ کر لیتا ہے اور نبی تک پہنچاتا ہے' جس طرح آج کل آوازوں کو فونوغراف میں محفوظ کر لیا جاتا ہے چونکہ ابھی تک اس بارے میں کوئی فیصلہ کن بات نہیں ملی۔ اور حدیث میں بھی اس کی طرف تعرض نہیں کیا گیا' اس لیے میں بھی کچھ نہیں کہہ سکتا' تاہم یہ امر طے شدہ ہے کہ وہ ایک ہی چیز ہے جو وہاں سے چل کر یہاں تک پہنچتی ہے[1]' اس صورت میں چونکہ فرشتہ کا نزول قلب نبی پر ہوتا ہے' اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) سے مجبور ہو کر اپنی نظریں نیچی کر لیتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ جب عشق مجازی میں یہ کیفیت ہوتی ہے تو عشق حقیقی کا مرتبہ تو اس سے کہیں بلند و برتر ہے' یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ کے دیدار کی دنیا میں بحالت بیداری' بہت کم نوبت آتی ہے بلکہ سرور کائنات اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سوا دوسرے انبیاء علیہم السلام کے لیے بھی کوئی نقل نہیں ملتی' البتہ منامی دیدار کے کچھ واقعات دوسروں کے لیے بھی ملتے ہیں۔ مثلاً حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق منقول ہوا ہے کہ آپ حق تعالیٰ کے دیدار پر انوار سے اپنی زندگی میں ایک سو بار مشرف ہوئے۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔

ہمارے حضرت شاہ صاحب نے اس موقعہ پر درس بخاری شریف میں یہ بھی فرمایا کہ شاید ایسا ہوا ہو کہ سرور کائنات علیہ الف الف تسلیمات وتحیات ابتداء میں "وحی نبوت" سے مشرف ہوتے رہے اور آخر میں "عیانی روایت" سے بہرہ اندوز ہوئے' جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام پہلے کلام کلام سے مشرف ہوئے اس کے بعد رؤیت سے' پھر یہ خدا کے علم میں ہے کہ آپ پر غشی رؤیت سے قبل طاری ہوئی یا روئیت کے بعد' اسی لیے سورہ نجم میں سرور کائنات کے لیے دیدار الٰہی کی تصریح فرمادیا کہ وہ رؤیت دل ونگاہ دونوں سے ہوئی' اور بغیر طغیانی وزیغ ہوئی۔

اس موقعہ پر حضرت شاہ صاحبؒ کی تفسیر سورۂ نجم کی مکمل تفسیر قابل دید ہے جو علوم وحقائق کا خزینہ ہے' اگر طوالت کا خوف نہ ہوتا تو ہم اس کو یہاں ضرور ذکر کرتے۔ (دیکھو مشکلات القرآن صفحہ ۲۴۰ تا صفحہ ۲۶۴)

[1] قرآن مجید کی سورۃ معارج کی ایک آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تک روح وملائکہ کا عروج ایک دن میں ہوتا ہے' جس کی بڑائی دنیا والوں کے حساب سے پچاس ہزار سال کی ہے' حالانکہ خدا کے فرشتے پل پل کی خبریں وہاں پہنچاتے رہتے ہیں۔ اور حدیث میں آتا کہ مرنے کی بعد نیک مرد مومن کی روح کو فرشتے خوشبو دار ریشمی کپڑوں میں ملبوس کر کے عرش الٰہی کے سامنے لے جاتے ہیں تاکہ خدا کے سامنے سجدہ کرے' تو اتنی عظیم مسافت کو روح بھی آن کی آن میں طے کر لیتی ہے اور اس کے بعد واپس ہو کر قبر کے سوال وجواب کے وقت آ موجود ہوتی ہے' ان سب حیرت انگیز چیزوں کا عرصہ قبل تک سمجھنا بوجھنا ہماری محدود عقول کے لیے کچھ دشوار تھا' مگر اس دور کی مادی ترقیات اور سائنس کی جدید ایجادات نے اس کو سہل کر دیا ہے۔ دیکھئے ہماری بشری مادی ضعیف آواز جو عام حالات میں بمشکل میل دو میل جاسکتی ہے' ریڈیو کی لاسلکی امواج کے ذریعہ ایک منٹ کے کچھ حصے میں ساری دنیا کے لوگوں کو سنائی جاسکتی ہے' پھر روح روحانیت' جن وملائکہ جیسی لطیف چیزوں کا کیا کہنا ہے' اور خداوند تعالیٰ کی صوت وحی اگر اس عظیم مسافت کو طے کر کے آن کی آن میں نبی کے قلب منور تک آجاتے تو اس میں کیا استبعاد رہا؟

اس تفصیل کے بعد وحی الٰہی کی نہ صرف عظمت قلب میں جاگزیں ہوتی ہے بلکہ اس کی عصمت بھی واضح ہو جاتی ہے' اول تو یوں بھی (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

نبی بغیر واسطۂ سمع کے کلام خداوندی کو سمجھتا ہے اور دل میں محفوظ کرتا ہے اس لیے صلصلۃ الجرس والی صورت فرشتہ کے بصورت بشر یا اپنی اصلی صورت میں آ کر کلام کرنے کی صورت سے الگ ہوگئی۔

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے اس آیت کے تحت صفحہ ۳۰۶/۸ وصفحہ ۳۰۷/۸ میں چند احادیث نقل کی ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب سورۂ والنجم تلاوت فرمائی اور افرأیتم اللات والعزی ومناۃ الثالثۃ الاخری پر پہنچے تو شیطان نے آپ کی زبان مبارک سے تلک الغرانیق العلی وان شفاعتھن لترتجیٰ یہ کلمات بھی ادا کرا دیے (نعوذ باللہ) جس پر مشرکین بھی سجدہ میں گر گئے اور خوش ہوئے کہ ہمارے خداؤں کا ذکر آپ نے بھلائی سے کیا' پھر اسی کے بارے میں یہ آیت بالا نازل ہوئی۔

پھر حافظؒ نے لکھا کہ یہ احادیث روایتی نقطہ نظر سے اگرچہ ضعیف یا منقطع ہیں' مگر کثرت طرق اس امر کا ثبوت ہے کہ اس قصہ کی کوئی اصلیت ضرور ہے' پھر یہی قصہ طبری کی روایت کردہ دو مرسل احادیث سے بھی ثابت ہے' جن کے رجال صحیحین کی شرط پر ہیں' پھر حافظ نے لکھا ہے کہ ابوبکر بن العربیؒ نے اپنی حسب عادت بڑی جرأت سے کام لے کر کہہ دیا کہ طبری نے جو روایات اس سلسلہ میں روایت کی ہیں وہ بالکل بے اصل اور باطل ہیں' پھر لکھا کہ ابوبکر بن العربی کا اس طرح منہ بھرا ادعا قابل رد ہے' اسی طرح عیاض کا یہ قول بھی ہے کہ اس قصہ کی حدیث کی کسی اہل صحت محدث نے تخریج نہیں کی اور نہ کسی ثقہ راوی نے اس کو بے داغ سند متصل سے روایت کیا ہے پھر اس کے ناقلین بھی ضعیف' روایات بھی مضطرب اور اسناد بھی منقطع ہیں' اور اسی طرح عیاض کا یہ قول کہ تابعین ومفسرین میں سے جن حضرات سے یہ قصہ نقل کیا گیا ہے خود انہوں نے بھی اس کو سند کے ساتھ مرفوع نہیں کیا' اور اکثر طرق ان سے اس بارے میں ضعیف اور واہی ہیں' پھر عیاض نے بطرق روایت بھی تردید کی اور کہا کہ اگر ایسا واقعہ ظہور پذیر ہوا ہوتا تو بہت سے مسلمان اسی وقت مرتد ہو جاتے' حالانکہ ایسا نہیں ہوا۔

اس کے بعد حافظ نے لکھا ہے کہ یہ تمام باتیں قواعد واصول کے خلاف ہیں کیونکہ جب طرق روایت کثیر ہوں اور ان کے مخارج متباین ہوں تو یہ اس امر کا ثبوت ضروری کہ اس واقعہ کی اصل ہے اور میں بتلا چکا ہوں کہ ان روایات میں سے تین اسنادیں شرط صحیح پر ہیں' اور وہ مراسیل ہیں جو حجت ہیں۔

پھر حافظ نے یہ بھی لکھا ہے کہ جب اس واقعہ کی صحت متعین ہو چکی تو چونکہ ایسا ہونا عصمت وحی وعصمت انبیاء کے خلاف ہے۔ اس لیے اس کی تاویل بھی کرنی ضروری ہے کیونکہ پیغمبر کی زبان سے قرآن مجید کے کلمات پر ایک حرف کی زیادتی بھی عمداً یا سہواً ناممکن ہے' پھر حافظ نے اس واقعہ کی چند تاویلات ذکر کیں اور ان کی تردید بھی بیان کی جو ابن العربی وحضرت عیاض سے منقول ہے آخر میں حافظ نے ایک توجیہ کو احسن الوجوہ (بہترین توجیہات) قرار دیا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تلاوت فرما رہے ہوں کہ شیطان نے آیت مذکورہ کے درمیانی سکتوں میں ایک جگہ موقعہ پا کر آپ کی آواز میں آواز ملا کر یہ کلمات کہہ دیے جس کو کچھ لوگوں نے سمجھ لیا کہ یہ کلمات بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے ادا فرمائے ہیں' حالانکہ ایسا واقع میں نہیں ہوا۔

ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے درس بخاری میں حافظ کی ذکر کردہ اس توجیہ کا ذکر فرما کر فرمایا تھا کہ ہمارے نزدیک یہ بھی ممکن نہیں کہ نبی کے لہجہ وآواز کی نقل شیطان کر سکے' ورنہ اس سے بھی ''عصمت وحی'' پر حرف آتا ہے' ہاں یہ ممکن ہے کہ حاضرین مجلس میں چونکہ مشرکین مکہ بھی تھے' ان میں سے کسی نے اپنی جگہ پر یہ کلمات ادا کیے ہوں جس سے وحی الٰہی اور نبی کی قرأت پر کوئی اثر نہیں پڑتا مشرکین مکہ کی زبان پر تو یہ کلیات خوب چڑھے ہوئے تھے' وہ ان کا ورد کرتے تھے اور طواف میں بھی یہی کلمات کہا کرتے تھے (دیکھو معجم البلدان الیاقوت)

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) صوت خداوندی اصوات مخلوقین سے الگ اور ممتاز (لیس کمثلہ شیء) پھر وہ جس شان واہتمام سے عرش الٰہی سے قلب نبی تک آتی ہے وہ دنیا کے حفاظتی نظام کے مقابلہ میں غایت درجہ محفوظ' جبرئیل علیہ السلام تک تو کسی کی دراندازی ممکن ہی نہیں' اور وہاں سے نبی ومرسل خداوندی تک بھی فرشتوں کا زبردست حفاظتی پہرہ' اس لیے وحی الٰہی کا کوئی حرف باہر جا سکے نہ باہر کی کوئی چیز اس کے اندر آ سکے۔

غرض حافظ ابن حجرؒ کا حدیث مذکور کو کثرت طرق وغیرہ سے استدلال کر کے قابل وثوق قرار دینا صحیح نہیں، نہ یہ اصول روایت کے مطابق ہے نہ اصول محدثین پر، کیونکہ مراسیل کو حجت ماننے والے بھی صرف ثبوت احکام میں ان کو حجت مانتے ہیں نہ کہ عقائد وایمانیات میں) کیونکہ عقائد وایمانیات کے لیے دلیل مثبت قطعی کا وجود ضروری ہے، اخبار آحاد ظنی ہیں جن سے کسی عقیدہ قطعیہ کا ثبوت نہیں ہو سکتا چہ جائیکہ ان سے کسی عقیدہ ثابتہ کا ابطال ہو اور ظاہر ہے کہ عصمت رسول اور عصمت وحی الٰہی کا عقیدہ تو مدار اسلام واسلامیات ہے، اس کو اخبار احاد سے مخدوش کرنا، پھر تاویلات کی تلاش کرنا کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے۔

علامہ نوویؒ نے فرمایا کہ جو اخباریوں اور مفسروں نے سورۂ نجم کی تلاوت کے وقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے معبودان مشرکین کی مدح کے کلمات جاری ہونے کے بارے میں روایت کیا ہے وہ قطعاً باطل ہے، اس بارے میں نقل صحیح وعقل سلیم کی رو سے کچھ ثابت نہیں ہے۔

علمی فائدہ:۔ اس موقعہ پر ایک دوسرا بھی اہم فائدہ قابل ذکر ہے کہ سورۂ حج میں ایک آیت ہے **وما ارسلنا من قبلک من رسول ولا نبی الا اذا تمنی القی الشیطان فی امنیتہ** ہمارے حضرت شاہ صاحب نے اس آیت کی تفسیر وہ پسند فرمائی ہے جو حضرت شیخ عبدالعزیز دباغ سے "ابریز" میں منقول ہے کہ "حق تعالیٰ نے جو نبی ورسول بھی کسی امت کی طرف بھیجا ہے وہ اپنی امت کے ایمان لے آنے کی اُمید وتمنا کیا کرتا تھا مگر شیطان ان لوگوں کے قلوب میں وساوس اور شبہات ڈال کر زیغ پیدا کرتا تھا، پس جن کے دلوں میں وہ خطرات جم گئے، وہ ان کے لئے موجب کفر ہو گئے اور جن پر خدا نے فضل فرمایا ان کے خطرات مٹا دیئے، اور اپنی توحید ورسالت کی نشانیاں ان کے قلوب میں مستحکم کر دیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ وساوس وخطرات تو دونوں فریق کے دل میں ڈالے جاتے ہیں مگر فرق اتنا ہے کہ جن پر خدا کا فضل ہوتا ہے ان کے قلوب پر ان کا بقا نہیں ہوتا اور جن نا (اہلوں) پر اس کا فضل واحسان نہیں ہوتا، ان کے قلوب سے شیطان کے القاء کئے ہوئے وساوس وشبہات دور نہیں ہوتے۔

حسن اتفاق سے اس موقعہ پر حضرت شیخ عبدالعزیز دباغ کا ذکر خیر آ گیا تو چند کلمات اور بھی لکھے جاتے ہیں، یہ بارہویں صدی کے قائلین شریعت وطریقت میں سے تھے اور باوجود امی ہونے کے، ان سے نہایت بلند پایہ اور گرانقدر علوم نبوت منقول ہوئے ہیں، امت محمدیہ میں ایسے کاملین کا وجود انبیاء ومرسلین کے علوم وکمالات کے علم ویقین کا بڑا ذریعہ ہیں کہ ان کے علمی وعملی کمالات بھی ظاہری تعلیم وتربیت کے بغیر، صرف خدائے برتر کے فضل وانعام کا ثمرہ ہوتے ہیں، شیخ عبدالعزیز دباغ کو باوجود امی ہونے کے ایسا روشن دل ودماغ عطا ہوا تھا کہ وہ عام احادیث اور احادیث قدسیہ کے درمیان فرق کر لیتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ ان دونوں کے انوار الگ الگ ہیں، صحیح احادیث کو موضوع احادیث سے الگ کر دیتے تھے، اور فرماتے کہ موضوع میں نور نبوت نہیں ہے، بعض مرتبہ صحیح حدیث میں موضوع حدیث کا کچھ حصہ شامل کر کے دریافت کیا گیا تو فوراً فرمایا کہ اتنی صحیح ہے اور اس قدر اس میں موضوع شامل ہے، تمام انبیاء علیہم السلام کے حالات مفصل اس طرح بیان فرمایا کرتے تھے کہ جیسے خود ان کے ساتھ زندگی گذاری ہو۔ بہ کثرت مشکلات قرآن وحدیث کو براہ راست سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک سے رجوع فرما کر شافی جواب مرحمت فرماتے تھے۔

ان کے افادات جلیلہ کا مجموعہ "ابریز" کی صورت میں شائع ہو چکا ہے، تفسیری حصہ میں یہ بھی ملتا ہے کہ ان کے تلمیذ ومستفید خاص شیخ احمد مرتب "ابریز" نے قصۂ غرانیق کے بارے میں سوال کیا کہ اس میں حضرت عیاض وغیرہ حق پر ہیں جو اس قصہ کے وقوع کا انکار کرتے ہیں، یا حافظ ابن حجر جو اس کو صحیح قرار دیتے ہیں۔

اس کے بعد حافظ ابن حجر کی پوری بحث نقل کی (جو ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں) تو حضرت شیخ نے جواب میں فرمایا کہ "حق وصواب ابن العربی اور حضرت عیاض اور ان کے موافقت کرنے والے محدثین کے ساتھ ہے" غرانیق والا قصہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قطعاً وقوع میں نہیں آیا، اور مجھے بعض علماء کے کلام پر بڑا تعجب ہوتا ہے جیسے یہی قول حافظ ابن حجر سے صادر ہوا اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قصہ

کا ذرا سا حصہ بھی صحیح ہو تو نہ شریعت پر اعتماد قائم رہے گا اور نہ عصمت انبیاء کا حکم باقی رہے گا' اور رسول خدا کی شان ایک عامی انسان کی سی رہ جائے گی کہ آپ اور آپ کے کلام پر شیطان کا تسلط ہوا، اور اتنا تسلط ہوا کہ جس بات کے زبان سے نکالنے کا نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارادہ فرمایا اور نہ وہ آپ کو پسند تھی' وہ شیطان نے آپ کی زبان سے نکلوادی۔

اتنی بڑی بات اگر وقوع میں آجاتی تو رسالت پر وثوق کیسے رہتا۔ پھر فرمایا کہ مومن پر واجب ہے کہ اس قسم کی حدیثوں سے' جو دین میں شبہات پیدا کریں' قطعاً منہ پھیرلیں اور ان کو دیوار پر پھینک ماریں (کیونکہ وہ صحت کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتیں) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معصومیت کا وہ عقیدہ رکھیں جو آپ کو شایان ہے' خصوصاً آپ کا مرتبہ اتنا بلند ہے کہ اس سے اوپر کسی مخلوق کا مرتبہ نہیں"۔ (ابریز صفحہ ۱۴۳ اور صفحہ ۱۴۴)

اسی موقعہ پر ابریز میں ایک دوسرا سوال بھی درج ہے کہ میں نے ہاروت و ماروت کے قصہ کی بابت دریافت کیا کہ اس میں بھی حضرت عیاض اور ابن حجر کا ایسا ہی اختلاف ہے' حضرت عیاض انکار کرتے ہیں اور ابن حجر واقعہ بتلاتے ہیں' فرمایا اس میں بھی حق حضرت عیاض کے ساتھ ہے اور قصہ بالکل غلط ہے'۔

یہاں عظمت و عصمت وحی کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوا کہ احادیث کی صحت و ضعف وغیرہ کے بارے میں حافظ ابن حجر یا اور کسی بڑے محدث کا فیصلہ قطعی حجت نہیں ہے اور اصولی طور پر یہ امر ہر اختلاف کے موقعہ میں نہایت ضروری و اہم ہے کہ دوسرے اکابر محدثین کی تحقیق بھی دریافت کی جائے تا کہ بات اچھی طرح نکھر کر سامنے آجائے' ائمہ احناف اور ان کے مسلک قویم کے خلاف بھی جو کچھ دراز دستیاں ہوئیں وہ زیادہ تر بعض اکابر کے یک طرفہ رجحانات' تعصب مذہبی یا رواۃ کے بے جا نقد و جرح کے باعث ہوئیں اس لیے حدیثی تحقیقات کا معیار ہر تنگ نظری و تعصب سے بالا تر ہونا چاہیے ورنہ وہ "بجائے خدمت حدیث" کے اپنے اپنے رجحانات و نظریات کی خدمت کہلانے کی زیادہ مستحق ہوگی واللہ الموفق

دوسری اہم بات یہ ہے کہ باوجود اصول و عقائد مسلم اسلامیہ اور اصول محکمہ قرآن و حدیث اور اصول درایت کے خلاف ہونے کے بھی محض تعدد طرق سے کسی امر کو ثابت کر دینا اصول محدثین پر بھی درست نہیں ہو سکتا' اور امام اعظم کا مسلک اجتہاد اور طریق استخراج احکام اسی لیے زیادہ محکم و مضبوط رہے کہ انہوں نے عہد نبوت و صحابہ کے قریب ترین دور میں...... (اور سب ائمہ مجتہدین سے پہلے اصول و عقائد اسلام پر نظر کی' قرآن و حدیث سے اصولی احکام کا کھوج لگا کر غیر منصوص احکام کے استخراج کے لیے نہایت مستحکم اصول منضبط کئے' احادیث احکام میں سے ناسخ و منسوخ پر کڑی نظر ڈالی (اسی لیے ان کو اپنے زمانے کا سب سے بڑا عالم احادیث منسوخہ و ناسخہ تسلیم کیا گیا ہے) پھر اسی کے ساتھ آپ کی نظر آثار صحابہ' تعامل صحابہ اور فتاوی تابعین پر بھی بڑی گہری تھی۔ آپ اور آپ کے رفقاء تدوین فقہ تک جتنی احادیث پہنچیں' ان میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک واسطے بہت کم تھے اور بقول علامہ شعرانی رحمۃ اللہ علیہ وہ سب ثقہ راویوں کے تھے' اس لیے فقہ حنفی کے اصول پر جو احکام کی تخریج ہوئی وہ بعد کے طرق اجتہاد و اصول استنباط نیز طرق محدثین مابعد کے لحاظ سے' بہت زیادہ فائق' معتمد اور اسلم تھی۔ واللہ اعلم و علمہ اتم واحکم

انبیاء علیہم السلام کا سب سے بڑا وصف امتیازی وحی ہے

واضح ہو کہ انبیاء علیہم السلام کی سب سے بڑی خصوصیت و وصف امتیازی وحی الہی ہے جس کا نزول اجلال ہمارے پیغمبر سرور کائنات' فخر موجودات علیہ افضل الصلوات والتسلیمات پر سب سے زیادہ اہتمام و شان سے ہوا ہے حتیٰ کہ آپ پر نازل شدہ وحی کا ایک بڑا حصہ وحی متلو قرار پایا' جو قرآن مجید کی شکل میں حرف بحرف محفوظ ہے اور قیام قیامت تک اس کی حفاظت کا وعدہ خود رب العزت جل شانہ' نے فرمایا ہے اس کے بعد احادیث قدسیہ' احدیث متواترہ' احادیث مشہورہ اور پھر اخبار آحاد وغیرہ ہیں۔ یہ سب وحی الہی اور علوم نبوت کا گرانقدر ذخیرہ ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دور بعثت کی مختصر مدت (بیس سال کہ تین سال فترت وحی کے نکل جاتے ہیں) میں وحی کا نزول ہزار بار ہوا

بعض دفعہ ایک ایک دن میں دس دس بار بھی ہوا ہے جو آپ کی بہت بڑی خصوصیت بن جاتی ہے، کسی جگہ پر یہ بھی نظر سے گذرا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم (اروا حنا فداہ) پر چوبیس ہزار بار نزول وحی ہوا ہے۔ جب کہ حضرت آدم علیہ السلام پر دس بار، حضرت نوح علیہ السلام پر پچاس بار، حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ۴۸ بار اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر دس بار نزول وحی کا ذکر ملتا ہے۔

چونکہ اس دنیا کی ہدایت کے لئے آخری امت "خیر الامم" کے آخری پیغمبر پر کامل ومکمل دین آچکا' اور وحی الٰہی کا باران رحمت کی طرح بہ کثرت نزول ہوکر نعمت الٰہی کی تکمیل ہوچکی نیز خدائے برتر نے ہمیشہ کے لیے دین اسلام کو اپنا محبوب برگزیدہ وپسندیدہ دین قرار دے دیا۔ اس لیے وحی ونبوت بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہوچکی، جس کا شاہی اعلان بھی حجۃ الوداع کے موقع پر ہزاروں ہزار صحابہ کے مجمع میں کردیا گیا۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔

برکات وانوار نبوت ونزول وحی

حرمین شریفین میں سرور انبیاء ومرسلین سردار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود مبارک کے برکات وانوار' اور وحی الٰہی کے شب وروز نزول سے حق تعالیٰ کی مسلسل وبے پایاں رحمتوں کا جو ایک زریں دور گذرا ہے' اس کی نظیر سے اس دنیا کی پوری تاریخ خالی ہے یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا جس قدر غیر معمولی صدمہ تھا اس سے بھی زیادہ وحی الٰہی کا منقطع ہوجانے کا تھا۔

حضرت انسؓ سے مسلم شریف میں روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ایک مرتبہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اؤ ام ایمن کے یہاں چلیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کے یہاں جایا کرتے تھے' جب یہ دونوں حضرات ان کے پاس پہنچے تو وہ بے اختیار رو پڑیں' انہوں نے کہا کہ آپ کیوں روتی ہیں؟ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے حق تعالیٰ کے یہاں اعلیٰ سے اعلیٰ عیش وراحت کے سامان ہیں؟ اس کے بعد ام ایمن کا جواب سنیے' کتنے اونچے درجے کی بات کہی ہے فرمایا:۔ میں اس پر نہیں روتی' یہ میں بھی خوب جانتی ہوں کہ آپ کے لیے اللہ تعالیٰ کے یہاں کمال درجہ کی راحتیں موجود ہیں' البتہ اس لئے روتی ہوں کہ آپ کے بعد آسمان نے نزول وحی کا سلسلہ بند ہوگیا۔"

یہ بات کہہ کر ام ایمن نے ان دونوں حضرات کو بھی خوب خوب رلایا اور وہ بھی ان کے ساتھ روتی رہیں' اس حدیث سے کچھ اندازہ ہوسکتا ہے کہ صحابہ کرام اور صحابیات صالحات کی مبارک آنکھوں نے کیا کیا دیکھا تھا اور ان کے نورانی قلوب نے کیا کچھ پایا تھا۔ یہ ام ایمن کون تھیں' حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آزاد کردہ باندی' جو آپ کو اپنے والد ماجد کے ترکہ میں ملی تھیں اور چونکہ انہوں نے بچپن میں آپ کی خدمت آیا کی طرح انجام دی تھی' اس لیے آپ' ان کا اکرام ماں کی طرح فرماتے تھے' اور ان کی ملاقات کیلئے بھی گھر پر تشریف لے جایا کرتے تھے مگر آپ نے دیکھا کہ اس باندی صحابیہ کا ایمان کتنا قوی اور معرفت کتنی اونچی تھی اس لیے ان کے ایک جملے نے ایسے دو بڑے جلیل القدر صحابہ کو رونے پر مجبور کردیا۔

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ وحی ونبوت کا سلسلہ ختم ہوجانے سے یہ لازم نہیں کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام یا دوسرے فرشتوں کے نزول کا سلسلہ بھی دنیا سے منقطع ہوگیا' چنانچہ اس امر کی وضاحت حافظ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے فتاوی میں کی ہے۔

ابتداء نبوت ونزول قرآن مجید

حضرت شعبی سے روایت ہے کہ چالیس سال کی عمر میں آپ کو نبوت ملی' ابتداء نبوت میں تین سال تک حضرت اسرافیل علیہ السلام آپ

انبیاء علیہم السلام کے خصائص' پھر اس میں سے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے اخص خصائص کا تذکرہ نہایت اہم موضوع ہے اس پر مستقل تصانیف کی ضرورت ہے' علامہ سیوطی وغیرہ نے اس کی طرف توجہ کی مگر ہماری اردو زبان کی کتب سیرۃ مقدسہ میں اس موضوع پر بہت کم مواد ملتا ہے' تاہم ہمارے مخدوم ومحترم حضرت مولانا سید محمد بدر عالم صاحب میرٹھی مہاجر مدنی دام ظلہم نے اپنی گرانقدر تصنیف "ترجمان السنۃ" جلد سوم میں اس پر نہایت نافع اور مفصل کلام کیا ہے جو قابل مطالعہ ہے۔ جزاھم اللہ تعالیٰ۔

کے ہمراہ رہے اور کبھی کوئی کلمہ اور کبھی کوئی بات آپ کو بتلاتے رہے اس وقت تک قرآن مجید نہیں اترا تھا' تین سال گذرنے پر آپ کی نبوت کا تعلق حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ قائم کر دیا گیا تھا اور بیس سال تک ان کے توسط سے قرآن مجید کا نزول ہوتا رہا دس سال مکہ معظمہ میں اور دس سال مدینہ منورہ میں اس کے بعد ۶۳ سال کی عمر میں آپ کی وفات ہوئی۔ صلی اللہ علیہ وسلم (رواہ احمد)

نبی کے دل میں فرشتے کا القاء بھی وحی ہے

جس طرح حق تعالیٰ کی طرف سے نبی کے قلب پر کوئی بات القا ہوتی ہے اور اس کو وحی الہامی کہتے ہیں:...... اسی الہام کے تحت وہ صورت بھی ہے کہ فرشتہ نظر نہ آئے اور نبی کے قلب پر کسی بات کا القاء کرے چنانچہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اے لوگو! جو بات بھی تمہیں جنت سے قریب کرنے والی اور دوزخ سے دور کرنے والی تھی وہ سب تمہیں بتا چکا ہوں اور جتنی باتیں دوزخ سے قریب اور جنت سے دور کرنے والی تھیں ان سے بھی تمہیں روک چکا ہوں اور حضرت جبرائیل علیہ السلام نے میرے قلب میں یہ بات بھی القاء فرمائی ہے کہ کسی جان کو اس وقت تک موت نہ آئے گی جب تک وہ اپنے مقدر کا رزق دنیا میں پورا نہ کرلے۔ دیکھو خدا سے ڈرتے رہو اور طلب رزق میں بھلائی کا راستہ اختیار کرو ایسا نہ ہو کہ رزق پہنچنے میں دیر ہو تو خدا کی نافرمانی کے راستوں سے رزق حاصل کرنے لگو' کیونکہ خدا تعالیٰ کے قبضہ واختیار میں جو کچھ ہے اس کو صرف اس کی اطاعت وفرمانبرداری ہی کے راستوں سے حاصل کرنا موزوں ہو سکتا ہے (رواہ البیہقی)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول وحی کا ایک منظر

صفوان بن یعلی کا بیان ہے کہ ان کے والد حضرت یعلی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا نزول ہو تو مجھے بھی اس مبارک منظر کی زیارت کرا دیجئے گا' اس کے بعد ایسا اتفاق ہوا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جعرانہ میں صحابہ کے ساتھ تشریف رکھتے تھے کہ ایک شخص نے آکر سوال کیا کہ ایک شخص کے جسم پر خوب خوشبو لگی ہو۔ اور وہ احرام باندھ لے تو اس کے بعد کیا کرے؟ آپ کچھ خاموش ہوئے اور وحی کا نزول شروع ہو گیا' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کے وجود مبارک پر ایک کپڑا ڈھانک دیا اور یعلی کو قریب بلایا' انہوں نے اپنا سر اندر داخل کیا تو دیکھا کہ حضور کا چہرۂ مبارک سرخ ہو رہا ہے اور وحی کے شدید آثار سے آپ کا دم گھٹا جا رہا ہے' اس کے بعد جب وہ کیفیت جاتی رہی تو آپ نے سائل کو بلا کر بتلایا کہ خوشبو کو تین بار دھو ڈالے اور جبہ اتار دے پھر جس طرح حج ہوتا ہے کرے۔ (بخاری)

مسلم شریف کی حدیث عبادہ میں یہ بھی ہے کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا نزول ہوتا تو اس کی شدت سے آپ کا چہرۂ مبارک متغیر ہو جاتا اور آپ اپنا سر مبارک جھکا لیتے تھے' جس کے ساتھ حضرات صحابہ بھی اپنے سروں کو جھکا لیتے تھے۔

وحی کے انتظار میں آسمان کی طرف نظر اٹھانا

حضرت عبداللہ بن سلام سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب صحابۂ کرام کی مجلس میں بیٹھے ہوئے باتیں کرتے تھے تو اکثر آسمان کی طرف نظر اٹھا اٹھا کر دیکھا کرتے تھے (ابوداؤد)

یہ نظریں اٹھانا وحی کے انتظار میں ہوتا تھا جیسا کہ تحویل قبلہ کے موقع پر بھی آپ کا آسمان کی طرف نظریں اٹھانا قرآن مجید میں مذکور ہے۔

شدۃ وحی کی کیفیت

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے رسول اکرم سے سوال کیا کہ جب آپ پر وحی اترتی ہے تو کیا محسوس کرتے ہیں؟ فرمایا پہلے میں گھنٹیوں کی سی آواز سنتا ہوں' پھر اس وقت مجھ پر مکمل سکوت طاری ہو جاتا ہے اور جب کبھی وحی آتی ہے تو مجھے ایسا احساس ہوتا ہے کہ میری جان ابھی نکل جائے گی (رواہ احمد)

وحی الٰہی کا ثقل عظمت

بخاری شریف میں حضرت زید بن ثابتؓ کی روایت ہے کہ جس وقت کلمہ غیر اولی الضرر نازل ہوا تو میری ران حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ران سے ملی ہوئی تھی، مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میری ران ٹوٹ کر چور چور ہو جائے گی، جب صرف ایک کلمہ کی وحی کا وزن اس قدر قریب بیٹھنے والے صحابی نے محسوس کیا تو خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا وزن کتنا معلوم ہوا ہوگا اور اسی سے آپ کے غیر معمولی امتیاز و عظمت کا بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ پورے قرآن مجید کے ہزاراں ہزار کلمات کی وحی عظیم کا بار آپ نے برداشت کیا اور ہزار ہا مرتبہ حق تعالیٰ کی ہم کلامی سے مشرف ہوئے۔

حضرت ابو ہریرہؓ بہ روایت مسلم شریف فرماتے ہیں کہ جس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی اترتی تھی تو جب تک وہ تمام نہ ہو لیتی ہم میں سے کسی کی طاقت نہ تھی کہ آپ کی طرف نظر اٹھا کر دیکھ سکے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی اترتی تو اگر آپ اونٹنی پر سوار ہوتے تو وحی کے وزن وعظمت کے سبب وہ بھی اپنی گردن نیچے ڈال دیتی تھی اور جب تک وحی ختم نہ ہو جاتی اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکتی تھی۔ پھر حضرت عائشہؓ نے آیت ''انا سنلقی علیک قولاً ثقیلاً'' تلاوت فرمائی (رواہ احمد)

حضرت ابواروی دوسی رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ جب آپ اپنی اونٹنی پر سوار ہوتے اور وحی آجاتی تو میں نے دیکھا ہے کہ وحی کی عظمت و وزن کے سبب وہ اونٹنی آواز کرتی اور اپنے اگلے پیر اس طرح الٹتی بدلتی کہ مجھے یہ گمان ہوتا کہ اس کے بازو ٹوٹے جاتے ہیں، کبھی بیٹھ جاتی اور کبھی اپنے پیروں پر پوراز ور دے کر کھڑی ہوتی اور سنبھلتی تا آنکہ وحی ختم ہو جاتی، اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شان تھی کہ آپ کی پیشانی مبارک سے پسینے کے قطرات موتیوں کی طرح ٹپ ٹپ گرتے ہوتے تھے (خصائص کبریٰ)

یہاں ہم نے وحی الٰہی کی عظمت کا تعارف کرانے کے لیے کسی قدر تفصیل سے کام لیا تا کہ علوم نبوت کی عظمت وسیادت کا سکہ ناظرین انوار الباری کے دلوں میں قائم ہو جائے اور وہ وحی خداوندی (قرآن وحدیث) کے انوار و برکات، فوائد و منافع سے اپنے دامنوں کو مالا مال کرنے کی طرف پوری توجہ صرف کریں۔ وفقھم اللہ وایانا لما یحب و یرضی۔ آمین۔

سب سے بڑا معجزہ قرآن مجید اور علمی ترقیات کا دور

حضور اکرم سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے بڑا معجزہ ''علمی'' یعنی قرآن مجید عطا ہوا ہے جس کی برکت سے ساری دنیا کے لیے علمی ترقیات کے دروازے کھل گئے اور آپ کی امت نے مادی و روحانی علوم و کمالات میں وہ ترقی کی پہلی امتوں میں اس کا ادنیٰ نمونہ بھی نہیں ملتا، گویا دنیا کی زندگی کے تمام ادوار میں سے صرف اس دور کو علمی ترقی کا دور کہنا درست ہو سکتا ہے واضح ہو کہ جس طرح آپ کی امت میں آپ کے متبعین مومنین ہیں کہ ان کو امت اجابت کہتے ہیں، اسی طرح تمام دنیا کے کفار و مشرکین بھی داخل ہیں کہ ان کو امت دعوت کہا جاتا ہے، ان لوگوں نے چونکہ آپ کا لایا ہوا دین اسلام قبول نہیں کیا، اس لیے صرف آپ کی دعوت عامہ کے تحت آپ کی امت کہلانے کے مستحق ہوئے، غرض دنیا کے لوگوں کی موجودہ تمام علمی ترقیات آپ کے علمی کمالات و علمی معجزے کے طفیل وصدقہ میں ہیں۔

نہایت افسوس ہے کہ آج بہ کثرت مسلمانوں میں بھی اس قدر جہالت ہے کہ وہ قرآن وحدیث اور کتب دینیہ کے صحیح علم واحترام سے بے شعور وغافل ہیں۔

قرآن مجید کا ادب واحترام

شاہان اسلام کے حالات میں ایک واقعہ نظر سے گذرا تھا کہ ایک بادشاہ سیر وشکار میں تنہا رہ کر کسی قریہ میں ایک دیہاتی مسلمان کا

مہمان ہوا، شب کو جس دالان میں وہ مقیم ہوا تو دیکھا کہ اس کے ایک طاق میں قرآن مجید رکھا ہوا ہے۔

یہ دیکھ کر اس کی عظمت وجلالت اس کے دل ودماغ پر چھا گئی اور ساری رات ایک گوشے میں بیٹھ کر جاگتے ہوئے صبح کر دی' لیٹا یا سویا صرف اس لئے نہیں کہ قرآن مجید کا ادب اسے مانع رہا' اور یہ بھی گوارہ نہ ہوا کہ اپنے آرام کی وجہ سے اس عظیم المرتبت وحی الٰہی کو کسی دوسرے کمرے میں منتقل کرادے یہ بھی یاد پڑتا ہے کہ اس بادشاہ کو مرنے کے بعد سلطان الاولیاء حضرت خواجہ نظام الدینؒ نے خواب میں دیکھا' پوچھا! خدا نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ بادشاہ نے جواب دیا کہ بخش دیا' کیونکہ اللہ تعالیٰ کو اس رات کا میرا جاگنا اور قرآن مجید کا اس قدر احترام کرنا پسند آ گیا تھا۔

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کے حالات میں لکھا ہے کہ جب آپ قرآن مجید کھول کر تلاوت کا ارادہ فرماتے تو اس کی عظمت کا تصور کر کے بے ہوش ہو جاتے تھے اور زبان پر یہ کلمہ جاری ہو جاتا تھا ''ھذا کلام و ہی ھذا کلام ربی'' (یہ کلام میرے رب کا ہے' حضور اکرم فخر موجودات صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ساری رات اس آیت کی بار بار تلاوت میں گزاری ان تعذ بھم فانھم عبادک ' وان تغفرلھم فانک انت العزیز الحکیم '' (بارالہا! ان گناہ گار بندوں کو آپ عذاب دینا چاہیں تو وہ آپ کے بندے ہیں اور اگر مغفرت فرمادیں تو بے شک آپ زبردست حکمت والے ہیں) حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے ایک رات اس آیت کو بار بار پڑھ کر صبح کر دی ''وامتازوا الیوم ایھا المجرمون'' (اے مجرمو! آج قیامت کے دن تم ہمارے فرمانبردار بندوں سے الگ ہو جاؤ) حضرت امام اعظم رضی اللہ عنہ کے حالات میں بھی کہیں دیکھا ہے کہ ایک رات اسی آیت مذکورہ کی تلاوت فرما کر روتے رہے اور صبح کر دی' خدا ہم سب کے قلوب میں اپنے کلام مقدس کی صحیح عظمت' محبت وتعلق پیدا فرمائے آمین شرح احیاء العلوم میں ہے کہ قیامت کے ہولناک دن میں جو لوگ عرش کے سایے میں ہوں گے ان میں وہ بھی ہوں گے جو مسلمانوں کے بچوں کو قرآن مجید کی تعلیم دیتے ہیں اور وہ بھی ہوں گے جو بچپن میں قرآن مجید پڑھنا سیکھتے ہیں اور بڑے ہو کر اس کی تلاوت کا اہتمام رکھتے ہیں۔ اللھم اجعلنا منھم۔

۳ - حدثنا یحییٰ[1] بن بکیر قال اخبرنا اللیث[2] عن عقیل عن ابن شھاب عن عروۃ بن الزبیر عن عائشۃ ام المومنین رضی اللہ عنھا انھا قالت اول ما بدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من الوحی الرؤیا الصالحۃ فی النوم فکان لا یری رؤیا الا جاءت مثل فلق الصبح ثم حبب الیہ الخلاء وکان یخلو بغار حراء فلیتحنث

---

[1] یحییٰ بن عبداللہ بن بکیر القرشی (مولی ابی زکریا) م ۲۳۱ھ امام نسائی وحافظ ابن معین نے آپ کو ضعیف قرار دیا۔ ابن عدی نے کہا کہ امام لیث بن سعد (تلمیذ حدیث امام اعظم (رحمۃ اللہ علیہ) کے پڑوس میں رہتے تھے اور ان سے روایت میں وہ سب سے زیادہ قوی ہیں اور ان کے پاس امام لیث سے وہ روایات ہیں جو کسی دوسرے کے پاس نہیں ہیں' امام بخاری' مسلم وابن ماجہ نے آپ سے روایت کی' امام بخاری نے اپنی تاریخ کبیر صفحہ ۲۸۵ میں آپ کو شامی لکھا' حالانکہ سب تذکرہ نویسوں نے بالاتفاق آپ کو مصری لکھا ہے اور امام بخاری کے سوا اور کسی نے بھی شامی نہیں لکھا امام بخاری نے صرف لیث سے سماع کا ذکر کیا اور کسی قسم کا کلام حافظ یحییٰ بن معین وغیرہ کا ذکر نہیں کیا یہاں کتاب خطاء البخاری ابن ابی حاتم میں اس غلطی کا ذکر نہیں ہے'

حافظ عینیؒ نے اس حدیث کے رجال پر بحث کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ امام بخاری نے یحییٰ بن بکیر میں باپ کی طرف نسبت ترک کر کے دادا کی طرف جو نسبت کی ہے یہ اصطلاح محدثین میں تدلیس کی ایک صورت ہے' جس طرح امام موصوف نے لیث بن سعد سے دوسری جگہ چند روایات اپنے استاد محمد بن یحییٰ ذہلی کے واسطے سے ذکر کی ہیں' مگر وہاں بھی ہر جگہ اپنے استاذ موصوف کے نام میں تدلیس کی صورت اختیار کی ہے۔

ہم مقدمۂ انوارالباری حصہ دوم بہ سلسلہ حالات امام بخاریؒ لکھ چکے ہیں کہ امام بخاریؒ کی طرف تدلیس کی نسبت ضرور ہوئی ہے مگر اس کو بسبب جلالت قدر امام موصوف وبوجہ حسن ظن تدلیس معیوب نہیں کہہ سکتے' واللہ اعلم۔

[2] امام موصوف کا مختصر تذکرہ مقدمہ انوارالباری صفحہ ۲۱۳/۱ میں ہو چکا ہے' حافظ عینیؒ نے اس موقع پر ابن خلکان کے حوالہ سے آپ کا مذہب حنفی لکھا ہے امام بخاری نے اپنی تاریخ کبیر میں آپ کی منقبت پر کچھ نہیں لکھا' حافظ نے تہذیب میں اگرچہ آپ کے اساتذۂ حدیث میں امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر نہیں کیا' تاہم چھ صفحات سے زیادہ میں تذکرہ لکھا اور مناقب کثیرہ ذکر کیے ہیں جو مستقل تذکرۂ حفاظ ومحدثین حنفیہ کی زینت ہونے چاہئیں۔

فیه وهو التعبد اللیآلی ذوات العدد قبل انا ینزع الی اهنه' ویتزودلذلک ثم یرجع الی خدیجة فیتزود لمثلها حتیٰ جاءہ الحق وهو فی غار حراء فجآئه الملک فقال اقرا قال قلت ما انا بقاری' قال فاخذنی فغطنی حتی بلغ منی الجهد ثم ارسلنی فقال اقرأ ' فقلت ما انا بقاری فا خذنی فغطنی الثانیة حتی بلغ منی الجهد ثم ارسلنی فقال اقراء فقلت ما انا بقاری فا خذنی فغطنی الثالثة ثم ارسلنی فقال اقراباسم ربک الذی خلق خلق الانسان من علق' اقرا وربک الا کرم ' فرجع بها رسول الله صلی الله علیه وسلم یرجف فواده' فدخل علیٰ خدیجة بنت خویلد ' فقال "زملونی زملونی" فزملوه حتیٰ ذهب عنه الروع' فقال لخدیجة و اخبرها الخبر۔"لقد خشیت علیٰ نفسی"فقالت خدیجة کلا والله مایخزیک الله ابدا' انک لتصل الرحم و تحمل الکل و تکسب المعدوم و تقری الضیف و تعین علی نوائب الحق' فانطلقت به خدیجة حتی اتت به ورقة بن نوفل بن اسد بن عبد العزیٰ ابن عم خدیجة و کان امرأ تنصر فی الجاهلیة وکان یکتب الکتاب بالعبرانی فیکتب من الانجیل بالعبرانیة ماشاء الله ان یکتب وکان شیخا کبیرا قد عمی' فقالت له ' خدیجة یا ابن عم! اسمع من ابن اخیک فقال له ورقة یا ابن اخی! ماذا تریٰ؟ فاخبره رسول الله صلی الله علیه وسلم خبر مارأیٰ فقال له ورقة" هذا الناموس الذی نزل الله علیٰ موسیٰ 'یا لیتنی فیها جذعاً' یا لیتنی اکون حیاً اذ یخرجک قومک " فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم او مخرجی هم ؟ قال نعم لم یات رجل قط بمثل ما جئت الا عودی وان یدرکنی یومک انصرک نصراً مؤ زراً" ثم لم ینشب ورقةان توفی و فتر الوحی' قال ابن شهاب واخبر نی ابو سلمة بن عبد الرحمٰن ان جابربن عبدالله الانصاری قال وهو یحدث عن فترة الوحی فقال فی حدیثه:۔ بینا انا امشی اذ سمعت صوتا من السمآء فرفعت بصری فاذا الملک الذی جاء فی بحرآء جالس علی کرسی بین السماء والا رض فرعبت منه فرجعت فقلت زملونی زملو نی فانزل الله تعالیٰ ۔

یایها المدثر قم فانذر وربک فکبر وثیا بک فطهر والرجز فاهجر فحمی الوحی و تتابع"۔تابعه'عبدالله بن یوسف و ابو صالح و تا بعه هلال بن رواد عن الزهری وقال یونس و معمر بوادره۔

ترجمہ:۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت فرماتی ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ابتداء میں اچھے خوابوں سے وحی کا سلسلہ شروع ہوا' آپ جو کچھ خواب میں دیکھتے تھے وہ اسی طرح سپیدۂ سحر کی طرح نمودار ہو جاتا تھا' پھر آپ کو خلوت گزینی محبوب ہو گئی' غار حرا میں خلوت اختیار فرماتے تھے' کئی کئی رات ودن مسلسل وہاں رہ کر عبادت گزاری کرتے' جب تک کہ گھر آنے کی رغبت نہ ہوتی' وہاں کے لیے آپ توشہ بھی ساتھ لے جاتے تھے' پھر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس واپس تشریف لاتے اور اسی طرح چندروز کا توشہ ساتھ لے جاتے تا آنکہ غار حرا میں حق (یعنی وحی الٰہی) کا ظہور ہو اور فرشتہ نے آکر کہا پڑھیے۔!حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے جواب دیا کہ" میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں" (کیونکر پڑھ سکتا ہوں؟!) اس پر فرشتے نے مجھے پکڑ کر اتنے زور سے بھینچا کہ میری طاقت جواب دے گئی' پھر مجھے چھوڑ کر کہا کہ پڑھیے!" میں نے کہا" میں تو پڑھنے والا نہیں" فرشتے نے مجھے دوبارہ بھی دبوچ کر حسب سابق خوب دبایا اور پھر چھوڑ کر کہا کہ "پڑھیے!" میں نے کہا" میں پڑھنے والا تو ہوں نہیں" (کس طرح پڑھوں؟) فرشتے نے تیسری بار مجھے پھر دبوچا دبایا اور کہا اقرأ باسم ربک الذی خلق' خلق الا نسان من علق' اقرأ وربک الا کرم (پڑھیے اپنے رب کے نام سے جس نے (ہر چیز کو) پیدا کیا' انسان کو خون کی پھٹکی سے پیدا فرمایا' پڑھیے! آپ کا پروردگار بڑے کرم والا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آیات مذکورہ (کی نعمت غیر مترقبہ) سے اپنے سینے کو معمور و منور فرما کر واپس گھر تشریف لائے اس وقت آپ کا دل (پہلی وحی الٰہی کے رعب وجلال سے) کانپ رہا تھا' حضرت خدیجہؓ سے ارشاد فرمایا کہ مجھے کمبل اوڑھا دو' مجھے کمبل اوڑھا دو! انہوں نے کمبل

اڑھا دیا' جب سکون کی کیفیت ہوئی تو آپ نے حضرت خدیجہؓ کو سارا حال سنایا اور یہ بھی فرمایا کہ مجھے اپنی جان کا خوف ہو گیا ہے' انہوں نے جواب میں فرمایا کہ ہرگز ایسا نہیں ہوگا' خدا کی قسم! وہ آپ کو کبھی رسوا نہیں کرے گا۔ آپ تو صلہ رحمی فرماتے ہیں' ناتوانوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں' اپنی کمائی میں مفلسوں ناداروں کو شریک کرتے ہیں' مہمان نوازی فرماتے ہیں اور راہ حق میں مصیبت زدہ لوگوں کی امداد کرتے ہیں' پھر حضرت خدیجہؓ آپ کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں جو ان کے چچازاد بھائی تھے۔ وہ زمانہ جاہلیت میں نصرانی ہو چکے تھے' اور عبرانی زبان کے کاتب تھے' چنانچہ انجیل کو بھی حسب توفیق خداوندی عبرانی زبان میں لکھا کرتے تھے' بہت عمر رسیدہ تھے بینائی بھی جاتی رہی تھی۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے ان سے کہا۔ بھائی اپنے بھتیجے کا حال تو سنیئے! ورقہ نے پوچھا۔ بھتیجے! تم کیا دیکھتے ہو؟ آپ نے جو دیکھا تھا بیان فرما دیا' ورقہ آپ کے حالات سن کر (بے ساختہ) بول اٹھے کہ ''یہ تو وہی ناموس ہے جس کو حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے پاس بھیجا تھا۔ کاش! میں تمہارے عہد نبوت میں جوان ہوتا' کاش میں اس وقت تک زندہ ہی رہتا' جب آپ کی قوم آپ کو نکالے گی''۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''کیا وہ لوگ مجھے نکال دیں گے؟'' ورقہ نے کہا ''ہاں! جو شخص بھی اس طرح کی چیز لے کر آیا جیسی آپ لائے ہیں' لوگوں نے اس سے دشمنی کی ہے' اگر مجھے آپ کی نبوت کا زمانہ مل گیا تو میں آپ کی پوری قوت سے مدد کروں گا''۔

پھر کچھ ہی عرصہ کے بعد ورقہ کا انتقال ہو گیا' اور وحی کا سلسلہ بھی کچھ مدت کے لیے بند ہو گیا (راوی حدیث مذکور) ابن شہاب کا قول ہے کہ ابو سلمہ بن عبد الرحمٰن نے جابر بن عبد اللہ انصاری سے روایت بیان کی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی کے موقوف ہونے کا حال یوں بیان فرمایا تھا کہ ''میں ایک بار کہیں جا رہا تھا' اچانک میں نے آسمان سے ایک آواز سنی' نظر اٹھا کر دیکھا تو وہی فرشتہ جو غار حرا میں میرے پاس آیا زمین و آسمان کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہے' میں اس منظر سے پھر دہشت زدہ ہو گیا' واپس ہو کر گھر والوں سے کہا کہ مجھے کپڑا اوڑھا دو' مجھے کپڑا اوڑھا دو' اسی وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیتیں نازل فرمائیں۔

''**یایھا المدثر قم فانذر و ربک فکبر و ثیابک فطھر والرجز فاھجر**'' (''اے لحاف میں لپٹنے والے! اٹھ کھڑا ہو اور لوگوں کو (عذاب الٰہی سے) ڈرا' اور اپنے رب کی بڑائی بیان کر' اور اپنے کپڑے پاک رکھ اور گندگی سے دور رہ[1]'')

یعنی وحی الٰہی کے بوجھ اور فرشتہ کی ہیبت سے آپ کو اس قدر خوفزدہ اور پریشان نہ ہونا چاہئے' آپ کا منصب نبوت تو بہت اعلیٰ و ارفع

---

[1] عام مفسرین نے اس سے مراد یہ لیا کہ بتوں کی عبادت سے دور رہو اس صورت میں اس آیت کا تعلق نماز سے نہ ہوگا یا یہ مراد ہو کہ بتوں سے بے تعلقی کا معاملہ رکھو وقت نماز میں بھی اور دوسرے اوقات میں بھی' لیکن ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ کے نزدیک اس آیت میں طہارت جا نماز کی طرف اشارہ زیادہ راجح ہے' جیسا کہ اس سے پہلے جملے میں طہارت ثیاب کا حکم ہے' پس دونوں جملوں کا تعلق نماز سے رہے گا' پھر اس امر پر تو سب کا اتفاق ہے کہ نماز ابتداء زمانۂ نبوت سے تھی' چنانچہ کتب سیر میں وارد ہے کہ جب اقرأ باسم ربک کا نزول ہوا تو اسی وقت جبرئیل علیہ السلام۔ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو وضو و نماز کا طریقہ بھی سکھلایا تھا' پھر اس امر میں اختلاف ہے کہ صبح و شام کی دو نمازیں جو ابتداء عہد نبوت سے پڑھی گئیں وہ فرض تھیں یا نفل؟ ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ کے نزدیک ترجیح اس کو تھی کہ نماز کی فرضیت تو ابتداء عہد نبوت ہی سے تھی مگر اس کی صفات و کیفیات بدلتی رہتی تھیں' تا آنکہ شب معراج میں وہ پانچ ہو گئیں اور شب معراج میں پانچ نمازیں فرض ہونے کا مطلب یہ ہے کہ مجموعی عدد مع سابق کے پانچ قرار پایا' لہٰذا آیت **فسبح بحمد ربک قبل طلوع الشمس و قبل الغروب**'' میں کسی تاویل کی بھی ضرورت نہیں' کیونکہ اس میں صرف دو نمازیں ذکر ہوئی ہیں (نماز فجر و عصر) جو پہلے سے فرض تھیں' اس کے بعد ان پر اضافہ ہوا ہے اور اسی لیے بہ طریق ادا فرض وہ پانچ کی فرضیت سے پہلے بھی پڑھی گئیں اور بعد کو بھی' اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی ہے' بخاری میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے (طائف سے واپسی میں) فجر کی نماز بطن نخلہ میں پڑھی' جنوں نے آپ کے پیچھے اقتداء کی' آپ نے سورۂ جن پڑھی اور اس میں بلند آواز سے قرأت فرمائی اور یہی طریقہ نماز صبح کا بعد معراج بھی رہا' اس موقع پر ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ امر بھی بطور نکتہ و لطیفہ ارشاد فرمایا کہ علامہ حلبی نے اپنی سیرت میں ایک جملہ بہت معنی خیز لکھا ہے اور ممکن ہے اس سے ان کا ارادہ حنفیہ کے مسلک کی تائید بھی ہو کہ سب سے پہلے سورۂ اقراء نازل ہوئی اور سورۂ فاتحہ کا نزول بعد کو ہوا ہے تو جب تک اس کا نزول نہیں ہوا تھا اس زمانے کی نمازیں کس طرح درست ہوئیں؟ جب کہ فاتحہ رکن صلوٰۃ ہے کہ بغیر اس کے نماز درست ہی نہیں ہو سکتی' قائلین رکنیت فاتحہ جواب دیں؟

ہے' سب راحت وسکون کو خیر باد کہہ کر خدا کے نافرمان بندوں کو اس کے غصے وعذاب' اور کفر ومعصیت کے بڑے انجام سے ڈرایئے! یہاں پروردگار کی بڑائی بیان کرنے کا حکم بھی اسی لیے دیا گیا کہ اس سے خدا کا خوف دل میں گھر کرتا ہے اور اس کی تعظیم وتقدیس ہی وہ فریضہ ہے' جو تمام اخلاق واعمال کی ادائیگی پر مقدم ہے' چنانچہ اس سورت کے نازل ہونے کے بعد آپ نے دعوت الی اللہ کا فرض پوری اولوالعزمی سے انجام دیا' پھر نماز وغیرہ کا حکم بھی آ گیا' جس کے لیے بدن کپڑوں اور جائے نماز وغیرہ کو گندگی سے پاک رکھنے کے احکام نازل ہوئے۔

اس کے بعد وحی تیزی کے ساتھ پے در پے آنے لگی' اس حدیث کو یحیٰی بن بکیر کے علاوہ لیث بن سعد سے عبداللہ بن یوسف اور ابوصالح نے بھی روایت کیا ہے' جس کو متابعت تامہ کہتے ہیں اور عقیل کے علاوہ زہری سے ہلال بن رداد نے بھی روایت کیا ہے' جس کو متابعت ناقصہ کہتے ہیں' یونس ومعمر نے فوادہ کی جگہ بوادرہ ذکر کیا ہے۔

علامہ عینی نے شرح بخاری شریف میں اس موقع پر رجال سند' اصول حدیث اور معانی حدیث مذکور پر بڑی اہم علمی ابحاث لکھی ہیں' جو اہل علم خصوصاً طلبۂ حدیث کے لیے نہایت کارآمد ہیں' علامہ ابن ابی جمرہ نے بہجۃ النفوس میں اسی ایک حدیث سے نہایت اہم ونافع ۱۷ فوائد لکھے ہیں۔ طوالت کے خوف سے یہاں صرف چند چیزیں لکھی جاتی ہیں:۔

شرح حدیث

اچھے اور سچے خواب نبوت کا ایک جزو ہیں' اسی لیے انبیاء علیہم السلام کو وحی الٰہی کے ساتھ مشرف کرنے سے قبل سچے خواب دکھائے جاتے ہیں' سرور انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت سے قبل چھ ماہ تک ایسے خواب دکھلائے گئے اسی طویل مدت میں آپ کو منامات صادقہ کے ذریعہ علوم وحقائق نبوت اور عالم بالا سے پوری مناسبت کرا دی گئی' جو بات آپ خواب میں دیکھتے' جلد ہی اس کا ظہور بے کم وکاست ہو جاتا تھا گویا عالم مثال سے آپ کا رابطہ قائم کرا دیا گیا' جو عالم غیب سے رابطہ کا مقدمہ ہے کیونکہ جتنی چیزیں موجود ہوتی ہیں۔

سب سے پہلے ان کا وجود عالم غیب میں ہوتا ہے پھر عالم مثال میں منتقل ہوتی ہیں اس کے بعد عالم شہادت یعنی دنیا میں آتی ہیں' گویا عالم شہادت میں ظاہر ہونے والی چیزوں کا مشاہدہ' قبل ظہور ہی عالم مثال میں کر لیتے تھے۔

عالم مثال

عالم مثال کی چیزوں میں مادہ نہیں ہوتا بلکہ صرف ان کی صورتیں مع طول وعرض کے ہوتی ہیں' جیسے آئینہ میں ایک چیز کی صورت کا مشاہدہ لا مادہ مگر طول وعرض کے ساتھ ہوتا ہے' عالم مثال کو اسی پر قیاس کر لیجئے! بعض حضرات نے جو یہ سمجھا ہے کہ ایک صورت سے دوسری میں تبدیل ہو جانا عالم مثال سے متعلق ہے اور قرآنی آیت فتمثل لھا بشرا سویا کو استشہاد میں پیش کیا تو یہ خیال غلط ہے ایسی صورتوں کا تعلق عالم شہادت ہی سے ہے' یہ مسئلہ تجسد ارواح اور تروح اجساد کا ہے اور اس میں حضرت شاہ صاحب کی تحقیق ہم پھر کسی موقع سے بیان کریں گے' انشاء اللہ تعالیٰ۔

عالم خواب

خواب میں چونکہ ہم مادی علائق سے ایک حد تک منقطع ہو جاتے ہیں' اس لیے ایسی چیزوں کا مشاہدہ کر سکتے ہیں' حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ۶ ماہ تک اس طرح روحانی تربیت فرما کر حق تعالیٰ نے بیداری میں بھی خلوت گزینی آپ کے لیے محبوب بنا دی تا کہ ظاہری آنکھوں سے بھی غیبی مشاہدات کا معائنہ میسر ہو۔

انتخاب حراء

مکہ معظمہ سے تقریباً تین میل کے فاصلہ پر غار حرا میں آپ کی خلوت گزینی غالباً اس لیے بھی زیادہ موزوں تر تھی کہ وہاں انبیاء سابقین

اور آپ کے جدامجد عبدالمطلب نے بھی خلوت اختیار فرمائی تھی' دوسرے اس لیے بھی کہ اس غار کا ایک حصہ بیت اللہ کی طرف جھکا ہوا ہے' جس سے بیت اللہ پر نظر پڑتی ہے جو خود بھی ایک عبادت ہے' وہاں آپ نے کتنی خلوت گزینی فرمائی' بعض روایات ۴۰ دن کی بھی آتی ہیں مگر وہ زیادہ قوی نہیں ہیں' اس لیے ان سے مروجہ چلہ کشی پر استدلال بھی قوی نہیں اگر چہ اس کی افادیت ظاہر ہے اور اولیاء اللہ کے طریقے پر کسی عبادت کے ادا کرنے میں برکت بھی ہے بشرطیکہ اس کو سنیت کا درجہ نہ دیا جائے۔

دوسرے ایک فرق یہ بھی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم چند چند روز کے بعد دولت کدہ پر تشریف لاتے رہتے تھے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ضروری سامان و توشہ لے کر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ کے پاس پہنچ جاتی تھیں' مشکوٰۃ شریف باب المناقب میں ایک حدیث ہے کہ ایک مرتبہ حضرت جبرائیل علیہ السلام حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس غار حرا میں تشریف لائے (یہ غالباً عہد نبوت کا واقعہ ہے) اور فرمایا کہ خدیجہ آرہی ہیں ان کو رب العالمین کا سلام کہنا اور جنت میں موتیوں کے گھر کی بشارت سنا دینا۔

عطاء نبوت و نزول وحی

سچے خوابوں کے بعد غار حراء کی خلوت گزینی کا سلسلہ جاری تھا کہ ایک نہایت عظیم و مبارک دن وہ بھی آپہنچا کہ آپ حق تعالیٰ کی طرف سے خلعت رسالت سے سرفراز ہوئے' خدا کا فرشتہ پہلی وحی لے کر پہنچ گیا' جس سے دنیا کے اس آخری دور کے زریں لمحات کی ابتداء ہوگئی'

اب یہاں انبیاء سابقین اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی میں فرق پر بھی نظر رکھیے' پہلے جتنی وحی آتی رہی' وہ سب وحی غیر متلو کے درجہ کی تھی' جیسے ہمارے یہاں کی احادیث صحیحہ' جن کے معانی و مطالب تو وحی خداوندی ہیں' مگر الفاظ و کلمات اس طرح نہیں اور یہی شان کتب سماویہ انبیاء سابقین کی بھی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جتنی وحی نازل ہوئی' اس کے دو حصے ہوگئے۔ ایک وحی متلو' (جو قرآن مجید کی صورت میں ہے کہ اس کے کلمات و معانی سب خدا کی طرف سے بطریق محفوظ ہم تک پہنچے ہیں' دوسرے وحی غیر متلو (جو احادیث رسول کی صورت میں ہے کہ اس کے معنی خدا کی طرف سے اور کلمات رسول خدا کے ہیں۔ اسی لیے قرآن مجید کی روایت بالمعنی درست نہیں بخلاف حدیث کے کہ اس کی روایت بالمعنی بھی جائز ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی تربیت حق تعالیٰ کی خصوصی شان ربوبیت کے تحت ہوئی ہے کیونکہ آپ کو وحی متلو کے سب سے زیادہ عظیم المرتبت درجہ وحی سے نوازنا تھا' جو آپ کے اخص خصوص درجہ نبی الانبیاء اور مرتبہ خاتم النبیین کے شایان شان تھی' مگر اس وحی عظیم کے لیے کتنی بڑی قوت برداشت کی ضرورت تھی' اس کا اندازہ حدیث کے مذکورہ بالا جملوں سے بخوبی ہوسکتا ہے' اس لیے حیرت استعجاب اس امر پر بالکل نہ ہونا چاہیے کہ آپ ایسے رسول اعظم کو ڈر' خوف' دہشت و گھبراہٹ کی صورت کیوں پیش آئی' بلکہ حیرت اور عظیم حیرت اس پر ہونی چاہیے کہ اس دنیا کے اندر رہ کر اور باوجود تمام بشری تقاضوں اور کمزوریوں کے بھی' کیونکر ایک بشر نے اس وحی اعظم کے نزول اجلال کا بوجھ برداشت کرلیا' جس کو بتصریح قرآن مجید ہی اگر کسی پہاڑ پر اتار دیا جاتا تو وہ خوف و خشیت خداوندی کے باعث ٹوٹ پھوٹ کر ریزہ ریزہ ہوجاتا' یہی وجہ ہے کہ پہلی وحی کے بعد تین سال کی طویل مدت فترت وحی کی رہی کہ اس میں نزول وحی کا سلسلہ قطعاً بند رہا' اتنی بڑی عظیم نعمت خداوندی کا نزول ہوکر دفعۃً رک جانا اور وہ بھی اتنے طویل عرصہ تک' یہ آپ پر جتنا شاق گزرا' احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے برابر کبھی کوئی دوسرا صدمہ آپ کے قلب منور نے برداشت نہیں کیا' اور اتنے عظیم صدمہ کو تین سال تک صبر و شکر کے ساتھ برداشت کرنا' آپ کے نبی الانبیائی اولوالعزمی کی بہت بڑی خصوصیت قرار پائی ہے' درحقیقت خلعت رسالت عطا ہوجانے کے بعد کی سہ سالہ روحانی تربیت نے آپ کی روحانی ترقیات کو اوج کمال پر پہنچا دیا تھا' اسی لیے اس مدت کے گذرنے پر آپ پر نزول وحی کا سلسلہ بڑی تیزی سے جاری ہوگیا' کہ باقی بیس سال کی قلیل مدت میں تقریباً ۲۴ ہزار بار آپ نزول وحی الٰہی سے شرف یاب ہوئے۔

اس موقع پر جو بعض حضرات نے آپ کی خوف دہشت وغیرہ کو عام ضعف انسانی وبشری کے سبب بتلایا' اس کا اظہار بطور سیاست جائز سمجھنا' اس کو ہم آپ کے عظیم مرتبۂ رسالت کے شایان نہیں دیکھتے۔ واللہ اعلم

جن لوگوں نے اس حالت کو تردد فی النبوت سمجھا' وہ تو انبیاء علیہم السلام کے ایمان ویقین کے مدارج عالیہ اور علوم وکمالات نبوت سے بالکل ہی ناواقف ہیں اللھم ارنا الحق حقا و الباطل باطلا

دبانے کا فائدہ

صاحب ''بہجۃ النفوس'' نے لکھا ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کا مقصد آپ کو اپنے سینہ سے ملا کر دبانے سے یہ تھا کہ آپ کے اندر ایک زبردست قوت نوریہ پیدا ہو جائے، جس سے آپ وحی الٰہی کا تحمل فرما سکیں اور اس قسم کے تصرفات اولیاء اللہ کے یہاں بھی پائے گئے ہیں، ایک بزرگ ولی اللہ کا واقعہ نقل ہوا ہے کہ ان کے پاس چند علماء وقت نے آکر اعتراض کئے ان بزرگوں نے خود جواب دینا پسند نہ کیا اور ایک عامی جاہل چرواہے کو مجلس میں سے بلا کر اپنے سینہ سے ملایا اور فرمایا کہ تم ان کے اعتراضات کا جواب دو۔ اس نے نہایت اعلیٰ جوابات دیے، پھر ان لوگوں نے مزید اعتراضات کئے تو ان کے بھی جوابات دے کر ان سب اہل علم وفقہا کو ساکت کر دیا۔

پھر ان بزرگ نے اس شخص کو بلا کر دوبارہ سینہ سے ملایا تو پھر ویسا ہی جاہل بن گیا، جیسا تھا، اس پر اس نے عرض کیا کہ جناب والا میں نے سنا ہے خاصان خدا جب کسی کو کچھ عطا کر دیتے ہیں تو اس کو واپس نہیں لیتے، بزرگ نے فرمایا کہ یہ درست ہے جو تم کہتے ہو مگر تمہارا حصہ اس علم میں نہیں ہے، پھر اس کو ایک دوسری نعمت کی بشارت دی جو اس کو حاصل ہوئی۔

صاحب بہجہ نے اس قصہ کو نقل کر کے لکھا کہ جب ایک بشر کے لیے بشر کی ملامت سے یہ اثر ہو سکتا ہے تو روح القدس (جبرئیل علیہ السلام) کے جسد کی ملامست سے جسد اطہر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں کیا کچھ اثرات نہ پیدا ہوئے ہوں گے، اسی قسم کا ایک واقعہ حضرت شیخ المشائخ خواجہ باقی باللہ (شیخ ومرشد حضرت مجدد صاحب سرہندیؒ) کا بھی منقول ہے کہ ایک دفعہ آپ کے یہاں چند مہمان آگئے اور اس وقت ان کی ضیافت کے لیے آپ کے یہاں کچھ موجود نہ تھا۔ آپ کچھ متردد ہوئے کہ پڑوسی نان بائی کو خبر لگ گئی جو فوراً ہی ایک سینی میں کھانا لگا کر حضرت خواجہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہو گیا آپ بہت خوش ہوئے اور اس سے فرمایا کہ جو چاہو مانگ سکتے ہو، نان بائی نے کہا میری خواہش یہ ہے کہ آپ مجھے اپنا جیسا کر دیجئے! خواجہ صاحب نے فرمایا تم اس کو برداشت نہ کر سکو گے، کوئی اور چیز طلب کرو، مگر وہ اپنے مطالبے پر مصر رہا، اس پر خواجہ صاحب اس کو اپنے حجرے میں لے گئے، اور اس پر اتحادی توجہ ڈالی، کچھ دیر کے بعد نکلے تو دونوں کی صورت بالکل ایک سی تھی، صرف اتنا فرق تھا کہ خواجہ صاحب پر اطمینان وبشاشت کی کیفیت تھی، اور نان بائی پر انتہائی اضطراب گھبراہٹ وپریشانی کا عالم طاری تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اس کیفیت یا حضرت خواجہ صاحب کی نسبت قویہ کو برداشت نہ کر سکا اور دو تین دن کے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔

یہاں سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ اگر توجہ اتحادی قبول کرنے والا جوہر قابل ہو تو اس کو نہ صرف یہ کہ کوئی نقصان نہیں پہنچتا بلکہ وہ کم سے کم وقت میں دوسرے کے کمالات اپنے اندر جذب کر لیتا ہے جیسا کہ حضرت مجدد صاحب سرہندی قدس سرہ ہی کے بارے میں منقول ہے کہ انہی حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہ، کی خدمت میں حضرت مجدد صاحبؒ پہنچے، اور بیعت ہوئے اور چند ہی روز میں آپ قطبیت، فردیت وغیرہ مدارج عالیہ تک ترقی فرمالی اور خود خواجہ صاحب نے آپ کو قرب ونہایت وصول الی اللہ کے مراتب علیہ کی تحصیل وتکمیل کی بشارت سنائی۔ اور فرمایا کہ شیخ احمد سرہندی ہمارے یہاں آئے، جو کثیر العلم قوی العمل ہیں، چند ہی روز میں ہم نے ان کے بہت سے عجائب وغرائب حالات مشاہدہ کئے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک آفتاب ہوگا، جس سے سارا جہاں روشن ہوگا۔ ایک روز یوں بھی فرمایا کہ شیخ احمد

سرہندی ایک ایسا سورج ہے جس کے سایہ میں ہم جیسے ہزاروں ستارے گم ہیں۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ توجہ قبول کرنے والا کبھی توجہ دینے والے سے بھی بڑھ جاتا ہے۔ جیسا کہ یہاں حضرت خواجہ صاحب نے خود فرمایا کہ حضرت مجدد صاحب کی مثال سورج کی سی ہے، اور ہم جیسے ہزاروں ستارے اس کے سایہ میں گم ہیں۔

اب اپنے اصل موضوع کی طرف آجائے اور اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ سرور کائنات، فخر موجودات افضل الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم و کملات کی نسبت بھی تمام انبیاء سابقین اور ملائکہ مقربین وغیرہ وغیرہ کے مقابلہ میں بالکل ایسی ہی ہے، جسے ایک سورج کی نسبت ستاروں سے ہوتی ہے اور ابتدائی حالات میں جبرائیل علیہ السلام کے آپ کو دبا کر روحانی توجہات کے القاء فرمانے سے یہ نہ سمجھا جائے کہ جبرائیل علیہ السلام آپ سے افضل ہیں یا آپ بہ نسبت ان کے علوم وکمالات میں کم درجہ رکھتے ہیں۔ دوسری مثال محض سمجھنے کے لئے ایسی ہے کہ جیسے ایک بادشاہ کے ارکان دولت و مقربین بارگاہ میں ہوتے ہیں، کچھ ایسے معتمد خاص ہوتے ہیں جو اس کے پیغامات دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔ لیکن اس بادشاہ کا ایک وزیر اعظم ہوتا ہے جو اس کا سب سے بڑا معتمد نائب وخلیفہ ہوتا ہے، وہ اگرچہ بادشاہ کی مجلس کا ہر وقت حاضر باش نہیں ہوتا بلکہ بعض اہم ضرورتوں کے باعث کافی دور دراز مسافت پر بھی رہتا ہے اور وہاں ایک طویل مدت مصالح ملکی کے انتظام وانصرام میں گذار دیتا ہے، لیکن جو اعتماد، تقرب اور درجہ بادشاہ کے یہاں اس کا ہوتا ہے، وہ نہ بادشاہ کے اپنے اہل خاندان میں کسی کا ہوتا ہے، نہ کسی بڑے سے بڑے مقرب درباری کا، نہ دوسرے وزراء و ارکان دولت کا۔ اس لئے کہ بادشاہ کے ملکی مصالح اور ان کے نشیب وفراز کو پہچاننے والا جس قدر وہ ہوتا ہے، دوسرا نہیں ہوسکتا۔

اسی لیے جب بادشاہ کو کوئی اخص خصوص مشورہ کرنا ہوگا یا کوئی خاص الخاص ہدایت دینی ہوگی تو صرف اسی سے الگ بلا کر مشورہ کرے گا' اور وہ بھی اس احتیاط سے کہ اس وقت کوئی دوسرا اس کا بڑے سے بڑا مقرب ومحبوب بھی وہاں آس پاس نہیں جاسکتا' یا اگر اس کا وزیر اعظم کہیں دور ہوگا تو بادشاہ کا خاص درباری مقرب ایلچی اس کا پیغام لے کر جائے گا اور بااحتیاط تمام وزیر اعظم کو پہنچا دے گا۔ پھر ظاہر ہے کہ اس پیغام کے پورے مقاصد اور اس کی باریکیوں کو جس قدر بادشاہ کا وزیر اعظم سمجھ سکے گا وہ درمیانی ایلچی بھی نہیں سمجھ سکتا' اس لئے وزیر اعظم پر اس پیغام کو سوچنے سمجھنے اس پر عمل درآمد کرنے کی ذمہ داریوں کا جس قدر عظیم بوجھ پڑے گا' درمیانی پیغامبر پر اس کا سوواں حصہ بھی نہ ہوگا۔ اس کے ساتھ یہ بھی گزارش ہے کہ بادشاہ کی حیثیت یا وزیر اعظم کی پوزیشن اپنے دور کے حالات سے نہ قیاس کیجئے' کیونکہ اول تو اس عوامی دور کے بادشاہوں کے وہ پہلے سے اختیارات و ذمہ داریاں نہیں ہیں' پھر وزیر اعظم اور دوسرے وزراء عوام کے رجحانات وغیرہ کے لحاظ سے بنتے ہیں' اسی لیے وہ عوام کے یا اکثریت کے رجحانات کا ساتھ دینے پر مجبور ہوتے ہیں اور ان کی تبدیلیاں بھی جلد جلد عمل میں آتی رہتی ہیں۔ مگر حق تعالیٰ کی شہنشاہیت کے اصول اس سے بالکل جدا ہیں' وہ خود عالم الغیب والسرائر ہے ایک ایک کے دلوں کے بھید سے واقف ہے اس سے کوئی چیز چھپ نہیں سکتی' اس کے بھی مقربین بارگاہ میں' دین و دنیا دونوں کے نظام عالم چلانے کے لیے وزراء و نائبین ہیں' جن میں سے سب سے بڑے نائب وخلیفہ ہونے کا طرۂ امتیاز انبیاء علیہم السلام کو حاصل ہوا۔ اس لیے ضروری تھا کہ علمی کمالات میں ان کا مرتبہ سب سے اونچا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی علمی و روحانی تربیت کو دنیا کے ظاہری وسائل سے الگ کر کے' اپنے فضل خاص کے تحت رکھا' سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے وہ علوم القاء فرمائے' جن کے باعث ان کی برتری وافضلیت تمام ملائکہ اور جن وانس پر مسلم ہوگئی' اور اس کے عملی اعتراف کے طور پر ان کو تعظیمی سجدہ کرایا گیا' پھر ان کے بعد بھی جس قدر انبیاء مبعوث ہوئے' ان سب کی بھی اسی طرح تربیت وتعلیم ہوتی رہی' اور یہ سب انبیاء علیہم السلام اپنے اپنے زمانہ اور علاقۂ رسالت کے لیے خدا کی طرف سے اس کے وزراء کی حیثیت رکھتے تھے۔

ان کے بعد تمام نبیوں کے سردار' سب کے علوم وکمالات کے جامع' سب کی شریعتوں کے محافظ' سبھوں کی شرائع سے زیادہ مکمل دین وشریعت کے حامل' فخر موجودات خاتم النبیین والمرسلین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کے آخری دور میں حق تعالیٰ کے وزیر اعظم کی حیثیت سے تشریف

لاتے جن کا سب سے بڑا معجزہ بھی علمی معجزہ قرآن مجید ہے جو قیامت تک کامل شریعت مکمل دستورالعمل اور نہ منسوخ ہونے والا قانون الٰہی ہے۔

آپ کو وہ علوم وکمالات اور روحانی مدارج حق تعالیٰ نے عطا فرمائے' جو کسی نبی مرسل یا ملک مقرب کو بھی عطا نہیں ہوئے' آپ کے علمی وروحانی فیض سے تھوڑے ہی عرصہ میں ہزاراں ہزار صحابہ کے قلوب جگمگا اٹھے اور ادنیٰ سے ادنیٰ صحابی بھی اس مرتبہ پر فائز ہو گئے کہ بڑے سے بڑا ولی کامل وہاں تک نہیں پہنچ سکتا' اور بعد وفات بھی آپ کے روحانی فیض سے تمام مومنین کی ارواح طیبہ برابر سیراب ہوتی رہیں اور قیامت تک آپ کا فیض اسی طرح باقی رہے گا' **اللهم انفعنا جميعا بنفحاته الطيبة و وفقنا لما تحب و ترضى بمنك و كرمك يا ارحم الراحمين۔**

صاحب بہجہ نے لکھا ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا "کلا و الله لا یحزیک الله" الخ فرمانا اس لیے تھا کہ دنیاوی تجربات سے یہ بات مشہور ومعلوم تھی کہ جس شخص کے اخلاق وخصائل اس قسم کے ہوتے ہیں وہ خدا کا محبوب بندہ ہوتا ہے اور اس کو کوئی گزند نہیں پہنچتا۔ نیز حدیث میں بھی آتا ہے کہ حسن سلوک کا کردار ذلت ونکبت کی رسوائیوں سے محفوظ کرتا ہے۔ یہاں پانچ خصائل کا ذکر ہوا ہے جو اصول مکارم اخلاق ہیں' دوسری روایت میں تصدق الکلام اور تودی الامانات بھی آیا ہے کہ آپ سچ بولتے ہیں اور امانات کی ادائیگی فرماتے ہیں اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ زمانہ کی عادت وتجربات کے مطابق بھی کوئی بات کہنا درست ہے' بشرطیکہ اس سے اوامر ونواہی شرعیہ میں کوئی خلل واقع نہ ہوتا ہو۔

اکتروان آخری فائدہ صاحب بہجۃ النفوس امام ابن ابی جمرہ نے اس پر لکھا کہ حمی الوحی سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا مقصد ہے آپ نے لکھا ہے کہ ابتداء وحی کے بیان میں قبل رسالت کے خوابوں کے مطابق ظہور واقعات کو طلوع سپیدۂ سحر سے تشبیہ دی گئی تھی لہٰذا جب نزول وحی کا وقت پہنچا تو وہ رسالت کا طلوع شمس تھا اور جس طرح طلوع کے بعد آفتاب کی روشنی وگرمی برابر بڑھتی رہتی ہے آفتاب رسالت نے بھی اپنے ترقی پذیر نور وحرارت سے سارے عالم امکان کو پوری طرح نور وحرارت سے فیضیاب کر دیا تھا۔

پھر اس تشبیہ سے ممکن تھا کہ کوئی سمجھے کہ جس طرح بعد نصف النہار آفتاب سماوی کی حرارت ونور میں کمی آنے لگتی ہے' آفتاب رسالت کے فیض میں بھی کمی ہو گی تو حمی الوحی کے ساتھ وتتابع کا لفظ زیادہ کیا' تاکہ بتلایا جاسکے کہ آفتاب رسالت کا فیضان ایسا نہیں ہے کیونکہ وہ برابر بڑھتا چڑھتا چلا گیا اور علوم نبوت کی گرمی وحرارت' روشنی وتابناکی میں کوئی زوال وانحطاط نہ آسکا صفحہ (۱/۲۵)

بحث ونظر: قرآن مجید میں جو ہر سورت کے شروع میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھی ہوئی ہے اس کے بارے میں آئمہ محدثین وفقہاء میں یہ بحث رہی ہے کہ وہ ہر سورت کا جزو بھی ہے یا نہیں؟ اس بارے میں ان کے تین مذاہب ہیں' امام مالک وامام اوزاعی وغیرہ فرماتے ہیں کہ وہ کسی سورت کا جزو نہیں ہے۔ نہ قرآن مجید کی آیت ہے بجز اس کے جو سورۂ نمل کے وسط میں نازل ہوئی ہے (بعض حنفیہ اور بعض اصحاب امام احمد کا بھی یہی مذہب ہے اور وہ لوگ خود امام احمد سے بھی ایک روایت اسی کی بیان کرتے ہیں) دوسرا بالکل اس کے مقابل امام شافعی کا قول ہے کہ وہ سورۂ فاتحہ اور دوسری ہر سورت کا جزو ہے' امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول یہ بھی ہے کہ وہ بجز سورۂ فاتحہ کے اور سورتوں کا جزو نہیں ہے' تیسرا مذہب اکثر فقہاء ومحدثین احناف' امام احمد ابن مبارک وغیرہ کا ہے کہ وہ قرآن کا جزو ہے جس طرح کہ ہر سورت کے شروع میں مکتوب ہے' مگر وہ کسی سورت کا جزو نہیں ہے۔ بقول حافظ زیلعیؒ کے یہ قول وسط (درمیانی) اور محققین اہل علم کا ہے کیونکہ تمام حدیثی دلائل اور آثار کی روشنی میں یہی فیصلہ بہتر ہے۔

اس کے بعد یہ مسئلہ سامنے آتا ہے کہ نماز میں سورت کے ابتداء میں بسم اللہ پڑھنا کیسا ہے' امام مالک کا مشہور مذہب یہ ہے۔ کہ آہستہ وجہر دونوں طرح سے اس کا پڑھنا نماز میں مکروہ ہے' امام شافعی وغیرہ فرماتے ہیں کہ جب وہ سورۂ فاتحہ کا جزو ہے' اس کی قرأت واجب ہے' حنفیہ اور اکثر محدثین کا قول یہ ہے کہ اس کی قرأت مستحب ہے۔

پھر قرأت کے قائلین میں سے امام شافعی اور ان کے بعض اصحاب فرماتے ہیں کہ جہراً قرأت مسنون ہے' امام ابوحنیفہ' جمہور اہل حدیث ورائے' فقہاء امصار' اور جماعت اصحاب امام شافعی کا مذہب یہ ہے کہ بسم اللہ جہراً پڑھنا مسنون نہیں ہے۔ اسحٰق بن راہویہ' ابن حزم وغیرہ کا قول یہ ہے کہ اختیار ہے کہ آہستہ پڑھ لے یا آواز سے۔ (نصب الرایہ و تحفۃ الاحوذی)

ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے درس کے وقت یہ بھی فرمایا تھا کہ شافعیہ پر اعتراض ہوا ہے کہ اگر بسم اللہ ہر سورت کا جزو ہوتی تو سورۂ اقراء کے شروع میں بھی نازل ہوتی' اس کا جواب انہوں نے یہ دیا کہ بسم اللہ کا مضمون اس سورت کے شروع میں ادا ہو گیا ہے دوسرے یہ کہ جب آیت بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نازل ہوئی تو اس کے بعد سورہ مذکورہ کا جزو بن گئی ہے' لیکن یہ جواب کمزور ہے کیونکہ بحث متعارف و معہود وصیغۂ بسم اللہ الخ میں ہے اس کے معنی و مطلب میں نہیں ہے۔

حافظ زیلعیؒ نے نصب الرایہ کے مطبوعہ چالیس صفحات میں اس بحث کو نہایت کافی و شافی تفصیل سے لکھا ہے' ہر مذہب کے دلائل ذکر کئے ہیں اور اعتراضات و جوابات بھی لکھ دیئے ہیں' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ احناف کا مسلک سب سے زیادہ قوی ہے' اسی لیے علامہ مبارک پوری نے باوجود اپنے تعصب کے اقرار کیا کہ میرے نزدیک نماز میں بسم اللہ کے جہر سے اخفاو اسرار زیادہ بہتر ہے۔ امام ترمذی نے ترک جہر بسم اللہ کا باب قائم کر کے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث روایت کی ہے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم' حضرت ابوبکرؓ حضرت عمر و عثمان سب کے ساتھ نمازیں پڑھیں میں نے کسی کو نہیں سنا کہ بسم اللہ پڑھتے ہوں' اس حدیث کے رواۃ میں جلیل القدر محدث شہیر امام شعبہ بھی ہیں اور مسلم کی روایت میں ہے کہ انہوں نے حضرت قتادہ سے پوچھا کہ آپ نے حضرت انسؓ سے اس کو سنا ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ ہاں! ہم نے ان سے سوال کر کے تحقیق کی تھی' امام اوزاعی محدث شام کی روایت میں ہے کہ حضرت قتادہ نے حضرت انس سے اس طرح روایت کی ہے کہ میں نے ان سب حضرات کے پیچھے نمازیں پڑھی ہیں وہ سب الحمد للہ رب العالمین سے قرأت شروع کرتے تھے' بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو نہ اول قرأت میں پڑھتے تھے نہ آخر میں بعض قائلین جہر نے کہا ہے کہ ممکن ہے ان سب حضرات نے جہراً پڑھی ہو مگر حضرت انس نے نہ سنا ہو' اس کے بارے میں حافظ ابن تیمیہؒ نے فرمایا کہ حدیث انس کو عدم سماع پر محمول کرنا تاویل نہیں بلکہ تحریف کے درجہ میں ہے (فتح الملہم صفحہ ۲/۳۳)

کیونکہ حضرت انسؓ دس سال حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہے پھر ہر سہ خلفاء مذکورین کے ساتھ ۲۵ سال گزارے اتنے عرصہ مدید میں روزانہ کی جہری نمازوں میں یہ سب حضرات جہراً بسم اللہ پڑھتے اور آپ کو خبر نہ ہوتی' یہ قطعاً محال اور دور از عقل بات ہے۔

حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری صفحہ ۲/۱۵۵ میں لکھا کہ حضرت انسؓ کی مختلف روایات جمع کرنے سے تو بظاہر نفی جہر ہی ثابت ہے مگر یہ امر بہت مستبعد ہے کہ حضرت انسؓ اتنی طویل مدت ان حضرات کے ساتھ گزار کر بھی جہراً بسم اللہ پڑھنے کو کسی ایک نماز میں بھی ان سے نہ سنتے' (یعنی سن کر بھول گئے ہوں گے' حضرت انسؓ نے ایک روایت میں خود اعتراف کیا کہ مجھے اس بارے میں یاد نہیں رہا' گویا ایسا ہوا ہو گا کہ زیادہ زمانہ گزرنے کی وجہ سے وہ اس کو بھول گئے ہوں گے پھر یاد پر زور ڈالنے سے جہر فاتحہ تو یاد آیا اور جہر بسم اللہ کا استحضار نہ ہو سکا۔ لہٰذا جس روایت سے جہر بسم اللہ کا ثبوت ہے وہ نفی جہر والی روایت پر مقدم ہوگی (خصوصاً اس لئے بھی کہ حضرت انسؓ والی نفی کی روایات میں بھی مذکورہ بالا استبعاد موجود ہے لہٰذا جہر والی روایت پر عمل متعین ہو گیا۔

یہاں حافظ نے اپنے مسلک شافعیہ کی تائید میں بالکل انوکھا استدلال کیا ہے اول تو حضرت انسؓ کے یاد نہ کرنے کی روایت مرویات صحاح سے کم درجہ کی ہے دوسرے غالب احتمال یہ ہے کہ حضرت انسؓ نے آخری عمر میں ذہول غالب ہونے کے زمانے میں ایسا فرمایا ہو گا کہ اب مجھے اچھی طرح یاد نہیں ہے اور آخر عمر میں اس طرح اور مسائل میں بھی انہوں نے فرما دیا ہے اور دوسرے حضرات سے بھی ایسا بہ کثرت منقول ہے کہ حدیث بیان کر کے بھول گئے آخر عمر میں حافظہ کمزور ہونے کی وجہ سے یاد نہ رہا' مگر حافظ نے اس کے خلاف نیا طرز استدلال نکالا کہ ایک شخص کچھ

مدت گزرنے کی وجہ سے ایک واقعہ کو بھول جائے اور پھر اس کے بعد کے زمانے میں وہ اس کو یاد کر لے اور اس طرح جزم ویقین کے ساتھ حضرت انسؓ کی طرح روایت بھی کرنے لگے اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت انسؓ سے سوال ان کے انکار قرأت جہری کے بعد قرأت سری کے بارے میں ہوا ہو جس پر انہوں نے فرمایا کہ تم مجھ سے ایسی بات پوچھتے ہو جو مجھے یاد نہیں۔ (چنانچہ علامہ ابن عبدالبر نے "الانصاف" صفحہ ۲۶ میں لکھا کہ میرے نزدیک جس نے حضرت انسؓ سے یاد کی بات کی وہ اس پر مقدم ہے جس نے بھول کے زمانہ میں ان سے سوال کیا (نصب الرایہ صفحہ ۱/۳۳۱)

واضح ہو کہ امام ترمذی نے ترک جہر بسم اللہ کا باب قائم کر کے حدیث یزید بن عبداللہ بن مغفلؓ روایت کی کہ میں نے نماز میں الحمد سے پہلے بسم اللہ پڑھی تو میرے والد نے فرمایا کہ بیٹا! یہ محدث وبدعت ہے اور صحابہ کرام کو سب سے زیادہ مبغوض اسلام میں نئی باتوں کا پیدا کرنا تھا پھر فرمایا کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر حضرت عمر اور حضرت عثمان کے ساتھ میں نمازیں پڑھی ہیں میں نے کسی کو نہیں سنا کہ بسم اللہ پڑھتے ہوں تم بھی مت پڑھو الحمد للہ رب العالمین سے پڑھو امام ترمذی نے لکھا کہ یہ حدیث حسن ہے اور اسی پر اکثر اہل علم اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکرؓ عمرؓ عثمانؓ وعلیؓ وغیرہم اور ان کے بعد تابعین کا عمل رہا اور اس کو سفیان ثوری ابن مبارک امام احمد واسحق نے اختیار کیا وہ کہتے ہیں کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھ لی جائے جہر سے نہ پڑھی جائے حافظ زیلعی نے لکھا ہے کہ احادیث جہر کی روایت نہ صحاح میں ہوئی نہ مسانید مشہورہ میں البتہ ان کی روایت حاکم اور دار قطنی نے کی ہے اور حاکم کا تساہل[1] سب جانتے ہیں کہ وہ احادیث ضعیفہ بلکہ موضوعات تک کی تصحیح کر دیتے ہیں۔ دار قطنی نے اپنی کتاب کو احادیث غریبہ شاذہ اور معللہ سے بھر دیا ہے اور کتنی ہی احادیث ایسی لائے ہیں جو کسی دوسری کتاب میں نہیں ملتیں۔

حافظ زیلعی نے یہ بھی لکھا ہے کہ بخاری باوجود اس کے کہ مذہب حنفی سے شدید تعصب رکھتے ہیں اور اس پر اعتراضات کرنے میں بہت پیش پیش ہیں ایک حدیث بھی جہر بسم اللہ کی نہیں لائے اور مسلم میں بھی ایسی کوئی حدیث نہیں ہے بلکہ دونوں حضرات نے حدیث انسؓ ہی کی روایت کی جو اخفاء بسم اللہ پر دلیل ہے اگر کہا جائے کہ ان دونوں حضرات نے یہ کب التزام کیا ہے کہ ہر صحیح حدیث کو ضرور ذکر کریں گے؟ ممکن ہے کہ اور احادیث صحیحہ کی طرح حدیث جہر بسم اللہ کو بھی ترک کیا ہو تو ایسی بات کوئی جاہل یا کٹ حجت جھگڑالو ہی کہہ سکتا ہے کیونکہ جہر بسم اللہ کا مسئلہ نہایت مشہور اہم و مشکل مسائل فقہ میں سے ہے جس پر بڑے بڑے مناظرے ہوتے ہیں اور تصانیف کا اہم موضوع بحث رہا ہے۔ اور امام بخاری کو حدیث وسنت کے راستہ سے امام ابوحنیفہ پر ہونے والے اعتراضات کی بڑی تلاش و جستجو رہی ہے وہ اپنی صحیح کے ابتداء ہی میں باب الصلوٰۃ من الایمان کا باب قائم کر کے احادیث روایت کی ہیں اور مقصد امام صاحب پر رد کرنا ہے کیونکہ امام صاحب نے فرمایا ہے اعمال جزو ایمان نہیں ہیں حالانکہ یہ مسئلہ بہت سے فقہاء کو بھی معلوم نہیں اور مسئلہ جہر کی شہرت عوام وجہلا تک میں بھی ہے۔ اسی طرح بخاری بہت سی جگہ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کذا وکذا روایت کر کے قال بعض الناس کذا وکذا لکھتے ہیں" جس سے اشارہ امام ابوحنیفہ کی طرف ہوتا ہے اور اس طرز سے امام صاحب پر طنز وتشنیع کر کے یہ دکھلاتے ہیں کہ امام صاحب حدیث کی مخالفت کرتے ہیں غرض ان کے پاس کوئی صحیح حدیث جہر بسم اللہ کی ہوتی تو کیوں نہ لاتے ایسا ناممکن تھا بلکہ محال اور میں خدائے برتر کے حلف اور پھر خدا کے حلف سے کہتا ہوں کہ اگر امام بخاری کو اپنی شرائط کے مطابق یا اس کے قریب درجہ کی ایک حدیث بھی مل جاتی تو اپنی صحیح کو ہرگز اس سے خالی نہ چھوڑتے اور کوئی حدیث صحیح ہوتی تو امام مسلم بھی ضرور لاتے پھر امام ابوداؤد امام ترمذی امام ابن ماجہ نے بھی تو کوئی حدیث جہر بسم اللہ کی روایت نہیں کی حالانکہ ان کی کتابوں میں احادیث سقیمہ اور اسانید ضعیفہ بھی موجود ہیں۔ البتہ نسائی ایک روایت حضرت ابوہریرہ کی لائے ہیں جس کا ضعف ہم بیان کر چکے ہیں۔ (نصب الرایہ صفحہ ۱/۳۵۵)

دار قطنی نے مصر جا کر بہت سی احادیث جہر بسم اللہ کی جمع کی تھیں لیکن جب ان کو حلف دے کر پوچھا گیا کہ ان میں کوئی صحیح مرفوع بھی ہے تو کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تو کسی کا ثبوت صحیح وقوی طریق سے نہیں ہے البتہ صحابہ سے کچھ صحیح ہیں کچھ ضعیف۔

---

[1] حاکم کے تساہلات پر نہایت گرانقدر محدثانہ کلام حافظ زیلعی نے صفحہ ۱/۳۴۶ میں کیا ہے۔ جو مشتغلین علم حدیث کے لیے بہت کارآمد ہے۔

حافظ ابن قیمؒ نے "ہدیٰ" میں لکھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کبھی جہر بسم اللہ بھی ثابت ہوا ہے (جو تعلیم وغیرہ کے لیے ہوگا) مگر اخفاء کا ثبوت زیادہ ہے کیونکہ اگر آپ ہمیشہ جہر فرماتے تو خلفاء راشدین اور جمہور صحابہ سے کیونکر مخفی رہتا۔ یہ بڑی محال بات ہے اور اس کو مجمل الفاظ یا کمزور احادیث سے ثابت کرنے کی ضرورت نہیں' کیونکہ جو احادیث جہر کے ثبوت میں صحیح ہو سکتی ہیں وہ صریح نہیں ہیں اور جو صریح ہیں وہ غیر صحیح ہیں۔ (فتح الملہم صفحہ ۲/۳۷)

حافظ ابن حجرؒ نے درایہ میں بھی اس مسئلہ پر کلام کیا ہے اور قائلین جہر کی طرف سے تین استدلال نقل کئے ہیں ایک یہ کہ جہر کی احادیث طرق کثیرہ سے مروی ہیں۔ اور ترک جہر کی صرف حضرت انس و عبداللہ بن مغفلؓ سے مروی ہیں' لہٰذا ترجیح کثرت کو ہونی چاہیے اس کا جواب یہ ہے کہ ترجیح کثرت کی وجہ سے جب ہوتی ہے کہ مسند صحیح ہو' اور یہاں جہر میں کوئی حدیث مرفوع ثابت نہیں ہو سکی' البتہ بعض صحابہ سے موقوفاً ثبوت ملتا ہے (جیسا کہ اس کا اعتراف خود دار قطنی سے بھی اوپر ذکر ہوا ہے)

دوسرا استدلال یہ ہے کہ احادیث جہر مثبت ہیں' دوسری احادیث نافی ہیں اور مثبت کو نافی پر ترجیح ہے' حافظ کا یہی استدلال اوپر فتح الباری کے حوالہ سے بھی ہم نقل کر آئے ہیں' اس کا جواب یہ ہے کہ احادیث نفی اگرچہ بظاہر نافی ہیں مگر حقیقتاً وہ مثبت ہیں۔

تیسرا استدلال یہ ہے کہ جس راوی سے ترک جہر مروی ہے' اس سے جہر بھی مروی ہوا ہے' بلکہ حضرت انسؓ سے اس کا انکار بھی منقول ہوا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ جس نے آپ سے حفظ کے زمانے میں سنا وہ مقدم ہے اس سے جس نے نسیان کے زمانے میں سنا۔ (فتح الملہم صفحہ ۲/۳۸)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ بسم اللہ کے فاتحہ یا ہر سورت کا جزو نہ ہونے اور اس کو نماز میں بلند آواز سے نہ پڑھنے کے بارے میں امام اعظمؒ کا مسلک زیادہ قوی' وسط و معتدل اور مؤید بالا احادیث الصحیحہ و مؤکد بآثار الصحابۃ والتابعین ہے' جس کی مکمل و مدلل محدثانہ بحث نصب الرایہ میں دیکھی جا سکتی ہے اس کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ محدثین احناف کے عمل بالحدیث واتباع سنت کا طریق انیق بہ نسبت دوسرے حضرات کے کس درجہ فائق اور تعصب و تنگ نظری وغیرہ سے کتنا بعید ہے۔ بحث مذکور کی مناسبت سے آخر میں ہم حضرت تھانوی قدس سرہ کی ایک ضروری مفید علمی تحقیق امداد الفتاویٰ صفحہ ۲/۷ سے نقل کرتے ہیں۔ ایک صاحب نے سوال کیا کہ امام عاصم کے نزدیک ہر دو صورتوں کے درمیان بسم اللہ پڑھنا ضروری ہے اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے مذہب میں تراویح کے اندر ہر سورت پر بسم اللہ نہیں پڑھی جاتی' صرف ایک مرتبہ کسی غیر معین سورت کے اول میں پڑھی جاتی ہے' اس صورت میں ختم کلام مجید بہ روایت حفص عن العاصم کس طرح پورا ہوگا۔؟

اس کے جواب میں حضرت قدس سرہٗ نے تحریر فرمایا کہ بسم اللہ کے باب میں ایک مسئلہ قرأت سے متعلق ہے' دوسرا فقہ سے' اول کا حاصل یہ ہے کہ گو بسم اللہ ہر سورت کا جزو نہ ہو' مگر روایۃً اس کا پڑھنا ہر سورت پر منقول ہے' پس اگر کوئی شخص ہر سورت پر نہ پڑھے تو اس کی قرأت اس روایت کے موافق نہ ہوئی' گو کوئی جزو متروک نہ ہوا ہو' جب کہ کم از کم کسی ایک سورت پر پڑھ لے دوسرے مسئلہ کا حاصل یہ ہے کہ گو روایۃً ہر سورت پر بسم اللہ منقول ہو لیکن ہر سورت کا جزو نہیں ہے بلکہ جزو مطلق قرآن مجید کا ہے اگر ایک جگہ بھی پڑھ لے گا تو پورا قرآن مجید ختم ہو جائے گا' گو اس روایت کے موافق اس کی قرأت نہ ہو پس امام عاصم اور امام اعظم کے اقوال میں کوئی تخالف نہیں' یہ جب ہے کہ ہر سورت پر بسم اللہ نہ پڑھے اور اگر پڑھ لے تو شبہ کی گنجائش ہی نہیں' اور امام صاحب کے بھی خلاف نہیں' کیونکہ امام صاحب بسم اللہ کو ہر سورت پر ضروری نہیں کہتے' یہ نہیں کہ جائز نہیں کہتے' درمختار یا ردمختار میں ہر سورت پر تسمیہ کو حسن کہا ہے۔ رہا ہر جگہ پکار کر پڑھنا' یہ بلاشبہ احناف کے خلاف ہے اور امام عاصم بھی جہر کو ضروری نہیں کہتے صرف تسمیہ کو ضروری کہتے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم و علمہ اتم۔

یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ جہر بسم اللہ روافض و شیعہ کا شعار رہا ہے اور انہوں نے بہت سی احادیث بھی اس کی تائید کے لیے وضع کر کے عوام کو گمراہ کیا تھا' چنانچہ امام سفیان ثوری وغیرہ فرمایا کرتے تھے کہ فرقہ شیعہ کے مقابلہ میں تقدیم ابی بکر و عمرؓ کی طرح ترک جہر بسم اللہ اور مسح علی الخفین اہل سنت کا شعار ہے اور اسی وجہ سے شوافع میں سے بھی بہت سے اکابر ابو علی بن ابی ہریرہ وغیرہ ترک جہر کو ترجیح دیا کرتے تھے۔

مذکورہ بالا تنقیحات کی روشنی میں یہ امر بھی واضح ہو گیا کہ رمضان شریف کے ختم تراویح میں ہر سورت کے شروع میں بلند آواز سے بسم

اللہ پڑھنی فقہ حنفی کی رو سے درست نہیں اور روایت عاصم کی رو سے ضروری بھی نہیں، اس لیے آہستہ آواز سے پڑھنی چاہیے، جس طرح کہ دوسری صدی سے اب تک برابر حناف کا معمول یہ رہا ہے، پھر چونکہ سارے ائمہ مجتہدین بجز امام شافعی کے جہر بسم اللہ کو مسنون نہیں فرماتے بلکہ ایک قول میں امام شافعی بھی بسم اللہ کو بجز فاتحہ کے دوسری سورتوں کا جزو نہیں فرماتے، اور وہ ایک فرقۂ باطلہ کا شعار بھی ہے اس لیے ختم تراویح میں جہر بسم اللہ کا رواج دینے سے احتراز کرنا چاہیے۔ واللہ الموفق۔

۴-حدثنا موسٰی بن اسمٰعیل قال اخبرنا ابو عوانة قال حدثنا موسٰی بن ابی عائشة قال حدثنا سعید بن جبیر عن ابن عباس رضی اللہ عنهما فی قوله تعالیٰ لا تحرک به لسانک لتعجل به قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم یعالج من التنزیل شدة وکان مما یحرک شفتیه فقال ابن عباس رضی اللہ عنهما فانا احرکهما لک کما کان رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم یحرکهما وقال سعید انا احرکهما کما رایت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنهما یحرکهما فحرک شفتیه فانزل اللہ تعالیٰ لا تحرک به لسانک لتعجل به ان علینا جمعه و قرانه قال جمعه لک صدرک و تقرأه فاذا قرا ناه فا تبع قرانه قال فاستمع له وانصت ثم ان علینا بیا نه ثم ان علینا ان تقرأه فکان رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم بعد ذلک اذا اتاه جبریل استمع فاذا نطلق جبریل قرأه النبی صلی اللہ علیه وسلم کما قرأه'

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کلام الٰہی لاتحرک کی تفسیر کے سلسلہ میں مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نزول وحی کے وقت بہت مشقت برداشت فرمایا کرتے تھے اور آپ اکثر اپنے ہونٹوں کو بھی ہلاتے تھے، ابن عباسؓ نے کہا، میں اپنے ہونٹ ہلاتا ہوں جس طرح سے آپ ہلاتے تھے، سعید کہتے ہیں، میں اپنے اونٹ ہلاتا ہوں، جس طرح ابن عباس کو ہلاتے ہوئے دیکھا پھر اپنے ہونٹ ہلائے (ابن عباسؓ نے کہا) پھر یہ آیت اتری کہ اے محمد قرآن کو جلد جلد یاد کرنے کے لیے اپنی زبان نہ ہلاؤ، اس کا (آپ کے سینے میں) جمع محفوظ کر دینا اور اس کو پڑھوا دینا ہمارا ذمہ ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ قرآن تمہارے دل میں جما دینا اور جب آپ چاہیں اس کی تلاوت آپ کی زبان مبارک سے کرا دینا ہمارا کام ہے، پھر جب پڑھ لیں تو اس پڑھے ہوئے کی اتباع کرو۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں (اس کا مطلب یہ ہے) کہ تم اس کو خاموشی کے ساتھ سنتے رہو اس کے بعد مطلب سمجھا دینا ہمارے ذمہ ہے، پھر یقیناً یہ تمہاری ذمہ داری ہے کہ تم اس کو پڑھو (یعنی تم اس کو محفوظ کر سکو) چنانچہ اس کے بعد جب آپ کے پاس جبریلؑ (وحی لے کر) آتے تو آپ (توجہ سے) سنتے، جب وہ چلے جاتے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس (تازہ وحی) کو اسی طرح (بے تکلف) پڑھتے جس طرح جبریلؑ نے پڑھا تھا۔

تشریح: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یاد کرنے کے خیال سے وحی کو جلدی جلدی دہرانے کی کوشش فرماتے تھے اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ یہ قرآن ہمارا کلام ہے جس غرض سے ہم اسے نازل کر رہے ہیں اس کا پورا کرنا ہمارے ذمہ ہے اس لیے اطمینان سے نازل ہونے والی وحی کو سنیئے اس کے محفوظ کرنے کی فکر نہ کیجئے، قرآن کی آیتوں میں خدا نے یہ اعجاز بھی پیدا فرما دیا کہ وہ ایک معصوم بچے تک کو یاد ہو جاتی ہیں، جب کہ دوسری مذہبی کتابیں مختصر ہونے کے باوجود بڑا آدمی بھی یاد نہیں کر سکتا۔

معلوم ہوا کہ خدا کے کلام عظیم کو قلب انسانی محض ظاہری اسباب کی مدد سے محفوظ نہیں کر سکتا، پھر جس طرح اس کو یاد کرنے کی صلاحیت فخر رسل صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوئی، آپ کے صدقے میں آپ کی امت کے افراد کو بھی مرحمت ہوئی۔ واللہ ذو الفضل العظیم

۵-حدثنا عبدان قال اخبر نا عبد اللہ قال اخبرنا یونس عن الزهری وحدثنا بشر بن محمد قال حدثنا عبد اللہ قال اخبرنا یونس و معمر نحوه عن الزهری اخبرنی عبید اللہ بن عبد اللہ عن ابن عباس رضی اللہ عنهما قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم اجود الناس وکان اجود ما یکون فی رمضان حین یلقاه جبریل و کان یلقاه

في كل ليلة من رمضان فيد ارسه القران فلرسول الله صلى الله عليه وسلم اجود بالخير من الريح المرسلة.

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وصف سخاوت میں تمام انسانوں سے بڑھے ہوئے تھے اور رمضان میں (دوسرے اوقات کے مقابلہ میں جب جبریلؑ آپ سے ملتے تو آپ کا یہ وصف نقطۂ عروج پر پہنچ جاتا تھا۔ جبریلؑ رمضان کی ہر رات میں آپ سے ملاقات کرتے اور آپ کے ساتھ قرآن کا دور کرتے تھے' غرض حضرت صلی اللہ علیہ وسلم مخلوق کی نفع رسانی میں تیز ہوا سے بھی زیادہ سخاوت فرماتے تھے۔

تشریح: اس حدیث میں ذکر ہے کہ رمضان میں جبریلؑ آپ سے قرآن کا دور کرتے تھے' یہ اس لیے کہ قرآن دنیا والوں کے لیے رمضان ہی کے مہینے میں نازل ہونا شروع ہوا۔ اس لحاظ سے رمضان سے قرآن کو بہت بڑی مناسبت ہے' گویا یہ نزول وحی کا مہینہ ہے اور اسی کے طفیل یہ نزول رحمت کا مہینہ بن گیا' اس حدیث سے بھی حکم ہوتا ہے کہ رمضان کے مہینہ میں زیادہ سے زیادہ بھلائیاں کرنی چاہئیں اور زیادہ سے زیادہ صدقہ و خیرات کیا جائے۔

''سخاوت'' مال کی تقسیم کا نام ہے اور ''جود'' کا درجہ اس سے اوپر ہے کہ جو چیز جس کے لیے موزوں و مناسب ہو وہ اس کو دی جائے' حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سخاوت مال میں تو بے مثال تھے ہی' علوم و کمالات نبوت سے بھی دوسروں کو فیض یاب کرنے میں آپ کی سخاوت و وسعت قلب بے نظیر تھی' ظاہر ہے کہ آپ کے روحانی کمالات و مدارج تمام اولین و آخرین سے بڑھے ہوئے تھے آپ کے پاس اتنی بڑی دولت و ثروت تھی کہ کبھی کسی کو حاصل نہ ہوئی اور نہ کسی کو آئندہ حاصل ہوگی۔ اس پر آپ کی پوری خواہش ہمیشہ یہ رہی کہ ان کمالات سے ساری انسانیت مستفید و بہرہ مند ہو۔ چنانچہ آپ کے علوم نبوت و کمالات روحانی کے سب سے پہلے فیض یاب آپ کے صحابۂ کرام ہوئے (اور ان کے کمالات کا درجہ یہ ہوا کہ ادنیٰ صحابی کے درجے کو بڑے سے بڑا ولی نہیں پہنچ سکتا۔

ان صحابۂ کرام کے نفوس قدسیہ کے فیض ظاہر و باطن سے تابعین و ائمہ مجتہدین مستفید ہوئے اور اسی طرح یہ سلسلہ ظاہری و باطنی علوم نبوت کا ہمارے زمانہ کے علماء اولیاء و عامۂ مومنین تک پہنچا اور یہ بات بلا خوف و تردید کہی جا سکتی ہے کہ آج اس گئے گزرے دور میں بھی جو ایمان و معرفت خداوندی کی نعمت ایک معمولی درجے کے مومن کو حاصل ہے وہ دنیا کے بڑے سے بڑے غیر مومن عالم و فلسفی کو بھی حاصل نہیں ہے۔

مال ہاتھ کا میل اور دنیا کی ہر دولت آنی جانی چیز ہے' حدیث صحیح میں آتا ہے کہ اگر ساری دنیا کی دولت کی قدر خدا کے یہاں مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو وہ اس دنیا کی پانی جیسی بے قیمت چیز سے بھی کافر و بے دین کو ایک گھونٹ پینے کے لیے نہ دیتا۔ حق تعالیٰ کی مشیت نے فیصلہ کیا کہ ''دنیائے فانی'' کی ہر دولت کا زیادہ سے زیادہ حق دار وہ لوگ ہیں (کیونکہ ان کو دولت و راحت کا تمام حصہ پہلے دے دیا گیا اور مسلمانوں کو ثانوی درجے میں دنیا کی دولت و راحت سے فائدہ اٹھانے کا حق کچھ شرائط پر موقوف کر دیا گیا' اس کے بعد دوسری ''دنیائے ابدی'' کی ہر دولت و راحت سے مستفید ہونے کا حق پوری طرح مسلمانوں کو ہوگا اور دوسرے اس سے یکسر محروم ہوں گے' یہاں مسلمانوں کی اسلامی زندگی یہ ہے کہ وہ اگر دولت کمائے تو جتنی چاہئے کمائے مگر اس کی نیت صحیح ہو اور اسی کے مطابق عمل یہ ہو کہ اپنی ضروریات کے بعد دینی ضروریات و مصالح پر صرف کرے پھر مسلمانوں کی عام و خاص ضروریات و مصالح پر نظر کرے۔ پھر ملکی و ملی ضروریات و مصالح اور رفاہ عام نیز ہر انسان بلکہ ہر جاندار کی راحت رسانی و ضروریات پر صرف کرے اگر وہ ایسا نہیں کر سکتا تو اس کا دولت کمانا اور مال سمیٹنا اور جمع کرنا نظر شارع میں کسی طرح بھی پسندیدہ نہیں ہے۔

یہ تو اپنی کمائی ہوئی دولت کا حکم ہے۔ اور اگر ایک مسلمان کو ایک بادشاہ' ایک وزیر اعظم یا صدر مملکت بننے کا موقع میسر ہو تو اس کے لیے اسوہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اسوۂ خلفائے راشدین کے اتباع میں یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی ذاتی ضروریات کو بھی نظر انداز کر کے صرف اپنے ملک و ملت کے مصالح و ضروریات پر ساری دولت کو صرف کر دے۔

چنانچہ مروی ہے کہ بحرین سے ایک لاکھ درہم آئے' حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا کہ مسجد کے ایک گوشہ میں ڈال دیئے جائیں۔ پھر نماز کے بعد سب اسی وقت تقسیم فرما دیئے' کسی نے عرض کیا کہ حضور اپنے قرض کی ادائیگی کے لیے کچھ رکھ لیتے؟ فرمایا تم نے پہلے

سے کیوں یاد نہیں ولایا' یہ ان کا دل خوش کرنے کو فرمادیا ورنہ آپ کو کیا چیز یاد نہیں تھی؟!

ایک مرتبہ نماز عصر کے بعد عجلت کے ساتھ حجرۂ شریفہ میں تشریف لے گئے اور سونے کا ایک ٹکڑا نکال کر لائے اور مستحقین کو دے دیا' فرمایا کہ رسول خدا کے گھر میں ایسی چیز کا رہنا مناسب نہیں' عادت مبارکہ تھی کہ کبھی کسی سائل وضرورت مند کو محروم نہ ہونے دیتے تھے۔ غزوۂ حنین کے موقع پر بہت سے دیہاتی عربوں نے آکر آپ کو گھیر لیا اور کہا کہ ہمیں مال دیجئے' ہم آپ کا یا آپ کے باپ کا مال نہیں مانگتے بلکہ خدا کا مانگتے ہیں' آپ نے اس بات پر کسی ناراضگی کا اظہار نہ فرمایا بلکہ برابر سب کو دیتے رہے' مگر اژدھام زیادہ تھا' لوگوں کے ریلے کی وجہ سے آپ پیچھے ہٹتے ہٹتے کیکر کے درختوں میں الجھ گئے' اور چادر مبارک پھنس گئی' آپ نے فرمایا کہ تم مطمئن رہو' اگر ان سب خاردار درختوں کے برابر اونٹ ہوتے تو وہ سب بھی میں تقسیم کر دیتا۔ مجھے تم بخیل یا کم حوصلہ نہ پاؤ گے۔

غرض دنیاوی مال ومتاع کی سخاوت تو روحانی وعلمی کمالات کے فیضان کے اعتبار سے بہت کم درجہ کی چیز ہے' حق تعالیٰ نے ہی دنیا والوں کو ساری دنیوی نعمتیں عطا فرمائی ہیں اور قرآن مجید میں فرمایا:۔ **و ما بکم من نعمة فمن اللّٰه**'' کہ جو کچھ نعمتیں تمہارے پاس ہیں وہ سب خدا کی طرف سے ہیں ایک جگہ فرمایا کہ ''**و ان تعدوا نعمة الله لا تحصوها**' اگر تم خدا کی نعمتوں کو شمار کرنے لگو تو پورا شمار نہ کرسکو گے لیکن جس نعمت خاصہ پر حق تعالیٰ نے خاص طور پر احسان جتلایا ہے وہ رشد وہدایت کی نعمت ہے جس کا فیضان انبیاء علیہم السلام اور ان کے تابعین' علماء واولیاء کے ذریعے ہوا فرماتے ہیں:۔'' **لقد من الله علی المومنین اذ بعث فیهم رسولا منهم یتلوا علیهم ایاته و یزکیهم و یعلمهم الکتاب والحکمة**'' حق تعالیٰ نے ایمان کی نعمت سے سرفراز ہونے والوں پر بڑا احسان فرمایا کہ ان کی ہدایت کے لیے اپنا رسول بھیجا جو خدا کی آیات تلاوت کرکے ان کے قلوب منور کرتا ہے اور ان کے نفوس کا تزکیہ کرتا ہے' یعنی برائیوں سے ان کو پاک کرتا ہے اور علوم کتاب وسنت کے ذریعے ان کے علم وعرفان کی تکمیل فرماتا ہے۔ یہ سب سے بڑا احسان اور جتلانے کے قابل نعمت صرف اس لیے ہے کہ اس کا حصول بغیر اس خاص ذریعہ ووسیلہ کے ناممکن تھا اور اس کے علاوہ دنیا کے تمام علوم وفنون اور مادی ترقیات کے لیے انسانی عقل وفہم بھی کافی ہوسکتی ہے' غرض انبیاء علیہم السلام کے خصوصی فیضان کا تعلق روحانیت سے ہے اور اس بارے میں ان کا جود وکرم بھی بہت اعلیٰ درجے کا ہے' اس لیے سردار انبیاء علیہم السلام کے جود وسخاوت کو خاص طور سے مدح وثنا کے موقع میں ذکر کیا گیا ہے' رمضان المبارک کے ماہ مقدس کو چونکہ ''نزول وحی'' سے ربط ہے کہ ۱۷ رمضان سے پہلی وحی کا آغاز ہوا اور اسی ماہ کی ہر رات میں حضرت جبریل علیہم السلام' حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تشریف لاکر آپ کے ساتھ قرآن مجید کا دور کیا کرتے تھے' اس لیے آپ کے جود وسخاوت کی شان بھی اس وقت بہت بلند ہو جاتی تھی اور اس کا ذکر خاص اہتمام سے حدیث مذکور میں ہوا ہے اور باب بداء الوحی سے اس حدیث کا تعلق یوں ظاہر ہے کہ پہلے بدوحی کا مکان غار حرا بتلایا تھا تو یہاں سے بدوحی کے زمانہ کی طرف اشارہ ہوا۔ **واللّٰه اعلم بالصواب**

۲-حدثنا ابوالیمان الحکم بن نافع قال اخبرنا شعیب عن الزهری قال اخبرنی عبید اللّٰه بن عبد اللّٰه ابن عتبة بن مسعود ان عبد الله بن عباس اخبره' ان ابا سفیان بن حرب اخبره' ان هرقل ارسل الیه فی رکب من قریش و کانوا تجارا بالشام فی المدة التی کان رسول الله صلی الله علیه وسلم ما دفیهآ ابا سفیان و کفار قریش فا توه و هم بایلیآء فد عا هم فی مجلسه و حوله عظمآء الروم ثم دعا هم دعا تر جمانه ' فقال ایکم اقرب نسبا بهذا الرجل الذی یزعم انه نبی قال ابو سفیان فقلت انا اقربهم نسباً فقال اذنوه منی و قربوا اصحابه فا جعلو ا هم عند ظهره ثم قال لتر جمانه قل لهم انی سائل هذا عن هذا الرجل فان کذبنی فکذبوه فوالله لو لا الحیاء من ان یا ثروا علی کذبا لکذبت عنه ثم کان اول ما سا لنی عنه ان قال کیف نسبه فیکم ؟ قلت هو فینا ذو نسب قال فهل

قال هذا القول منکم احد قط قبله ؟ قلت لاقال فهل کان من اٰبائه من ملک؟ قلت لا قال فاشراف الناس اتبعوه ام ضعفاء هم؟ قلت بل ضعفاء هم قال ایزیدون ام ینقصون ؟ قلت بل یزیدون قال فهل یر تداحد منهم سخطۃلدینه بعد ان ید خل فیه؟ قلت لا قال فهل کنتم تتهمونه بالکذب قبل ان یقول ما قال؟ قلت لا قال فهل یغدر ؟ قلت لا نحن منه فی مدۃ لا ندری ما هو فاعل فیها قال و لم یمکنی کلمة ادخل فیها شیئا غیر هذه الکلمة قال فهل قا تلتموه؟ قلت نعم قال فکیف کان قتالکم ایاه قلت الحرب بیننا و بینه سجال ینال منا و ننا ل منه قال ماذ ا یا مر کم ؟ قلت یقول اعبد الله وحده و لا تشرکوا به شیئا وا ترکو ا ما یقول ا با ؤکم و یا مر نا بالصلوۃ والصدق والعفاف الصلة فقال للترجمان قل له سألتک عن نسبه فذکرت انه فیکم ذو نسب و کذ لک الرسل تبعث فی نسب قو مها و سالتک هل قال احدمنکم هذا القول فذکرت ان لا قلت لو کان احد قال هذا القول قبله لقلت رجل یتاسی بقول قیل قبله و سا لتک هل کان من اباء ہ من ملک فذکرت ان لا فقلت فلو کان من اٰبائه من ملک قلت رجل یطلب ملک ابیه و سالتک هل کنتم تتهمو نه بالکذب قبل ان یقول ما قال فذکرت ان لا فقد اعرف انه لم یکن لیذر الکتاب علی الناس و یکذب علی الله و سألتک اشراف الناس اتبعوه امضعفاء هم فذکرت ان ضعفاهم اتبعوہ وهم اتباع الرسل وسألتک ایزیدون ام ینقصون فذکرت انهم یزیدون و کذلک امر الا یمان حتی یتم و سالتک ایر تد احد سخطة لدینه بعد ان ید خل فیه فذکرت ان لا و کذلک الایمان حین تخالط بشاشته القلوب و سألک هل یغدر فذکرت ان لا و کذلک الرسل لا تغدرو سالتک بما یا مرکم فذکرت انه یا مرکم ان تعبدوا الله و لا تشرکو به شیئاً و ینها کم عن عبادۃ الا و ثان و یا مرکم بالصلوۃ والصدق والعفاف فان کان ما تقول حقاً فسیملک مو ضع قدمی ها تین و قد کنت اعلم انه خارج و لم اکن اظن انه منکم فلوا نی اعلم انی اخلص الیه لتجشمت لقائه؛ لو کنت عند ہ لغسلت عن قدمیه ثم دعا بکتاب رسول الله صلی الله علیه وسلم الذی بعث به مع دحیة الکلبی الی عظیم بصری فد فعه عظیم بصری الی هرقل فقرائه فاذا فیه بسم الله الرحمن الرحیم من محمد عبدالله ورسوله الی هر قل عظیم الروم سلام علی من اتبع الهدیٰ. اما بعد فانی ادعو ک بد عایته الاسلام اسلم تسلم یوتک الله اجر ک مر تین فان تو لیت فان علیک اثم الیر یسین و یاهل الکتاب تعالو الی کلمة سواء بیننا و بینکم الا نعبد الا الله و لا نشرک به شیئاً و لا یتخذ بعضنا بعضا ارباباً من دون الله فان تو لو ا فقولوا اشهد و ابانا مسلمون قال ابو سفیان فلما قال ما قال وفرغ من قرائة الکتاب کثر عنده الصخب فارتفعت الا صوات واخرجنا فقلت لا صحابی حین اخرجنا لقد امر امرابن ابی کبشة انه یخافه ملک بنی الاصفر. فما زلت موقناً انه سیظهر حتیٰ ادخل اللّٰہ علی الا سلام وکان ابن الناطورصاحب ایلیا ء وهرقل سقفاً علیٰ نصاری الشام یحدث ان هرقل حین قدم ایلیآء اصبح یوماً خبیث النفس فقال بعض بطارقته قداستنکر ناهیئتک قال ابن الناطور وکان هرقل حزآءً ینظر فی النجوم فقال لهم حین سالوه انی رایت اللیلة حین نظرت فی النجوم ملک الختان قدظهر فمن یختتن من هذه الامة قالو الیس یختتن الاالیهود فلایهمنک شانهم واکتب الیٰ مدائن مللک فلیقتلوا من فیهم من الیهود فبینما هم علیٰ امرهم اتی هرقل برجل ارسل به ملک غسان یخبر عن خبر رسول الله صلی اللّٰہ علیه وسلم فلما استخبره هرقل قال اذهبوا فانظروا مختتن هوام لافنظروا الیه فحدثوه انه مختتن وساله عن العرب فقال هم یختتنون فقال هرقل هذا ملک هذه الامة قدظهرثم کتب هرقل الیٰ صاحب له برومیة وکان نظیره فی العلم وسارهرقل الیٰ حمص فلم یرم حمص حتیٰ اتاه کتاب من صاحبه یوافق رای هرقل علیٰ خروج النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم وآنه نبی فاذن

ھرقل لعظماء الروم فی دسکرۃ لہ بحمص ثم امربابوابھا فغلقت ثم اطلع فقال یامعشر الروم ھل لکم فی الفلاح والرشد وان یثبت ملککم فتبایعوا ھذا النبی فحاصوا حیصۃ حمرالوحش الی الابواب فوجدوھاقدغلقت فلما رای ھرقل نفرتھم وایس من الایمان قال ردوھم علی وقال انی قلت مقالتی انفاً اختبر بھا شدتکم علیٰ دینکم فقد رایت فسجدوالہ ورضواعنہ فکان ذلک اخر شان ھرقل قال ابوعبداللہ رواہ صالح بن کیسان ویونس ومعمر عن الزھری.

ترجمہ: عبداللہ بن عباسؓ نے سفیان بن حرب سے نقل کیا کہ ہرقل نے ان کے پاس قریش کے قافلے میں ایک آدمی بھیجا اس وقت یہ لوگ تجارت کے لیے شام گئے ہوئے تھے اور یہ وہ زمانہ تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش اور ابوسفیان سے ایک وقتی معاہدہ کیا تھا تو ابوسفیان اور دوسرے لوگ ہرقل کے پاس ایلیا پہنچے جہاں ہرقل نے انہیں اپنے دربار میں طلب کیا تھا اس کے گرد روم کے بڑے بڑے لوگ بیٹھے تھے، ہرقل نے انہیں اور اپنے ترجمان کو بلوایا، پھر ان سے پوچھا کہ تم میں سے کون شخص مدعی رسالت کا قریبی عزیز ہے؟ ابوسفیان کہتے ہیں کہ میں بول اٹھا کہ میں اس کا سب سے زیادہ قریبی رشتہ دار ہوں (یہ سن کر) ہرقل نے حکم دیا کہ اس (ابوسفیان) کو میرے قریب لاؤ اور اس کے ساتھیوں کو اس کے پس پشت بٹھلا دو، پھر اپنے ترجمان سے کہا کہ ان لوگوں سے کہہ دو کہ میں ابوسفیان سے اس شخص (یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کا حال پوچھتا ہوں، اگر یہ مجھ سے جھوٹ بولے تو تم اس کا جھوٹ ظاہر کر دینا (ابوسفیان کا قول ہے کہ، خدا کی قسم! اگر مجھے غیرت نہ آتی کہ یہ لوگ مجھے جھوٹا کہیں گے تو میں آپ کی نسبت ضرور غلط بدگوئی سے کام لیتا، خیر پہلی بات جو ہرقل نے مجھ سے پوچھی وہ یہ کہ اس شخص کا خاندان تم لوگوں میں کیسا ہے؟ میں نے کہا کہ وہ تو بڑے نسب والا ہے، کہنے لگا، اس سے پہلے بھی کسی نے تم لوگوں میں ایسی بات کہی تھی؟ میں نے کہا کہ نہیں، کہنے لگا، اچھا اس کے بڑوں میں کوئی بادشاہ بھی ہوا ہے؟ میں نے کہا نہیں، پھر اس نے کہا، بڑے لوگوں نے اس کی پیروی اختیار کی یا کمزوروں نے؟ میں نے کہا کمزوروں نے، پھر کہنے لگا کہ اس کے متبعین روز بروز بڑھتے جارہے ہیں؟ میں نے کہا ان میں زیادتی ہورہی ہے، کہنے لگا، اچھا اس کے دین کو برا سمجھ کر اس کا کوئی ساتھی پھر بھی جاتا ہے؟ میں نے کہا نہیں، اس نے کہا کہ کیا اس کے دعوے (نبوت) سے پہلے تم لوگ اس پر جھوٹ بولنے کا الزام لگاتے تھے؟ میں نے کہا نہیں، پوچھا کیا وہ عہد شکنی کرتا ہے؟ میں نے کہا نہیں۔ البتہ اب ہماری اس سے (صلح کی) ایک مدت ٹھہری ہوئی ہے، معلوم نہیں وہ اس میں کیا کرتا ہے (ابوسفیان کہتے ہیں۔ بس اس بات کے سوا اور کوئی (مغالطہ آمیز) بات اس (گفتگو) میں شامل نہ کر سکا، ہرقل نے کہا کہ کیا تمہاری اس سے لڑائی بھی ہوتی ہے؟ میں نے کہا ہاں! بولا، پھر تمہاری اس کی جنگ کس طرح ہوئی ہے؟ میں نے کہا، لڑائی ڈول کی طرح ہوتی ہے کبھی وہ ہم سے میدان جنگ لے لیتے ہیں اور کبھی ہم ان سے، ہرقل نے پوچھا وہ تمہیں کس بات کا حکم دیتا ہے؟ میں نے کہا کہ صرف ایک اللہ کی عبادت کرو اس کا کسی کو شریک نہ بناؤ اور اپنے باپ دادا کی (شرک کی) باتیں چھوڑ دو، اور ہمیں نماز پڑھنے سچ بولنے، پرہیزگاری اور صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے۔ (یہ سب سن کر) پھر ہرقل نے اپنے ترجمان سے کہا کہ ابوسفیان سے کہہ دو کہ میں نے تم سے اس کا نسب پوچھا تو تم نے کہا کہ وہ ہم میں عالی نسب ہے اور پیغمبر اپنی قوم میں عالی نسب ہی بھیجے جایا کرتے ہیں۔ میں نے تم سے پوچھا کہ دعویٰ (نبوت) کی یہ بات تمہارے اندر اس سے پہلے کسی اور نے بھی کہی تھی، تو تم نے جواب دیا کہ نہیں۔ تب میں نے (اپنے دل میں) یہ کہا اگر یہ بات اس سے پہلے کسی نے کہی ہوتی تو میں یہ سمجھتا کہ اس شخص نے بھی اس بات کی تقلید کی ہے جو پہلے کہی جا چکی ہے میں نے تم سے پوچھا کہ اس کے بڑوں میں کوئی بادشاہ بھی گذرا ہے، تم نے کہا کہ نہیں، تو میں نے (دل میں) کہا کہ ان کے بزرگوں میں سے کوئی بادشاہ ہوا ہوگا تو کہہ دوں کہ وہ شخص اس بہانے سے اپنے آباؤ اجداد کا ملک حاصل کرنا چاہتا ہے اور میں نے تم سے پوچھا کہ اس بات کے کہنے (یعنی پیغمبری کا دعویٰ کرنے سے) پہلے کبھی تم نے اس دروغ گوئی کا الزام لگایا ہے تم نے کہا کہ نہیں، تو میں نے سمجھ لیا کہ جو شخص آدمیوں کے ساتھ دروغ گوئی سے بچے وہ اللہ کے بارے میں کیسے جھوٹی بات کہہ سکتا ہے اور میں نے تم سے پوچھا کہ بڑے لوگ اس کے پیرو ہوتے ہیں یا کمزور

آدمی؟ تم نے کہا کہ کمزوروں نے اس کا اتباع کیا تو وہ (اصل) یہی لوگ پیغمبروں کے متبعین ہوتے ہیں اور میں نے تم سے پوچھا کہ اس کے ساتھی بڑھ رہے ہیں یا کم ہو رہے ہیں تم نے کہا کہ وہ بڑھ رہے ہیں اور ایمان کی کیفیت یہ ہی ہوتی ہے حتیٰ کہ وہ کامل ہو جاتا ہے اور میں نے پوچھا کہ کوئی شخص ناخوش ہو کر اس کے دین سے لوٹ بھی جاتا ہے' تم نے کہا نہیں' تو ایمان کی خاصیت بھی یہ ہی ہے جن کے دلوں میں اس کی حلاوت اتر جاتی ہے تو پھر وہ ان سے ہرگز جدا نہیں ہو سکتا اور میں نے پوچھا کہ آیا وہ عہد شکنی کرتے ہیں' تم نے کہا کہ وہ ہم کو حکم دیتے ہیں کہ اللہ کی عبادت کرو۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور تمہیں بتوں کی پرستش سے روکتے ہیں' سچ بولنے اور پرہیزگاری کا حکم دیتے ہیں' لہٰذا اگر یہ باتیں جو تم کہہ رہے ہو سچ ہیں' تو عنقریب وہ اس جگہ کا بھی حاکم ہو جائے گا جہاں میرے یہ دونوں پاؤں ہیں' مجھے معلوم تھا کہ وہ پیغمبر آنے والا ہے مگر مجھے خیال نہیں تھا کہ وہ تمہارے اندر ہو گا' اگر میں جانتا کہ اس تک پہنچ سکوں گا تو اس سے ملنے کے لیے ہر تکلیف گوارہ کرتا' اگر میں اس کے پاس ہوتا تو اس کے پاؤں دھوتا' پھر ہرقل نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ خط منگایا جو آپ نے دحیۂ کلبی کے ذریعے حاکم بصریٰ کے پاس بھیجا تھا اور اس نے وہ ہرقل کے پاس بھیج دیا تھا' ہرقل نے اس کو پڑھا تو اس میں لکھا تھا یہ اللہ کے نام کے ساتھ جو نہایت مہربان اور رحم والا ہے' اللہ کے بندے اور اس کے پیغمبر محمدؐ کی طرف سے ہرقل شاہ روم کے لیے' اس شخص پر سلام ہو جو ہدایت کی پیروی کرے' اس کے بعد میں تمہیں دعوت اسلام دیتا ہوں کہ اسلام لے آؤ گے تو دین و دنیا کی سلامتی نصیب ہو گی' اللہ تمہیں دوہرا ثواب دے گا اور اگر تم میری دعوت سے روگردانی کرو گے تو (تمہاری) رعایا کا گناہ بھی تم ہی پر ہو گا اور اے اہل کتاب ایک ایسی بات پر آ جاؤ جو ہمارے تمہارے درمیان یکساں ہے وہ یہ کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں اور نہ ہم میں سے کوئی کسی کو خدا کے سوا اپنا رب بنائے' پھر اگر وہ اہل کتاب (اس بات سے) منہ پھیر لیں تو (مسلمانو!) تم ان سے کہہ دو کہ (تم مانو یا نہ مانو) ہم تو ایک خدا کے اطاعت گزار ہیں۔

ابوسفیان کہتے ہیں جب ہرقل نے یہ باتیں کہیں اور خط پڑھ کر فارغ ہوا تو اس کے اردگرد بہت شوروغوغا ہوا' بہت سی آوازیں اٹھیں' اور ہمیں باہر نکال دیا گیا تب میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ابوکبشہ کے بیٹے کا معاملہ تو بہت بڑھ گیا۔ (دیکھو تو) اس سے بنی اصفر (روم کا بادشاہ) بھی ڈرتا ہے۔ مجھے اس وقت سے اس بات کا یقین ہو گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم عنقریب غالب ہو کر رہیں گے۔ حتیٰ کہ اللہ نے مجھے مسلمان کر دیا۔ (راوی کا بیان ہے) کہ ابن ناطور ایلیاء کا حاکم ہرقل کا مصاحب اور شام کے نصاریٰ کا لاٹ پادری بیان کرتا تھا کہ ہرقل جب ایلیاء میں آیا' ایک دن صبح کو پریشان حال اٹھا' اس کے درباریوں نے دریافت کیا کہ آج آپ کی صورت بدلی ہوئی پاتے ہیں (کیا وجہ ہے؟) ابن ناطور کا بیان ہے کہ ہرقل نجومی تھا' علم نجوم میں مہارت رکھتا تھا' اس نے اپنے ہم نشینوں کے پوچھنے پر بتلایا کہ میں نے آج رات ستاروں پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ ختنہ کرنے والوں کا بادشاہ غالب آ گیا (بتلاؤ؟) اس زمانے میں کون لوگ ختنہ کرتے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ یہود کے سوا کوئی ختنہ نہیں کرتا' سو ان کی وجہ سے آپ قطعاً پریشان نہ ہوں' سلطنت کے تمام شہروں میں یہ حکم لکھ بھیجئے کہ وہاں جتنے یہودی ہوں سب قتل کر دیئے جائیں' وہ لوگ ان ہی باتوں میں مشغول تھے کہ ہرقل کے پاس ایک شخص لایا گیا جسے شاہ غسان نے بھیجا تھا' اس نے رسول اللہ کے حالات بیان کئے جب ہرقل نے سارے حالات ان سے سن لیے تو کہا کہ اس کو لے جاؤ اور دیکھو کہ وہ ختنہ کئے ہوئے ہے یا نہیں؟ انہوں نے اسے دیکھا تو بتلایا کہ وہ ختنہ کیا ہوا ہے' ہرقل نے جب اس شخص سے عرب کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتلایا کہ وہ ختنہ کرتے ہیں۔ تب ہرقل نے کہا کہ یہ ہی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اس امت کے بادشاہ ہیں جو پیدا ہو چکے ہیں' پھر اس نے اپنے ایک دوست کو رومیہ لکھا اور وہ علم نجوم میں ہرقل کی ٹکر کا تھا۔ پھر خود ہرقل حمص چلا گیا' ابھی حمص سے نکلا نہیں تھا کہ اس کے دوست کا خط (اس کے جواب میں) آ گیا اس کی رائے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کے بارے میں ہرقل کے موافق تھی کہ محمدؐ (واقعی) پیغمبر ہیں اس کے بعد ہرقل نے روم کے بڑے آدمیوں کو اپنے حمص کے محل میں طلب کیا' اس کے حکم سے محل کے دروازے بند کر لیے گئے پھر اپنے محل سے یوں گویا ہوا۔ "اے روم والو! اگر تم ہدایت و کامرانی کے طلب گار ہو اور اپنی

سلطنت وحکمرانی کی بقاء چاہتے ہوتو پھراس نبی کی بیعت کرلو۔"(یہ سننا تھا کہ) وہ لوگ وحشی گدھوں کی طرح دروازوں کی طرف دوڑے مگر انہیں بند پایا (آخر جب ہرقل نے (اس بات سے) ان کی یہ نفرت دیکھی اوران کے ایمان لانے سے مایوس ہوگیا تو کہنے لگا کہ ان لوگوں کو پھر میرے پاس لاؤ' جب وہ دوبارہ آئے تواس نے کہا' میں نے جو بات کہی تھی اس سے تمہاری دینی پختگی کی آزمائش مقصود تھی سووہ میں نے دیکھ لی (یہ بات سن کر) سب کے سب اس کے سامنے سجدے میں گر پڑے اوراس سے خوش ہو گئے' بس یہ ہرقل کا آخری حال ہے' ابوعبداللہ کہتے ہیں کہ اس حدیث کوصالح بن کیسان' یونس اور معمر نے بھی زہری سے روایت کیا ہے۔

تشریح: **ترتیب واقعات:** اس حدیث میں کئی واقعات کی طرف اشارہ ہے اورترتیب واقعات اس طرح صحیح معلوم ہوتی ہے کہ ہرقل نے اولاً بیت المقدس میں علم نجوم کے ذریعہ معلوم کیا کہ ملک الختان کا غلبہ ہوگا۔ان ہی ایام میں ملک غسان نے ہرقل کے پاس قاصد بھیجا' جس سے اس کوملک عرب کے حالات معلوم ہوئے' پھر ہرقل نے رومیہ کے عالم نجوم ضغاطر نامی کے پاس خط بھیج کر اس کی رائے دریافت کی وہاں سے جواب نہیں آیا تھا کہ اسی اثنا میں اس کے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مکتوب گرامی دعوت اسلام کے لیے پہنچ گیا اورآپ کے ذاتی حالات کی تحقیق کے لیے اس نے عربوں کا پتا لگایا' تو بیت المقدس سے قریب ہی ایک مقام غزہ میں حضرت ابوسفیان کی امارت میں تیس شترسوار تاجران مکہ معظمہ کا قافلہ مقیم تھا' ان سب کو بلا کر ہرقل نے حضوراکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق دس سوالات کئے' جن کے جوابات حضرت ابوسفیان نے دیئے' اور ہرقل نے متاثر ہوکر اپنی عقیدت مندی کا اظہار کیا۔جس پر حاضرین دربار نے شوروشغب کیا' اس کے بعد جب ہرقل بیت المقدس سے حمص واپس ہوا اور وہاں اس کو ضغاطر کا جواب بھی ملا تو ملک کے بڑے لوگوں کو اپنے محل میں بلا کر دوبارہ اپنی عقیدت مندی کا مظاہرہ کیا' مگران سب لوگوں نے مخالفت کی' اوراس کے بعد ہرقل کا رویہ بھی تبدیل ہوگیا۔ **واللہ یھدی من یشاء الیٰ صراط مستقیم۔**

ان سب واقعات کواچھی طرح ذہن نشین کرنے کے لیے ابتدائی اسلامی تاریخ کے چندورق پڑھیے! جن سے آپ کواپنی زندگی کے لیے بھی روشنی ملے گی۔ **لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ لمن کان یرجوا اللہ والیوم الاٰخرو ذکراللہ کثیرا۔** (احزاب)

عہدنبوت کا ایک زریں باب

دربار رسالت کی طرف سے شاہان دنیا کودعوت اسلام حروب روم وفارس کی فتح وشکست کے بارمیں قرآن مجید کی پیش گوئی۔

سب سے پہلے آیات قرآنیہ **الم غلبت الروم فی ادنی الارض** کا ترجمہ پھراس کی تفسیر میں حضرت علامہ عثمانیؒ کا بصیرت افروز تفسیری نوٹ ملاحظہ کیجئے:۔حق تعالیٰ نے ارشادفرمایا۔

ترجمہ:۔الم' رومی قریب والے ملک میں مغلوب وشکست خوردہ ہو گئے ہیں اور وہ شکست کے بعدنوسال کے اندرہی غالب وفاتح ہو جائیں گے (درحقیقت) پہلے پچھلے سارے کام اللہ تعالیٰ ہی کے حکم واختیار سے ہوتے ہیں' اس (فتح کے) دن مسلمان خدا کی نصرت کی وجہ سے خوش ہوں گے' خدا جس کی چاہے مدد کرتا ہے' وہ بڑے اختیاروقدرت اوررحم وکرم والا ہے' خدا کا وعدہ ہو چکا" وہ کبھی اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا مگراکثرلوگ صحیح علم سے بے بہرہ ہیں وہ دنیاوی زندگی کی کچھ سطحی باتوں سے واقفیت رکھتے ہیں (جس سے کمانے کھانے اورظاہرو عارضی ٹیپ ٹاپ کے ڈھنگ اچھے بنالیے ہیں' لیکن (اس زندگی کے بعد شروع ہونے والی) آخرت کی زندگی سے بے خبر ہیں۔

تفسیری نوٹ:"ادنی الارض" ملتے ہوئے ملک یاپاس والے ملک سے مراداذرعات وبصریٰ کے درمیان کا خطہ ہے' جوشام کی سرحد پر حجاز سے ملتا ہوا مکہ کے قریب واقع ہے' یا فلسطین مراد ہو' جورومیوں کے ملک سے نزدیک تھا' یا جزیرہ ابن عمر جوفارس سے زیادہ قریب ہے ان آیات میں قرآن مجید نے ایک عجیب وغریب پیشین گوئی کی جواس کی صداقت کی عظیم الشان دلیل ہے' واقعہ یہ ہے کہ اس زمانے کی سب سے بڑی دوسلطنتیں فارس وروم مدت دراز سے آپس میں ٹکراتی چلی آرہی تھیں' ۶۰۲ء' ۶۱۴ء کے بعد تک ان کی سخت لڑائیاں رہیں (انسکلو پیڈیابرٹانیکا)

حروب روم وفارس

۵۷۰ء میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت شریفہ اور چالیس سال بعد ۶۱۰ء آپ کی بعثت ہوئی' مکہ والوں کو جنگ روم وفارس کے متعلق خبریں پہنچتی رہتی تھیں' اسی دوران میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوئے نبوت اور اسلامی تحریک نے ان لوگوں کے لیے ان جنگی خبروں میں ایک خاص دلچسپی پیدا کردی فارس (ایران) کے آتش پرست مجوسی کو مشرکین مکہ اپنے سے نزدیک سمجھتے تھے' اور روم کے نصاریٰ اہل کتاب ہونے کی وجہ سے مسلمانوں سے قریب تر قرار پاتے تھے' اس لیے جب فارس کے غلبہ کی خبر آتی مشرکین مکہ خوش ہوتے' اس سے مسلمانوں کے مقابلہ میں اپنے غلبہ کی فال لیتے' خوش آئندہ توقعات باندھتے تھے' اور مسلمانوں کو طبعاً اس سے صدمہ ہوتا کہ عیسائی اہل کتاب آتش پرست مجوسیوں سے مغلوب ہوں' اور اس وقت ان کو مشرکین مکہ کی شماتت کا بھی ہدف بننا پڑتا تھا۔

آخر ۶۱۴ء کے بعد (جب کہ ولادت نبوی کو قمری حساب سے تقریباً پینتالیس سال ہوئے اور بعثت کے پانچ سال گزر چکے' خسرو پرویز (کی خسرو ثانی' کے عہد میں فارس نے روم کو ایک نہایت زبردست و فیصلہ کن شکست دی کہ شام' مصر' ایشیائے کوچک وغیرہ سب ممالک رومیوں کے ہاتھ سے نکل گئے' ہرقل (قیصر روم) کو ایرانی لشکر نے قسطنطنیہ میں پناہ گزین ہونے پر مجبور کردیا۔ اور رومیوں کا دارالسلطنت بھی خطرہ میں پڑ گیا' بڑے بڑے پادری قتل یا قید ہوگئے' بیت المقدس سے عیسائیوں کی سب سے زیادہ مقدس صلیب بھی ایرانی فاتحین لے گئے' قیصر روم کا اقتدار بالکل فنا ہوگیا' اور بظاہر اسباب کوئی صورت روم کے ابھرنے اور فارس کے تسلط سے نکلنے کی باقی نہ رہی۔

فارس کی فتح اور روم کی شکست کے اثرات

یہ حالات دیکھ کر مشرکین مکہ نے خوب خوشیاں منائیں' مسلمانوں کو چھیڑنا شروع کیا' بڑے بڑے حوصلوں کے ساتھ اپنے سیاسی تفوق کی توقعات قائم کرنے لگے' حتیٰ کہ بعض مشرکین نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کہا کہ آج ہمارے بھائی ایرانیوں نے تمہارے بھائی رومیوں کو مٹادیا ہے' کل ہم بھی تمہیں اسی طرح مٹا ڈالیں گے' اس وقت قرآن مجید نے سلسلۂ اسباب ظاہری کے بالکل خلاف عام اعلان کردیا کہ بیشک اس وقت رومی فارسیوں سے مغلوب ہوگئے ہیں۔ لیکن نو سال کے اندر اندر وہ پھر غالب و فاتح بن جائیں گے حضرت ابوبکر صدیق کو چونکہ وحی الٰہی پر کامل بھروسہ و یقین تھا' انہوں نے بھی بعض مشرکین سے شرط باندھ لی کہ اگر اتنی مدت کے اندر رومی غالب نہ ہوئے تو میں ایک سو اونٹ تم کو دوں گا' ورنہ اسی قدر اونٹ تم سے لوں گا۔ (اس وقت تک ایسی شرط لگانا جائز تھا) یا دارالحرب کی وجہ سے اس کی گنجائش تھی جیسا کہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک ہے پہلے یہ شرط تین سال کے لیے اور کم مقدار اونٹوں پر ہوئی تھی جب حضرت ابوبکرؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع دی تو آپ نے فرمایا کہ قرآن مجید میں بضع کا لفظ ہے' جس کا اطلاق نو تک ہوتا ہے' تو پھر یہ شرط نو سال کے لیے اور ایک سو اونٹ پر ہوئی۔

ادھر یہ معاہدہ ہو رہا تھا' ادھر ہرقل ان تمام مایوس کن و حوصلہ شکن حالات سے قطعاً بے ہراس' اور خدا کی نصرت پر بھروسہ کرکے پوری حوصلہ مندی سے زائل شدہ اقتدار کو واپس لینے کی تدابیر میں سرگرم ہوگیا' اس نے منت مانی کہ اگر خدا نے مجھ کو ایران والوں پر فتح دی تو حمص سے پیدل چل کر بیت المقدس پہنچوں گا۔

غلبۂ رُوم وشکست فارس

خدا کی قدرت دیکھو کہ قرآن مجید کی پیش گوئی کے مطابق ٹھیک نو سال کے اندر (یعنی ہجرت کا ایک سال گزرنے پر) عین بدر کے دن جب کہ مسلمان اللہ کے فضل سے مشرکین پر نمایاں فتح و نصرت ہونے کی خوشیاں منا رہے تھے۔ یہ خبر سن کر اور زیادہ مسرور ہوئے کہ رومی اہل کتاب کو خدا نے ایران کے مجوسیوں پر غالب کردیا اور مشرکین مکہ کو اپنی شکست کے ساتھ ایران کی بھی ذلت نصیب ہوئی۔

ظاہری اسباب کے بالکل خلاف قرآن مجید کی اس محیر العقول صداقت پیشگوئی کا مشاہدہ کر کے بہت سے لولوں نے اسلام قبول کیا' اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مشرکین مکہ سے ایک سو اونٹ حاصل کئے' جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق صدقہ کر دیے گئے''۔

حضرت عثمانیؒ کے مذکورہ بالا تفسیری نوٹ سے واضح ہوا کہ روم کے غلبہ و فتح کی خبر غزوۂ بدر کے موقعہ پر مل چکی تھی' پھر ۶ھ کی صلح حدیبیہ کے بعد ابو سفیان کا تجارتی قافلہ شام گیا ہے اور بیت المقدس میں ہرقل کے دربار میں جا کر وہ سب گفتگو ہوئی ہے' جو مذکورہ حدیث میں نقل ہوئی' بعض حضرات کی رائے ہے کہ صلح حدیبیہ کے سال ہی میں روم کو فارس کے مقابلہ میں فتح و غلبہ حاصل ہوا ہے' اور حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں یہ دونوں قول نقل کئے ہیں' مگر ہمارے نزدیک قوی' راجح قول وہی ہے کہ فتح روم کے اہم گوشے غزوۂ بدر ہی کے موقع پر ظاہر ہو چکے تھے' جن کے ساتھ غلبۂ فارس کا سلسلہ ختم ہو کر غلبۂ روم کا آغاز پوری گرم جوشی کے ساتھ ہو چکا تھا' مگر چونکہ پھر فتح و نصرت کا سلسلہ اور قدیم و جدید بلاد و ممالک مفتوحہ کے انتظام و استحکام کا کام بعد کے چند سالوں تک ہوتا رہا ہے تو ان سب مہمات سے پوری طرح فارغ ہو کر ہی ہرقل (قیصر روم) کو بیت المقدس حاضری کا موقعہ ملا ہوگا۔

فتوحات اسلامیہ و صلح حدیبیہ

اتنے عرصہ میں' غزوۂ بدر' غزوۂ احد' غزوۂ خندق وغیرہ میں اسلامی فتوحات داخلیہ کا سلسلہ چلتا رہا اور ۶ھ میں سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ۱۴۔۱۵ سو صحابہ کرام کے ساتھ عمرہ اور زیارت کعبہ معظمہ کی نیت سے مکہ معظمہ کا سفر فرمایا' مکہ معظمہ کے قریب پہنچے' ایک منزل ورے مقام حدیبیہ پر سب ٹھہر گئے' حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو پہلے مکہ معظمہ بھیجا اور اہل مکہ کو اطلاع دی کہ ہم سب عمرہ کے لیے آ رہے ہیں اور کوئی ارادہ نہیں ہے' کفار مکہ نے حضرت عثمان کو روک لیا' اور یہ خبر کسی طرح مشہور ہو گئی کہ ان کو قتل کر دیا گیا ہے' اس پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ببول کے درخت کے نیچے تمام صحابہ سے جہاد پر بیعت لی' جس کو بیعت رضوان کہا جاتا ہے (کیونکہ ان تمام بیعت کرنے والے صحابہ سے رضامندی کا اعلان حق تعالے نے قرآن مجید میں فرمادیا تھا) بعد کو معلوم ہوا کہ وہ خبر غلط تھی' بلکہ قریش نے سہیل بن عمرو کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں صلح کے لیے بھیجا تھا' چنانچہ دس سال کے لیے باہمی جنگ نہ کرنے کا معاہدہ ہو گیا' اس میں ایک شرط کفار کی طرف سے یہ بھی تھی کہ اس سال آپ سب حضرات اسی طرح بغیر عمرہ کے واپس ہوں اور اگلے سال پھر آ کر عمرہ کریں' حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بھی منظور فرمالیا' معاہدہ کی تحریر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کی تھی' اس میں انہوں نے من محمد رسول اللہ لکھا تو اس پر بھی کفار مکہ نے اعتراض کیا کہ اگر ہم رسول مانتے تو جھگڑا ہی کیا تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بھی قبول فرمالیا اور اپنے دست مبارک سے اس کو مٹا دیا' پھر من محمد عبداللہ لکھا گیا۔

ایک شرط یہ بھی تھی کہ مکہ معظمہ سے کوئی شخص مسلمان ہو کر مدینہ طیبہ جائے تو اس کو وہاں سے مکہ معظمہ کو واپس کر دیا جائے اور مدینہ طیبہ سے کوئی مکہ معظمہ آئے تو اس کو واپس نہ کیا جائے گا۔

صلح حدیبیہ کے فوائد و نتائج

غرض اس شان سے یہ نا جنگی معاہدہ لکھا گیا۔ جب کہ صحابہ کرام کی ڈیڑھ ہزار سرفروشوں کی جماعت جہاد و موت و عدم فرار پر بیعت کرنے کے بعد نہایت بے تاب تھی کہ آج ایک فیصلہ کن جنگ اور ہو جانی چاہیے اور وہ سب حضرات کسی طرح آمادہ نہ تھے کہ بغیر عمرہ کئے ہوئے مکہ معظمہ سے ایسی گری ہوئی شرطوں پر صلح کر کے واپس لوٹ جائیں' مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان ان سب سے بلند تھی' آپ کی نظر خدا کی مشیت' اس کی وحی و اشارہ پر تھی وہاں یہ سوال ہی نہیں تھا کہ ظاہری حالات کا تقاضہ کیا ہے اور کیوں ہے' اور آپ کی اسی شان نبوت' اولوالعزمی اور بے نظیر وسعت قلب و حوصلہ مندی کا مظاہرہ ایسے مواقع پر حق تعالیٰ کو کرانا تھا' دوسری طرف حرم کعبہ کی پاسداری تھی کہ اس کی حدود میں جدال و قتال کسی طرح موزوں نہیں' اگر اس کی رعایت خدا کا محبوب ترین پیغمبر اور افضل الرسل ہی نہ کرتا تو دوسرا کون کر سکتا تھا' اسی کے ساتھ صحابہ کرام کی بے نظیر

اطاعت شعاری کو بھی دیکھیئے کہ جوں ہی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ نے ہدی کا جانور ذبح فرما کر اور حلق راس سے احرام عمرہ ختم کیا تو تمام صحابہ نے بھی فوراً حلق وقصر کرا کر اپنے اپنے احرام کھول دیئے اور حضور کے فیصلہ سے مطمئن ہو کر مدینہ طیبہ کو الٹے پیروں واپس ہو گئے۔

فتح مبین

راستہ میں سورہ فتح نازل ہوئی جس میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے آپ کو "فتح مبین" عطا فرمائی' بعض صحابہ حیرت سے دریافت کرتے ہیں کہ کیا یہ فتح ہے؟ مطلب یہ کہ غزوہ بدر' احد وخندق وغیرہ میں فیصلہ کن شکستیں دینے والے ڈیڑھ ہزار مجاہدین حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت مبارکہ میں اتنا دور دراز کا سفر کر کے مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ تک جاتے ہیں اور قریب پہنچ کر بھی داخلہ حرم سے محروم' عمرہ کے بغیر اور بظاہر نہایت گری ہوئی شرطوں پر معاہدہ کر کے واپس ہو رہے ہیں اور اس کو حق تعالیٰ فتح مبین فرماتے ہیں' یہ کیا معاملہ ہے؟

یہ واقعہ آواخر ۶ھ کا ہے اور اوائل ۷ھ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "خیبر" کو فتح کیا' جو مدینہ کی جانب شمال وشام چار منزل پر یہودیوں کا ایک شہر تھا اور اس حملہ میں کوئی شخص ان صحابہ کے سوا شریک نہ تھا' جو آپ کے ساتھ حدیبیہ میں تھے' پھر ۷ھ میں آپ نے حسب معاہدہ عمرۃ القضاۃ کے لیے مکہ معظمہ کا سفر فرمایا' اور امن وامان کے ساتھ مکہ معظمہ پہنچ کر عمرہ ادا فرمایا۔ اس کے بعد قریش نے نقض عہد کیا اس طرح کہ قریش نے اپنے حلیفوں کا ساتھ دینے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیفوں پر حملہ کر دیا۔ جس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اعلان فرمایا کہ معاہدہ ختم ہو گیا اور دس ہزار مجاہدین صحابہ کو لے کر ۸ھ میں مکہ معظمہ کو فتح کر لیا۔

فتح مکہ معظمہ کے حالات

جس رات میں آپ فاتحانہ مکہ معظمہ میں داخل ہونے والے تھے' ابوسفیان' حکیم بن حزام اور بدیل بن ورقہ اسلامی لشکر کے تجسس حال کے لیے نکلے' اور جہاں لشکر اسلام کا پڑاؤ تھا' اس کے قریب ایک ٹیلہ پر بیٹھ کر حالات کا جائزہ لینے لگے' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے ارشاد فرمایا کہ "سب لوگ اپنے چولہے الگ الگ جلائیں۔" (جس سے دشمن کے جاسوسوں کی نظر میں لشکر اسلام کی تعداد زیادہ معلوم ہو' دوسری طرف حضرت عباس رضی اللہ عنہ ایسے جاسوسوں کی خبر گیری کرتے ہوئے پھر رہے تھے' اور ابوسفیان کو گرفتار کر کے حضور کی خدمت میں لے گئے' نقل ہے کہ آپ نے ابوسفیان کا دامن جھٹک کر ارشاد فرمایا "کیا تم اب بھی ایمان نہیں لاؤ گے"؟ یہ سن کر ابوسفیان کلمہ پڑھ کر داخل اسلام ہو گئے۔

حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ ابوسفیان کو لے کر فلانی گھاٹی پر کھڑے ہو جاؤ' اور مسلمانوں کو حکم دیا کہ سب قبائل کے لوگ حربی ترانے پڑھتے ہوئے' اس گھاٹی سے گزریں' چنانچہ آپ کے حکم کی تعمیل کی گئی۔

سیاسی تدابیر کے فوائد

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کی سیاسی تدابیر اس لیے اختیار فرمائیں کہ اہل مکہ مرعوب ہو کر خود ہی ہتھیار ڈال دیں اور مکہ معظمہ کے اندر جدال وقتال کی نوبت نہ آئے' سب سے آخر میں جب مہاجرین کا گروہ اس گھاٹی سے گزرنے لگا' جس میں خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی شامل تھے' تو آپ نے فرمایا۔ اے ابوسفیان! ہم تمہارا اکرام کرتے ہیں اور اعلان کر دیا کہ جو شخص ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے گا' اس کو امن دیا گیا' جو شخص اپنے گھر کا دروازہ بند کر کے بیٹھ جائے گا' اس کو امن ہے' جو شخص بیت اللہ کے جوار میں پہنچ جائے گا' اس کو امن دیا گیا' جو شخص اپنا ہتھیار رکھ دے گا اس کو بھی ہم نے امن دیا۔

ابوسفیان پر مکارم اخلاق کا اثر

حضرت ابوسفیان جو غزوہ احد وغزوہ خندق میں لشکر کفار کے سپہ سالار اعظم رہے تھے اور ہمیشہ مسلمانوں کی بدخواہی میں پیش پیش رہا

کرتے تھے‘ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس برتاؤ پر سخت حیرت زدہ تھے‘ اور ان کے دل میں اسلام کی حقانیت وصداقت اترتی جارہی تھی‘ مگر ان کی بیوی ہندہ ان کے مسلمان ہونے پر سخت برہم ہوئی اور خوب لڑی حتیٰ کہ ان کے منہ پر تھوک بھی دیا‘ وہ مسلمانوں کی سخت ترین دشمن تھی اور اس قدر سخت دل کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نہایت شفیق چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا کلیجہ چبا ڈالا تھا۔

اسلامی حکومت رحمت عالم تھی

غرض یہاں اس مختصر تاریخ کے ذکر سے یہ دکھلانا تھا کہ بعثت نبوی سے قبل دنیا کی دو بڑی سلطنتوں کا اقتدار اعلیٰ تھا‘ بعثت نبوی کی برکات سے پہلے روم کی فتوحات بالکل غیر متوقع طرز پر ہوئیں‘ جن سے فارس (ایران) کی شہنشاہی‘ سامراجی واجارہ داری کا خاتمہ ہوا اور آدھی دنیا کو ظلم وقہر سے نجات ملی‘ پھر روم (اہل کتاب) کے جبر وستم اور استعماری ہتھکنڈوں سے نجات دلائی‘ باقی آدھی دنیا کو اسلام کے دامن رحمت میں پناہ گزیں کیا گیا۔ اور اسلام نے پوری دنیا کو وہ دستور وقانون دے دیا جس کے مطابق زندگی گذار کر اس جہنم صفت دنیا کو نمونہ جنت بنایا جاسکتا ہے۔

اسلام کمزوروں‘ غریبوں‘ ناداروں‘ اور متواضع ومنکر مزاج لوگوں میں پھیلا‘ اس نے عدل وانصاف‘ رواداری ومساوات‘ رحم وکرم ادب و تہذیب‘ خدا ترسی‘ نصرت مظلوم‘ اعانت فقیر ومعذور‘ راست بازی وحق گوئی کی اعلیٰ قدریں سکھائیں‘ تمام اخلاقی وسیاسی گراوٹوں سے نفرت دلائی‘ صبر واستقلال‘ شکر واحسان مندی‘ ہر بھلائی پر تعاون‘ ہر برائی کے خلاف جہاد کرنے کی تلقین کی‘ غرض تمام مکارم اخلاق اور حکمت ودانائی کی بات کو اختیار کرنا ایک مسلمان کا شیوہ وشعار قرار دیا۔

اسی لیے اسلام کا ابتدائی دور یعنی بعثت نبوی سے ہجرت نبوی تک کے ۱۳ سال جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے لیے بظاہر سخت ترین دور ابتلاء وپریشانی تھا‘ وہ ان کی فتح وکامرانی کا زریں باب تھا‘ جس میں لغزش کے امکانات بہت کم تھے‘ ہجرت کے بعد جب دنیاوی فتوحات کے دروازے کھلے تھے تو ان کو ہر قدم احتیاط سے اٹھانا پڑا اور پہلے سے زیادہ آزمائش سامنے تھی مگر مکی دور اگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض تربیت سے مکارم اخلاق واعلیٰ کردار کی بلندیوں کی فتح تھی‘ تو مدنی دور آپ کے صدقہ میں ان کی فتح مبین قرار پائی۔ وذلک من فضل اللہ علینا و علی الناس۔

حدیث ہرقل

اب حدیث ہرقل کی طرف آجائیے! ہرقل علم نجوم کا بہت بڑا ماہر تھا‘ لکھتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے سال علوی ستاروں کا اجتماع ہوا تھا‘ اور پھر ہر بیس سال پر ہوتا رہا‘ آخری بار صلح حدیبیہ کے سال میں ہوا‘ علم نجوم والے کہتے ہیں[1] کہ اس اجتماع سے عالم میں بڑے بڑے تغیرات رونما ہوتے ہیں۔ واللہ اعلم۔ ہرقل بھی اسی کا قائل تھا‘ اس نے ایک رات زائچہ کھینچ کر دیکھا تھا کہ ختنہ کرانے والے لوگوں کے بادشاہ کا غلبہ ہوگیا۔ اس کے بارے میں اس نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ عرب کے لوگ ختنہ کراتے ہیں‘ اور اس سے اس کو غلبۂ ظن ہوگیا کہ وہ بادشاہ عرب ہی کا ہوگا۔ مزید اطمینان کے لیے اپنے دوست ضغاطر کو خط لکھا وہ بھی علم نجوم کا بڑا ماہر تھا‘ اور اس نے بھی ہرقل کی تائید کی‘ بلکہ اپنی قوم کو جمع کرکے سمجھایا بھی کہ تم لوگ نبی آخر الزماں پر ایمان لے آؤ وہ سچے نبی ہیں لیکن انہوں نے انکار کیا اور ضغاطر کو قتل کر ڈالا۔ پھر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نامۂ مبارک ہرقل کو پہنچا تو بحیثیت نبوت ورسالت آپ کے حالات کی تحقیق ابوسفیان سے کی۔

---

[1] ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے درس بخاری شریف میں فرمایا کہ نجوم کے اثرات طبعیہ حرارت و برودت وغیرہ ناقابل انکار ہیں لیکن جمہور علماء ان کی تاثیرات سعد ونحس کے قائل نہیں۔

ایمان ہرقل

امام بخاری نے حدیث کے آخری جملہ میں اشارہ کیا ہے کہ ہرقل ایمان وتصدیق کی نعمت سے محروم رہا اور جو کچھ اس نے رومیوں سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اچھے خیالات کا اظہار کیا تھا' وہ صرف معرفت کے درجے میں تھا' تصدیق قلبی نہ تھی' جو شرط ایمان ہے۔اسی لیے اس نے خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ کے لیے غزوۂ موتہ میں ایک لاکھ فوج بھیجی' اور آپ کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں بھی برابر مسلمانوں پر حملے کرتا رہا۔

مکاتیب رسالت

کتب سیر وتاریخ میں ہے کہ سرور دو عالم سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے قیصر وکسریٰ کے علاوہ شاہان حبش مصر' ہند و چین وغیرہ کو بھی دعوت اسلام کے مکاتیب ارسال فرمائے تھے' سب میں آپ نے اپنا نام پہلے لکھا ہے' جس کا اثر دوسرے شاہان دنیا نے تو کچھ نہیں لیا مگر پرویز (شہنشاہ ایران) کو سخت ناگوار ہوا کہ شروع میں میرا نام کیوں نہیں لکھا گیا' اور طیش میں آکر آپ کا گرامی نامہ پھاڑ کر پرزہ پرزہ کر دیا۔

زوال کسریٰ وعروج حکومت اسلام

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس کی اطلاع ملی تو فرمایا کہ "اس کے بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے چنانچہ ظاہری اسباب میں یہ صورت ہوئی کہ شیرویہ اپنے باپ پرویز (شہنشاہ ایران) کی بیوی شیریں پر عاشق ہو گیا (جو اس کی سوتیلی ماں تھی) اور جب کسی طرح وہ اس کو رام نہ کر سکا تو باپ کو قتل کر دیا کہ شاید اس کے بعد وہ حاصل ہو سکے۔نہ معلوم کس وجہ سے خسرو پرویز نے اپنے شاہی دواخانہ کی الماری میں ایک ڈبیہ میں زہر رکھا تھا اور اس کے لیبل پر لکھ دیا تھا کہ یہ دوا قوت باہ کے لیے اکسیر ہے' شیرویہ مالک سلطنت ہوا تو چونکہ انتہائی شہوت پرست تھا' اس کو ایسی ادویہ کی تلاش تھی' اس ڈبیہ کو پا کر بہت خوش ہوا اور زہر کھا کر مر گیا' اس کے بعد اس کی بیٹی بوران تخت نشین ہوئی' مگر وہ عورت ذات اور کم عمر تھی' اس لیے حکومت نہ سنبھال سکی' آخر کار ایران کے تخت وتاج پر مسلمان قابض ہوئے۔اور اب تک وہ ایک اسلامی سلطنت ہے۔ **حفظها الله وادامها**۔اس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی کے مطابق کسریٰ کی حکومت اور اس کا خاندان صرف ۱۴سال کے اندر تباہ ہو گیا۔ **و تلک الایام نداولها بین الناس**۔

حدیث میں ذکر شدہ ہرقل کے دس سوالات ذکر ہوئے' جو مبادئ وحی الٰہی اور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت کا بین ثبوت ہیں لہٰذا اس حدیث سے وحی ورسالت کی عصمت وعظمت معلوم ہوئی' امام بخاری کا مقصد بھی یہی ہے اور ان چھ حدیثوں کا بدا الوحی کے باب میں ذکر کر کے امام بخاریؒ نے یہ بھی سمجھایا ہے کہ آگے کتاب میں جتنی باتیں آئیں گی وہ سب وحی کی باتیں ہیں' جو معصوم ومحفوظ اور نہایت عظیم الشان ہیں' اس کے بعد سب سے پہلے کتاب الایمان لائے ہیں کہ وہ اسلامیات کی اولین بنیاد ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کتاب الایمان

باب الایمان و قول النبی صلی اللہ علیه وسلم بنی الاسلام علی خمس وھوقول وفعل ویزید وینقص قال اللہ تعالیٰ لیزدادوا ایماناً مع ایمانھم. وزدناھم ھدیً. ویزیداللہ الذین اھتدواھدی. والذین اھتدوازادھم ھدی واتاھم تقواھم ویزدادالذین اٰمنوا ایماناً وقوله عزوجل ایکم زادته ھذہ ایماناً فاماالذین اٰمنوا فزادتھم ایماناً وقوله فاخشوھم فزادھم ایماناً وقوله ومازادھم الا ایماناًوتسلیماً والحب فی اللہ والبغض فی اللہ من الایمان وکتب عمر بن عبدالعزیز الیٰ عدی بن عدی ان للایمان فرآئض وشرآئع وحدوداًوسنناً فمن استکملھا استکمل الایمان ومن لم یستکملھالم یستکمل الایمان فان اعش فسابینھا لکم حتیٰ تعملوا بھا وان امت فمآ اناعلیٰ صحبتکم بحریص وقال ابراھیم علیه السلام ولکن لیطمئن قلبی وقال معاذ اجلس بنانؤمن ساعة وقال ابن مسعود الیقین الایمان کله وقال ابن عمر لایبلغ العبد حقیقت التقویٰ حتیٰ یدع ماحاک فی الصدر وقال مجاھد شرع لکم من الدین ما وصی به نوحاً اوصیناک یامحمد وایاہ دیناً واحدًا وقال ابن عباس شرعة ومنھا جاً سبیلا وسنةً ودعاء کم ایمانکم.

ترجمہ:۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے اور اس بات کا بیان کہ اسلام قول بھی ہے اور فعل بھی اور وہ بڑھتا بھی ہے اور گھٹتا بھی ہے' اللہ تعالیٰ نے قرآن میں متعدد جگہ ارشاد فرمایا ہے ترجمہ آیات تا کہ مومنین کے (پہلے) ایمان پر ایمان کی اور زیادتی ہو اور ہم نے ان کو اور زیادہ ہدایت دی اور جو لوگ ہدایت یافتہ ہیں اللہ انہیں مزید ہدایت عطا کرتا ہے اور جو لوگ سیدھی راہ پر ہیں انہیں اللہ نے اور زیادہ ہدایت دے دی اور پرہیزگاری عنایت کی اور حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ تم میں سے کس کے ایمان کو اس سورۃ نے بڑھا دیا (یہ وہ لوگ ہیں) جو ایمان لائے اس سورت نے ان کے یقین میں اضافہ کر دیا (سورہ آل عمران میں ہے) جب انہیں ڈرایا تو ان کا ایمان اور بڑھ گیا' اور (سورہ احزاب میں ہے) ان کے یقین و اطاعت ہی میں اضافہ ہوا اور اللہ کے لئے دوستی اور دشمنی ایمان ہی میں ہیں اور عمر بن عبدالعزیزؒ نے عدی بن عدی کو لکھا تھا کہ ایمان کے کچھ فرائض کچھ ضابطے کچھ حدیں اور کچھ سنن ہیں (یعنی ایمان کے لوازمات میں کچھ اوامر کچھ نواہی' اور کچھ سنتیں داخل ہیں) پھر جس نے ان چیزوں کی تکمیل کر لی اس نے ایمان کامل کر لیا اور جس نے ان میں کوتاہی کی' اس نے نامکمل رکھا اور اگر میں زندہ رہا تو میں ان سب کو تم سے کھول کر بیان کروں گا تا کہ تم ان پر عمل پیرا ہو سکو اور اگر میں مر گیا تو (پھر واقعہ یہ ہے کہ) میں تمہاری ہم نشینی کا خواہاں نہیں ہوں۔ اور ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا (سورہ بقرہ میں) لیکن (اس لئے کہ) میرے دل کو اطمینان حاصل ہو اور حضرت معاذ بن جبلؓ نے (اسود بن ہلال سے) فرمایا کہ ہمارے پاس بیٹھو (تا کہ) کچھ دیر ہم مومن رہیں (یعنی ایمان تازہ کریں)

حضرت ابن مسعودؓ کا ارشاد ہے "یقین پورا کا پورا ایمان ہے" اور حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا ہے کہ بندہ اس وقت تک تقویٰ کی حقیقت نہیں پا سکتا جب تک دل کی کھٹک (یعنی شرک و بدعت کے شبہات) کو دور نہ کردے اور حضرت مجاہدؒ نے اس آیت کی تفسیر میں) کہ تمہارے لئے وہی دین ہے جس کی تعلیم ہم نے نوح کو دی ہے" کہا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اے محمد! ہم نے تمہیں اور نوح کو ایک ہی دین کی تعلیم دی ہے اور حضرت ابن عباسؓ نے **شرعۃً** و **منھاجاً** کا مطلب راستہ اور طریقہ بتلایا ہے اور قرآن کی اس آیت **قل ما یعبؤا بکم ربی لولا دعاؤکم** کا مطلب بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ) تمہاری دعا سے مراد تمہارا ایمان ہے۔

تشریح: "ایمان" کا لفظ "امن" سے مشتق ہے جس کے معنی سکون و اطمینان کے ہیں، کسی کی بات پر ایمان لانا بھی یہی ہوتا ہے کہ ہم اس کو اپنی تکذیب سے مطمئن کردیتے ہیں گویا اس کی امانت و دیانت پر ہمیں پورا وثوق و اعتماد حاصل ہے۔ یہاں تک کہ اگر وہ ہماری ان دیکھی چیزوں کے بارے میں بھی کچھ بتلائے تو ہم اس کے اعتماد پر اس کو مان لیں۔

ایمان شرعی: اسی سے "ایمان شرعی" کی اصطلاح حاصل ہوئی کہ ہم خدا کے وجود و وحدانیت کی تصدیق کریں اور خدا کے آخری نبی کی تصدیق کے ساتھ ان سب باتوں کے بھی حق ہونے کا یقین کریں جو آپ کے ذریعہ ہم تک ضروری طور سے پہنچ گئیں۔ ضروری طور سے پہنچنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کا "دین محمدی" میں ہونا سب پر روشن و واضح ہو، مثلاً وجود انبیاء، کتب سماوی، ملائکہ، جن، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتم النبیین (آخری نبی) ہونا، تقدیر خداوندی، عذاب قبر، قیام قیامت، فرضیت نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ، وغیرہ، غرض ایسی تمام چیزوں پر ایمان ضروری ہے جن کا علم ضروری ہم کو حاصل ہوچکا ہے اسی لئے ان کو "ضروریات دین" بھی کہا جاتا ہے اور ان میں سے کسی ایک کا بھی انکار یا تحریفی تاویل اسی طرح کفر ہوگی جس طرح توحید و رسالت کا انکار یا ان میں تحریفی تاویل کفر ہے۔

ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنی محققانہ تصنیف "اکفار الملحدین فی شیئ من ضروریات الدین" میں ضروریات دین اور ایمان و کفر کی بحث کا حق ادا فرما دیا ہے، جس کا مطالعہ ہر عالم دین کے لئے نہایت ضروری ہے۔

حقیقت ایمان

ایمان کی تعریف میں عام طور سے تصدیق کا لفظ آتا ہے جو اصطلاح حکما میں اذعان و یقین کا ہم معنی ہے پھر یہ اختلاف ہوا ہے کہ تصدیق علم و ادراک ہے یا لواحق علم میں سے ہے، تحقیقی بات یہ ہے کہ تصدیق محض علم نہیں ہے (جو اختیاری و غیر اختیاری دونوں کو عام ہے) بلکہ تصدیق لواحق علم سے اور ایک ارادی چیز ہے یعنی جاننا نہیں بلکہ جاننے کے ساتھ مان بھی لینا جیسا کہ ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ کی تحقیق ہے ورنہ فرعون، ابولہب، ابو طالب، ہرقل وغیرہ بھی مومن ہوتے، کیونکہ علم کی حد تک ان کو بھی صداقت رسول پر یقین تھا حالانکہ ان سب کے کفر پر امت کا اتفاق ہے۔

غرض تصدیق بمعنی عرفی کافی نہیں، بلکہ ماننا ضروری ہے، جس کے لازمی اثرات انقیاد قلبی و التزام طاعت ہیں اور جو عہد و میثاق اطاعت و وفاداری کے ہم معنی ہے، یہ علم تصدیقی ایسی صفت نفس بن جانی چاہئے کہ قلب اور قلب کے ماتحت لسان و جوارح سب ہی سر انقیاد جھکا دیں۔ اس کی تعبیر بعض ضعیف الاسناد روایات اور عبارات سلف میں عقد بالقلب سے بھی منقول ہے کیونکہ دل میں مضبوطی کے ساتھ گرہ باندھنے کا یہی مطلب ہوسکتا ہے اور اسی لئے ایمان کو عقیدہ سے بھی تعبیر کرتے ہیں اگر زبان و جوارح تصدیق قلبی کی موافقت نہیں کرتے تو اس کو عقدہ و عقیدہ کیونکر کہہ سکتے ہیں؟

ایمان واسلام کا فرق

یہاں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہئے کہ جس طرح ایمان انقیاد باطن کا نام ہے اسی طرح اسلام انقیاد ظاہر سے عبارت ہے۔ سورہ حجرات میں ہے۔

قالت الاعراب امنا قل لم تومنوا ولکن قولوا اسلمنا ولما یدخل الایمان فی قلوبکم۔

(کچھ دیہاتی لوگ آپ سے کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں' آپ فرما دیجئے کہ ابھی تم ایمان نہیں لائے ہاں یہ کہو کہ اسلام لے آئے' اور ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں نہیں پہنچا''۔ امام احمدؒ سے ایک مرفوع حدیث بھی تفسیر ابن کثیر میں مروی ہے کہ اسلام علانیہ کھلی ہوئی چیز ہے اور ایمان قلب میں ہے اور مشہور حدیث جبریل میں بھی ایمان کے سوال پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے' خدا' ملائکہ' کتب' رسل' یوم آخر اور قدر خیر وشر پر ایمان وتصدیق کا ذکر فرمایا' پھر اسلام کے سوال پر شہادت توحید ورسالت اور ادائیگی فرائض اربعہ کا ذکر فرمایا۔

ایمان واعمال کا رابطہ

لہٰذا محققین نے فیصلہ کیا کہ ایمان وعقیدہ دین کی اصل بنیاد ہے اور اعمال جوارح اس کی فروع اور شاخیں ہیں یا ایمان بمنزلہ روح ہے اور اسلام اس کا بدن' یا ایمان حقیقت ہے اور اسلام اس کی صورت یہ ہمارے آئمہ محدثین کی تعبیر ہے' دوسرے ائمہ ومحدثین نے اعمال جوارح کو اجزاء مکملہ ایمان کے درجہ میں سمجھا ہے جس سے اعمال کا درجہ کچھ اوپر ہو جاتا ہے اور ایمان کا درجہ کچھ کمتر ہو جاتا ہے'' جیسا کہ تکمیل کی تعبیر سے واضح ہے اس لئے ہماری تعبیر زیادہ بہتر صحیح' احوط اور حقیقت سے قریب تر ہے۔ والعلم عنداللہ۔

ایمان کا درجہ

یہاں سے یہ بات بھی سمجھنی چاہئے کہ دین اسلام میں ایمان کا درجہ اتنا اونچا ہے جس سے خدا کی وحی اور پیغمبر پر اس درجہ وثوق واعتماد ہو کہ اس کی بتائی ہوئی مغیبات اور نظروں سے غائب چیزوں پر بھی ہمیں بے دلیل وحجت یقین واطمینان حاصل ہونا چاہئے اسی لئے مسلمانوں کی بڑی صفت یومنون بالغیب قرار پائی اور حقیقت بھی یہی ہے کہ رسالت کی مکمل تصدیق اور انقیاد باطن حاصل ہو جانے کے بعد دلیل وحجت بازی کا کوئی موقعہ باقی نہیں رہتا' چنانچہ اشاعرہ اور امام ابو منصورہ ماتریدی نے بھی تصریح کی ہے کہ ایمان اسی بے دلیل انقیاد واطاعت کا نام ہے۔

حضرت نانوتویؒ کی تحقیق

ایمان کی تشریح ہی کے سلسلہ میں یہاں ایک نہایت قابل قدر اور آب زر سے لکھنے کے قابل تحقیق' ہمارے شیخ الشیوخ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کی ہے جو آب حیات میں پوری تفصیل سے درج ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ آیت قرآنی النبی اولیٰ بالمومنین من انفسهم وازواجه امهاتهم میں ازواج مطہرات کا امہات المومنین والمومنات ہونا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ابوت کی فرع ہے' بلکہ ایک قرات میں وهو اب لهم بھی وارد ہے' لہٰذا یہ دعوے درست ہوگا کہ ارواح مومنین آپ کی روح مقدس کے آثار ہیں' اس طور سے آپ ابو المومنین یعنی تمام مومنین کے روحانی باپ ہیں' گویا مومنین کے اجزاء ایمانیہ کا روحانی وجود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم (ارواحنا فداہ) کی روح معظم کے وجود ایمانی کا فیض ہے اور یہ اتنی بڑی نعمت ومنقبت عظیمہ ہے کہ ہر مومن ومسلم بریں مژدہ گر جاں فشاند رواست۔

حضرت مجدد صاحبؒ کی تحقیق

اس سے اوپر چلئے تو حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہ کے مکاتیب شریفہ میں سرور دو عالم نبی الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات محبوب رب العلمین۔ حقیقۃ الحقائق افضل الخلائق۔ نور الانوار روح الارواح منبع البرکات ومجمع الکمالات کی شان میں جلوہ گر ملے گی۔ اس سے بھی یہی مستفاد ہوا کہ اللہ نور السموت والارض کے نور عظیم کا ظل وپرتو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نور معظم ہے' جس سے تمام عالم وعالمیان نے اکتساب نور کیا اور نور ایمان تو روح الانوار و مدار بقاء عالم ہے۔

شیخ دباغ کے ارشادات

اسی کے ساتھ چند ارشادات غوث العارفین حضرت شیخ عبدالعزیز دباغ قدس سرہ کے بھی "ابریز" سے نقل کئے جاتے ہیں فرمایا کہ (بقاو وجود کا) مادہ ساری مخلوق کی طرف ذات محمدی سے نور کے ذروں میں چلا ہے کہ نور محمدی سے نکل کر انبیاء ملائکہ اور دیگر مخلوقات تک جا پہنچا ہے اور اہل کشف کو اس استفاضہ نور سے عجائب و غرائب کا مشاہدہ ہوتا ہے حق تعالیٰ نے نور ایمان بلکہ ہر نعمت کے نور کو نور محمدی کے ساتھ وابستہ کیا ہے جہاں یہ تعلق عیاذاً باللہ قطع ہوا فوراً ہی نور ایمان سلب ہوا۔ سامعین میں سے ایک بدنصیب شکی مزاج نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے صرف ایمان کی رہبری ہوئی ہے کہ حق کا راستہ دکھا دیا باقی رہا ایمان سو وہ اللہ کی طرف سے ہے (ذات محمدی کو اس سے کوئی تعلق نہیں) شیخ موصوف نے فرمایا اچھا اس تعلق کو جو تمہارے نور ایمان اور نور محمدی میں قائم ہے اگر ہم قطع کر دیں اور محض راستہ دکھانا جو تم کہہ رہے ہو باقی رہنے دیں تو کیا تم اس پر راضی ہو؟ اس نے کہا ہاں! میں اس پر راضی ہوں ابھی بات ختم نہ کرنے پایا تھا کہ صلیب کو سجدہ کیا اور اللہ ورسول کا انکار کیا اور اسی پر دم نکل گیا۔

اس ارشاد کی روشنی میں معلوم ہوا کہ قلوب مومنین میں ایمانوں کی مثال چراغوں کی ہے جو سب چراغ رسالت سے روشن و مستفید ہیں یا اس طرح سمجھو کہ ہر قلب مومن میں نور نبوت کا ایک ایک روحانی برقی قمقمہ روشن ہے جس کے تار حقیقۃ الحقائق نبی الانبیاء نور الانوار صلی اللہ علیہ وسلم کے نور معظم سے وابستہ ہیں اور تمام روحانی انوار و کمالات کا فیضان اسی مرکز انوار سے ہو رہا ہے اگر اس کنکشن یا تعلق میں کسی طرح کی کمی یا خرابی رونما ہوگی تو وہ بڑی محرومی و خسران کا موجب ہوگی۔

بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست　　اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است

حدیث صحیح میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری امت[1] کے ۷۳ فرقے ہو جائیں گے جن میں سے ۷۲ غلط راستوں پر ہوں گے اور صرف ایک فرقہ ناجی ہوگا صحابہ نے عرض کیا وہ کون سا ہوگا فرمایا جو ٹھیک میرے اور میرے صحابہ کے طریقہ پر چلے گا۔ اس لئے بڑی ہی احتیاط اور علم و فہم صحیح سے کام لینے کی ضرورت ہے کہ ہمارا کنکشن آپ کی سنت و اسوہ سے ہٹ کر دوسرے غلط مراکز شرک و بدعت وغیرہ سے نہ جڑ جائے۔ **وما تو فیقنا الا باللہ العلی العظیم علیہ تو کلنا والیہ انبنا۔**

نیز فرمایا کہ ایمان ایک نور ہے جس کی روشنی میں چلنے والے کو راستہ کا نشیب و فراز اور منزل مقصود کا مبدا و منتہا سب نظر آ رہا ہے اس لئے اس کا ہر قدم دلی اطمینان کے ساتھ اٹھتا اور قلبی سکون کے ساتھ پڑتا ہے۔ لہٰذا اس کا پورا سفر لطف و بشاشت کا ہے اور اس کی زندگی پر لطف گزرتی ہے جس کو "ولنحیینہ حیوٰۃ طیبۃ" میں بیان فرمایا ہے اس کے برخلاف کفر ایک ظلمت ہے جس کی تاریکی میں چلنے والے کی حالت اندھے کی

---

[1] شرح مواقف کے آخر میں ان سب فرقوں کی تفصیلات ذکر کی گئی ہیں جن میں سے ۸ بڑے فرقوں کے نام مختصر عقائد درج ذیل ہیں۔

۱- معتزلہ وقدریہ جن میں اختلاف ہو کر بیس شاخیں ہو گئیں (مرتکب کبیرہ ایمان سے خارج، مخلد فی النار ہے قرآن کلام اللہ مخلوق ہے بندہ اپنے افعال کا خود خالق ہے آخرت میں بھی رویت الٰہیہ نہ ہوگی حسن و قبح عقلی ہے وغیرہ)۔

۲- شیعہ جن میں اختلاف ہو کر بائیس شاخیں ہو گئیں (ان کے عقائد مشہور خاص و عام ہیں)

۳- خوارج جن میں اختلاف ہو کر سات شاخیں ہو گئیں (مرتکب کبیرہ کافر مخلد فی النار ہے حضرت علی عثمان و اکثر صحابہ کی تکفیر وغیرہ)

۴- مرجئہ جن میں اختلاف ہو کر پانچ شاخیں ہو گئیں (ایمان کے ساتھ کوئی معصیت مضر نہیں اختیار عبد کے منکر ہیں)

۵- جازجیہ جن میں اختلاف ہو کر تین شاخیں ہو گئیں (خلق افعال میں اہل سنت کے ساتھ نفی صفات وغیرہ میں معتزلہ کے ساتھ ہیں)

۶- جبریہ جن میں اختلاف ہو کر چار شاخیں ہو گئیں (بندہ اپنے افعال میں مجبور محض ہے نفی رویت و خلق قرآن میں معتزلہ کے ساتھ ہیں)

۷- مشبہ جن میں اختلاف ہو کر گیارہ شاخیں ہو گئیں (حق تعالیٰ کو مخلوقات کے ساتھ تشبیہ دیتے اور اس کے لئے جہت و جسم وغیرہ ثابت کرتے ہیں)

۸- ناجیہ (اہل سنت والجماعت یا جماعت اہل حق) جو سواد اعظم امت محمدیہ کا ہے۔ وللہ الحمد۔

سی ہے کہ نہ اس کو سرائے کا پتہ ہے نہ منزل مقصود کا' نہ اسے دریا کا علم ہے نہ جنگل کا بہ اقتضائے حرارت غریزیہ انجن کے پہیوں کی طرح چلتا اور بے اختیار چکر کھارہا ہے اس کے قلب پر ہروقت تکدر اور وساوس وخطرات کا بوجھ رہتا ہے' جس سے اس کی زندگی باوجود دولت وعیش دنیوی وبال جان بنی رہتی ہے اسی کو حق تعالیٰ نے فرمایا و من اعرض عن ذکری فان له معیشة ضنکا و نحشره یوم القیامة اعمیٰ

بخاریؒ کا ترجمۃ الباب

یہاں تک ہم نے بقدر ضرورت ایمان کی تشریح وتوضیح کی۔ اس کے بعد امام بخاریؒ کے ترجمۃ الباب کو سمجھئے امام بخاری چونکہ ایمان کو قول وفعل سے مرکب مانتے ہیں اور اسی لئے اس میں زیادتی وکمی کے بھی قائل ہیں اسی لئے ایسی آیات' احادیث واقوال عنوان باب ہی میں جمع کردیئے ہیں جن سے یہ دونوں دعوے ثابت ہوسکیں اس کے بعد بڑی تقطیع کے آٹھ صفحات میں بہت سے ابواب اور ان کے جلی عنوانات کے تحت احادیث کی تخریج فرما کر اپنے اسی دعوے کو پختہ کرتے چلے گئے ہیں۔

امام بخاریؒ کی شدت

عنوانات کی یک جہتی شدت اور دلائل کی کثرت سے یہی تاثر ملتا ہے کہ جب یہ سب اعمال ظاہری جزو حقیقت ایمان ہیں تو کسی عمل میں بھی کمی آجانے سے ایمان جاتا رہے گا' جو معتزلہ کا مذہب ہے یا حکم کفر بھی عائد ہوجائے گا' جو خوارج کا مسلک ہے پھر خارج سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری ایمان کو قول وفعل کا مجموعہ ماننے پر سخت مصر تھے فرماتے تھے کہ میں نے اپنی صحیح میں کسی ایسے شخص کی روایت نہیں لی جو کہتا ہے کہ ''ایمان قول وعمل سے مرکب نہیں اور اس میں کمی وزیادتی نہیں ہوتی''۔ حالانکہ امام موصوف نے غالی خوارج تک سے بھی احادیث کی روایات لی ہیں تاہم ہم اس کو امام بخاری کا تشدد ہی سمجھتے ہیں' ورنہ مذہب اعتزال یا مسلک خوارج کے وہ بھی ایسے ہی مخالف تھے جیسے دوسرے تمام اہل سنت والجماعت یہی وجہ ہے کہ خود امام بخاری نے بھی گو یہاں پہلے پارے میں تو عمل کو جزو ایمان دکھلانے پر پورا زور لگایا حتیٰ کہ ایک باب کفر دون کفر کا بھی قائم کیا اور کوئی اعتدال کی صورت نہیں اختیار کی' مگر ۲۷ویں پارہ میں پہنچ کر ''باب مایکره من لعن شارب الخمر'' قائم کیا' جس کا حاصل یہ ہے کہ عقیدہ درست ہو تو کبیرہ گناہوں شرب خمر وغیرہ کے ارتکاب سے بھی ملت سے خارج نہ ہوگا اور اس پر لعنت نہ کرنی چاہئے معلوم ہوا کہ اس مسئلہ میں امام بخاری کا اس قدر تشدد بے محل ہے اور اگر احناف سے تکدر یا جذبہ مخالفت کے تحت ہے تو آپ کی جلالت قدر کے بھی خلاف ہے' خصوصاً جب کہ اہل حق کے دونوں مسلک میں زیادہ فرق بھی نہیں ہے بلکہ بہت سے لوگوں نے تو اس اختلاف کو صرف نزاع لفظی بھی کہا ہے اگرچہ وہ خلاف تحقیق ہے اور ہمارے حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کی رائے بھی یہ ہے کہ دونوں کے نظریات جدا جدا ہیں۔ جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

بحث ونظر: ایمان کے بارے میں مختلف مذاہب ونظریات کی تنقیح وتفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ حضرت امام اعظم' شیخ ابومنصور ماتریدی' شیخ ابوالحسن اشعری' امام نسفی' محدثین وفقہا احناف اور اکثر متکلمین فرماتے ہیں کہ۔

ایمان بسیط ہے' جس کی حقیقت تصدیق قلبی ہے' تصدیق لسانی (نفاذ احکام اسلامی کے لئے یا بوقت مطالبہ) شرط یا رکن زائد ہے اعمال جوارح خلود نار سے بچنے کے واسطے' نیز ترقی ایمان ودخول اولی جنت کے لئے ضروری ہیں' ان کی حیثیت وہ ہے جو فروع کی اصل کے ساتھ ہوتی ہے' مثل کلمة طیبة کشجرة طیبة اصلها ثابت و فرعها فی السماء اور حدیث شعب ایمان بھی بظاہر اسی طرف مشیر ہے' تصدیق لسانی کو شرط متکلمین نے اور رکن زائد فقہا حنفیہ نے کہا ہے' ملا علی قاری حنفیؒ کا قول ہے کہ عندالمطالبہ رکن ہے اجراء احکام کے لئے شرط مسایرہ میں ہے کہ اقرار بالشہادتین کو رکن ایمان قرار دینا زیادہ احوط ہے بہ نسبت شرط ماننے کے' اقرار شہادت اور التزام طاعت کی قید سے

ابو طالب اور ہرقل جیسے لوگوں کا ایمان، ایمان شرعی سے خارج رہا۔

نفس تصدیق کے معنی چونکہ انتفاء شک کے ہیں، اس لئے امام اعظم وغیرہ ایمان کو بسیط اور غیر مرکب کہتے ہیں کیونکہ یہ ایمان کا وہ مخصوص و محفوظ مرتبہ ہے کہ اس سے گر کر سارے مراتب کفر کے ہیں، اور اس ایمان کا اطلاق بطور کلی متواطی تمام افراد مومنین پر یکساں ہوتا ہے اسی لئے اس ادنیٰ درجہ ایمان میں کمی و زیادتی کا سوال بھی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ اس مرتبہ تصدیق کے بعد جو مراتب کمال ایمان انشراح صدر، خشیت الٰہی و تقویٰ و طہارت کثرت طاعات و عبادات وغیرہ سے حاصل ہوتے ہیں، ان کی کمیت و کیفیت کی کمی و زیادتی نا قابل انکار ہے۔ نفس بساطت ایمان کی وجہ مذکور کے علاوہ[1] دوسری وجہ انکار زیادت و نقصان کی باعتبار مومن بہ کے ہے، پہلے بتایا جا چکا ہے کہ تصدیق جاننا نہیں بلکہ ماننا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی پوری شریعت کو ماننا ایمان ہے جو ادنیٰ و اعلیٰ مومن سب کے لئے برابر ہے جو مطالبہ ایمان کا بڑے سے بڑے پیغمبر، صحابی، و ولی سے ہے کہ پوری شریعت الٰہیہ کا التزام طاعت کریں، وہی کم سے کم درجہ کے مومن سے بھی ہے۔ جن آیات قرآنیہ سے ایمان کی زیادتی ثابت کی جاتی ہے، وہ نزول قرآن مجید کے دور کی ہیں کہ اس وقت تدریجی طور سے مومن بہ یا شریعت مصطفویہ کی تکمیل ہو رہی تھی۔ تکمیل شریعت کے بعد کمی و زیادتی کا مرحلہ ختم ہو چکا۔ یاایھا الذین امنوا ادخلوا فی السلم کافۃ۔ اس کے بعد جو فرق مراتب ہوگا وہ خشیت الٰہی، تقویٰ، مخالفت ہوائے نفس وغیرہ کے اعتبار سے ہوگا اور یہ فرق اس قدر ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے مراتب عالیہ کا تو کہنا ہی کیا ہے ایک حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی کا ایمان اتنا بھاری ہے کہ تمام امت محمدیہ کے ایمانوں سے بھی اس کا وزن زیادہ ہے۔

تارک عمل اور مرتکب کبیرہ مومن فاسق ہے، فسق کے باعث عذاب جہنم کا سزاوار اور ایمان کی وجہ سے دخول جنت کا مستحق اور خلود نار سے محفوظ ہوگا۔

۲۔ ائمہ ثلاثہ امام بخاری و دیگر محدثین فرماتے ہیں کہ:۔

ایمان مرکب ہے جسکے اجزا تصدیق قلبی، تصدیق لسانی اور اعمال جوارح ہیں لیکن سب اجزاء کی رکنیت یکساں نہیں ہے۔ تصدیق قلبی اصل اصول ہے کہ وہ نہیں تو ایمان منتفی محض اور اعمال کا درجہ بمنزلہ واجبات صلوٰۃ ہے۔ ارکان صلوٰۃ کی طرح نہیں گویا اقرار و عمل اجزاء مکملہ ہیں، مقدمہ نہیں اور صرف اعمال کے نہ ہونے سے ایمان کی نفی نہ ہوگی، البتہ تارک عمل اور مرتکب کبیرہ کو مومن فاسق کہیں گے جو ترک عمل و ارتکاب کبیرہ کی وجہ سے عذاب نار کا سزاوار، ایمان کی وجہ سے دخول جنت کا مستحق اور خلود نار سے محفوظ ہوگا۔

چونکہ یہ حضرات اعمال کو حقیقت ایمان میں داخل مانتے ہیں، اس لئے باعتبار کمیت کے ایمان میں کمی و زیادتی کے قائل ہیں۔ گویا ان کے نزدیک ایمان بطور کلی مشکک کے ہے۔

۳......فرقہ خوارج کے نزدیک ایمان مرکب ہے اور تینوں اجزاء مذکورہ برابر درجہ کے اجزاء مقومہ و ارکان ایمان ہیں اس لئے صرف اعمال کا تارک یا مرتکب کبیرہ ایمان سے خارج اور کافر ہو جاتا ہے وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔

۴......فرقہ معتزلہ کے نزدیک بھی ایمان مرکب ہے اور تینوں اجزا ارکان ایمان ہیں، تارک اعمال یا مرتکب کبیرہ ایمان سے نکل جاتا ہے مگر کافر نہیں ہو جاتا، اس کو فاسق کہیں گے اور ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔

---

[1] حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ تفسیر کشاف میں یہی جواب امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا گیا ہے پھر یہ بھی فرمایا کہ حافظ ابن تیمیہ نے امام صاحب کے قول لا یزید ولا ینقص، کو بدعۃ الالفاظ سے شمار کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ امام صاحب کے ارشاد کی صحت سے ان کو بھی انکار نہیں البتہ الفاظ سے اختلاف ہے، مگر یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ امام صاحب کے زمانہ میں معتزلہ و خوارج کا بڑا زور تھا، اور وہ ترک عمل یا ارتکاب کبیرہ پر ایمان سے خارج اور مخلد فی النار قرار دینے میں سخت تشدد کر رہے تھے، اس لیے امام صاحب نے ان کے غلط عقائد کے رد میں پوری شدت سے کام کیا اور ان کے مقابلہ میں اعمال کے خارج از ایمان ہونے پر زور دیا، جس کو حافظ ابن تیمیہ نے بدعۃ الالفاظ سے تعبیر کیا اس کے برخلاف سلف کے دور میں چونکہ مرجئہ کا زور تھا جو صرف تصدیق کو کافی سمجھتے تھے اور اعمال کو کچھ بھی اہمیت نہیں دیتے تھے، اس لیے انہوں نے قول و عمل کے نظریہ کو ابھارا اور مرجئہ کی وجہ سے اس کو اہل سنت کا شعار بنالیا۔

۵.....فرقہ مرجئہ کا مذہب ہے کہ ایمان بسیط ہے۔جس کی حقیقت صرف تصدیق قلبی ہے، اقرار لسانی اور اعمال نہ مدار نجات ہیں نہ رکن وشرط، تصدیق قلبی کے بعد کوئی معصیت یا ترک فرض وواجب مضر نہیں۔ نہ ان پر عتاب ہوگا، ایمان میں زیادتی ہوسکتی ہے کمی نہیں، خدا کا علم اور دوسری صفات اس سے الگ اور غیر ہیں۔خدا کی صورت انسان کی سی ہے، ضروریات دین کا علم اجمالاً کافی ہے۔تفصیل کی ضرورت نہیں مثلاً اگر کوئی شخص کہے کہ حج فرض ہے مگر میں نہیں جانتا کہ کعبہ کہاں ہے اور ہوسکتا ہے کہ علاوہ مکہ معظمہ کے کہیں اور ہو یا کہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی مگر میں نہیں جانتا کہ وہ وہی ہیں جو مدینہ طیبہ میں ہیں یا اور کوئی ہیں یا کہے کہ خنزیر حرام ہے لیکن میں نہیں جانتا کہ وہ یہ بکری ہے یا کوئی دوسرا جانور اس قسم کی باتیں کہنے والے سب مومن ہیں کیونکہ یہ سب تفصیلات حقیقت ایمان میں داخل نہیں ہیں، غسان مرجی اس بات کو مستحکم کرنے اور رواج دینے کے لئے امام اعظمؒ کی طرف بھی نسبت کرتا تھا کہ امام صاحب کی بھی یہی رائے ہے حالانکہ یہ افترا محض تھا، اس کے علاوہ معتزلہ کا طریقہ تھا کہ جو شخص مسئلہ قدر میں ان کی مخالفت کرتا تھا اس کو مرجی مشہور کرتے تھے، امام اعظم اور آپ کے اصحاب نے تو معتزلہ کی ہر طرح مخالفت کی ہے اور ان کے دلائل کا ضعف آشکارا کیا ہے اس لئے وہ ان کے تنابز بالالقاب سے کیسے بچ سکتے تھے۔

فرقہ مرجئہ میں سے صرف غیلان قدری تھا، باقی سب جبری عقیدہ رکھتے تھے۔

۶.....فرقہ جہمیہ کے نزدیک ایمان بسیط ہے، جس کی حقیقت صرف معرفت قلب ہے، تصدیق ضروری نہیں جہمیہ کے اور بھی بہت سے عقائد خراب ہیں۔

۷.....کرامیہ کہتے ہیں کہ ایمان بسیط ہے جس کی حقیقت صرف اقرار لسانی ہے بشرطیکہ دل میں انکار نہ ہو، تصدیق قلبی اور اعمال ایمان کے اجزاء نہیں، نہ ان کی ضرورت ہے۔

اہل حق کا اختلاف

امام اعظم و متکلمین وغیرہ کا اختلاف دوسرے ائمہ و محدثین سے نہ کوئی بڑا اہم اختلاف ہے اور نہ اس کو صرف نزاع لفظی ہی کہنا درست ہے کیونکہ بہر حال انظار کا اختلاف موجود ہے ان کا نظریہ یہ ہے کہ ایمان تینوں اجزا کے مجموعہ کا نام ہے اور ہم اس کو بسیط مانتے ہیں لیکن ظاہر یہ ہے کہ تصدیق قلبی تمام مقاصد میں سے بلند مرتبہ اور سب سے بڑی نیکی ہے اور تمام اعمال کی صحت کے لئے بطور شرط و بنیاد ہے لہذا اس کا مرتبہ بھی اعمال جوارح کے اعتبار سے الگ اور بہت اونچا ہونا چاہئے پس اعمال کو رکن وجز کی حیثیت دینا ایمان کی حیثیت کو گرانا ہے اور جس طرح کہ ہم اس کو الگ کر کے اور اعمال کے مقابلہ میں بلند مرتبہ قرار دے کر صحیح پوزیشن دیتے ہیں تو وہ بسیط ہی ثابت ہوگا۔

حضرت شاہ صاحبؒ کا ارشاد

ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہ اختلاف ایسا ہی ہے جیسا کہ صلوٰۃ کے بارے میں حنفیہ وشافعیہ کا ہے کہ شافعیہ فرماتے ہیں، نماز پوری حقیقت معہودہ (تحریمہ سے تسلیمہ تک) کا نام ہے۔جس میں ارکان سنن و مستحبات سب داخل ہیں، پھر بعض اجزاء ان کے نزدیک بھی وہ ہیں جن کے نہ ہونے پر بھی نماز درست ہوجاتی ہے حنفیہ میں سے شیخ ابن ہمام نے فرمایا کہ نماز ارکان کا نام ہے اور باقی اجزا سب مکملات ہیں۔لہذا صرف ارکان میں کمی سے نماز نادرست ہونے کا حکم لگائیں گے یہی صورت ایمان کے بارے میں بھی ہے کہ ایمان کی حقیقت تو صرف تصدیق قلبی ہے اور باقی اجزا اس کی تکمیل کرنے والے ہیں اور یہی بات ان آیات قرآنیہ سے بھی مفہوم ہوتی ہے جن میں ایمان کے بعد اعمال کا ذکر الگ کیا ہے کیونکہ اعمال اگر ایمان میں داخل تھے تو ان کو حرف عطف کے ساتھ الگ کیوں ذکر کیا گیا؟ جو مغایرت کو چاہتا ہے، حافظ ابن تیمیہ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہاں عطف مغایرت کے لئے نہیں ہے بلکہ اعمال کو اہتمام شان اور استیفاء بیان کے لئے الگ ذکر کیا ہے تا کہ اعمال کی طرف سے غفلت نہ ہو۔حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ حافظ ابن تیمیہ کی یہ توجیہ اگرچہ کسی قدر مضبوط اور ان کی ذہانت کی دلیل ہے مگر آیات قرآنی میں

عمل صالحاً من ذکر او انثیٰ و ھو مومن۔کاوہ کیا جواب دیں گے جس میں ایمان کوبطور قید وشرط ذکر کیا ہے اعمال کے لئے۔

اس کے بعد ہمارے ذمہ اس امر کا جواب ہے کہ بہت سی احادیث میں ایمان کا اطلاق اعمال پر ہوا ہے اور یہی سب سے بڑا استدلال امام بخاری وغیرہ کا ہے' اول تو یہ کہ جس طرح کل کا اطلاق جزو پر ہوا کرتا ہے' اسی طرح اطلاق مبدا کا بھی اثر پر ہوا کرتا ہے جیسا کہ ہم نے سمجھا ہے کہ مبدا ایمان اور عمل اس کا اثر ہے اور اگر یہ تسلیم بھی کر لیں کہ ان احادیث میں صرف پہلا ہی اطلاق متعین ہے تو ظاہر قرآن مجید نے اعمال کو ایمان سے الگ اور مغایر قرار دیا ہے تو یہی بہتر ہوگا کہ قرآن کا اتباع کریں اور حدیث میں تاویل کی جائے اور حقیقت حال بھی ایسی معلوم ہوتی ہے کہ حقیقت نفس الامری کو تو قرآن مجید سے بتلایا ہے اور حدیث میں امور خارجیہ کا لحاظ ہے جیسا کہ دوسرے معاملات میں بھی یہی صورت ہوئی ہے کہ قرآن مجید حقیقت حال کو بے کم وکاست ادا کرتا ہے اور حدیث میں مصالح کی رعایت کی جاتی ہے۔ حاصل جواب یہ ہے کہ یہاں بھی قرآن مجید نے تو یہی فیصلہ کیا کہ اعمال ایمان کا جز نہیں ہیں' پھر چونکہ اندیشہ تھا کہ لوگ اعمال میں کوتاہی کریں گے اس کو حدیث سے دفع کیا' جس میں ایمان کا اطلاق اعمال پر کیا ہے' تا کہ اعمال کی اہمیت بھی زیادہ سے زیادہ معلوم ہو' قرآن مجید کے عطف اعمال سے جو بالکل مغایرت مفہوم ہوئی تھی' اس کی بھی تلافی ہو جائے۔ پس اگر یہ کہا جائے کہ محدثین نے سلف کی تقلید کی ہے کہ وہ ایمان کو قول وعمل کا مجموعہ فرماتے تھے اور احادیث میں بھی ایسا ہی ہے' تو امام اعظمؒ وغیرہ نے اگر سلف کی اس تعبیر کو بدل دیا اور یہ کہہ دیا کہ اعمال' حقیقت ایمان سے خارج ہیں تو انہوں نے اس تغایر کو قرآن مجید کے اتباع میں لیا ہے اس کی وجہ سے امام صاحب وغیرہ پر طعن کرنا کسی طرح مناسب نہیں۔

غرض جیسا کہ ہم پہلے لکھ آئے ہیں سلف کا ارشاد قول وعمل اپنے زمانہ کے مقتضائے حال کے لیے موزوں تھا اور امام اعظمؒ وغیرہ کا ارشاد اپنے وقت کے لیے مناسب تھا۔ ایمان واعمال کے بارے میں اہل حق کے بھی دونوں مسلک پوری وضاحت سے بیان ہو چکے۔ اور دوسرے فرقوں کے مذاہب بھی۔ جس سے معلوم ہو گیا کہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کو مرجئی قرار دینا کسی طرح درست نہیں۔

امام بخاریؒ کا امام صاحب کو مرجی بتلانا

اور امام بخاریؒ نے جو آپ کو مرجی کہا ہے' اگر وہ ارجاء سنت کے اعتبار سے ہے تو کوئی عیب نہیں' اور اگر ارجاء بدعت کے لحاظ سے ہے تو اس سے زیادہ غلط بات کیا ہو سکتی ہے۔ پھر اگر بڑوں کی طرف کوئی بات غلطی سے منسوب بھی ہو گئی تو اس کا طریقہ یہ رہا ہے کہ محتاط طریقہ پر اتنا کہہ دیا گیا فلاں بات آپ کی طرف منسوب کی گئی یا فلاں امر کے ساتھ آپ کو متہم کیا گیا ہے جیسا کہ کتب رجال میں کسی کے متعلق رمی بالقدر' کسی کے متعلق رمی بالارجاء' کسی کے متعلق ینسب الی الرفض وغیرہ لکھتے ہیں' لیکن افسوس ہے کہ امام بخاریؒ نے تحقیق کے طور پر لکھ دیا کہ امام صاحب مرجی تھے' امام محمد کو جہمی لکھ دیا' امام ابو یوسف کا ترجمہ یک سطری اپنی تاریخ کبیر کے صفحہ ۳۹۷ میں لکھا تو کیا لکھا کہ "شیبانی سے حدیث سنی' ان کے صاحب ابو حنیفہ تھے' جن کو لوگوں نے چھوڑ دیا"۔ (یعنی روایت کرنے والوں نے ان سے حدیث کی روایت نہیں کی' امام ابو یوسف کے حالات میں آپ پڑھ آئے ہیں کہ کتنے بڑے محدث تھے بہ کثرت محدثین سے خود بھی روایت حدیث کی' اور ان سے بھی روایت کرنے والے بہ کثرت ہیں' مگر امام بخاری نے ان کا ذکر نہیں کیا۔ پھر امام صاحب کا ذکر یہاں بھی ترک روایت کی خوش خبری سنانے کے لیے فرمایا ہے' جب کہ خود امام ابو یوسف نے بھی مستقل حدیثی تصنیف کتاب الآثار میں امام صاحب سے روایات کثیرہ جمع کی ہیں اور وہ کتاب اس وقت شائع شدہ ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے۔ فالحمد للہ والمنہ۔

دوسرا احتمال لفظ ترکوہ میں یہ ہے کہ امام بخاری خود امام ابو یوسف کو متروک الحدیث بتلا رہے ہیں' تو یہ بھی درست نہیں' جیسا کہ امام ابو یوسف کے حالات میں ان کے حدیثی علم وشغف وثقاہت وغیرہ کا ذکر پوری تفصیل سے ہو چکا ہے' غرض امام اعظم یا امام ابو یوسف میں سے خدا کے فضل و

انعام سے کوئی بھی متروک الحدیث نہیں ہے نہ امام محمد ہی خدانخواستہ جہمی تھے ان کے بھی صحیح حالات ہم مفصل لکھ آئے ہیں۔ واللہ المستعان۔

طعن ارجاء کے جوابات

طعن ارجاء کے جواب میں شیخ معین سندھی نے بھی دراسات اللبیب میں بڑی تفصیل سے اور بہت اچھا کلام کیا ہے ہم بھی امام صاحب کے حالات میں کچھ لکھ آئے ہیں خود فقہ اکبر میں بھی امام صاحب سے ایسی تصریحات ملتی ہیں۔ کہ ان کے بعد ارجاء بدعت سے متہم کرنا کسی طرح درست نہیں صفحہ ۱۰ میں ہے کہ ایمان اقرار و تصدیق ہے صفحہ ۱۱ میں اسلام کے بارے میں فرمایا کہ وہ تسلیم وانقیاد ہے خدا کے اوامر واحکام کا' ایمان بغیر اسلام کے نہیں ہوتا' نہ اسلام بغیر ایمان کے دونوں کا علاقہ ظہر وبطن کا ہے اور دین کا اطلاق ایمان' اسلام اور شرائع کے مجموعہ پر ہوتا ہے" مناقب کی صفحہ ۱۴۵ تا ۱۴۸/ ا تک جہم بن صفوان اور امام اعظم کا پورا مکالمہ درج ہے جس میں امام صاحب نے قرآن وحدیث کے دلائل سے اس کو ایمان واسلام کی حقیقت سمجھائی' جس کے بعد وہ یہ کہہ کر اٹھا کہ آپ کی باتوں سے میرا دل متاثر ہوا اور میں پھر بھی حاضر ہوں گا' علامہ ابن عبدالبر مالکیؒ نے بھی الانتقاء میں صفحہ ۱۶۸ پر امام صاحب سے ایمان کے بارے میں وہی باتیں نقل کی ہیں جو تمام اہل سنت والجماعت کا مذہب ہے' اب اگر وہ ارجاء تھا تو بقول استاذ ابوزہرہ مصری کے صرف امام صاحب کو ارجاء سے مطعون کرنا صحیح نہیں کیونکہ پھر تو سب ہی فقہاء ومحدثین اس کی زد میں آ جائیں گے' ہاں کوئی معتزلی ہو تو وہ اس کی زد سے بچ سکے گا۔ دیکھئے ابوزہرہ کی کتاب ابوحنیفہ صفحہ ۱۷۷)

استاذ موصوف نے امام صاحب کے حالات ومناقب میں نئے طرز واسلوب سے نہایت تحقیق وکاوش کے ساتھ کتاب مذکور مرتب کی ہے جس کا دوسرا ایڈیشن مطبوعہ ۱۹۵۵ء ہم نے دیکھا ہے اور کتاب کی قدر وقیمت اس لئے بھی بڑھ گئی کہ تالیف کے زمانہ میں موصوف نے علامہ کوثری سے بھی استفادہ کیا ہے چونکہ امام صاحب کے زمانہ میں بھی معتزلہ نے اپنے خلاف کی وجہ سے اور عثان مرجئی نے اپنی تائید کے لئے امام صاحب کو مرجئی مشہور کیا اس لئے اس وقت کے مشہور محدث عثمان بتی نے امام صاحب کو خط لکھا کہ لوگ آپ کو مرجئی کہتے ہیں اس سے مجھے نہایت رنج ہوتا ہے جو باتیں وہ آپ کی طرف منسوب کرتے ہیں کیا ان کی کوئی اصل ہے؟ امام صاحب نے جواب میں ایک طویل خط تحریر فرمایا' جس کی تمہید میں ایمان واسلام' عقیدہ واعمال کے بارے میں کچھ اصولی باتیں تحریر فرمائیں اور آخر میں لکھا کہ "میرا قول یہ ہے کہ اہل قبلہ سب مومن ہیں اور فرائض کے ترک سے کافر نہیں ہو سکتے جو شخص ایمان کے ساتھ تمام فرائض بجالاتا ہے وہ مومن اور جنتی ہے جو ایمان واعمال کا تارک ہے وہ کافر اور دوزخی ہے جو شخص ایمان رکھتا ہے اور فرائض اس سے ترک ہو جاتے ہیں وہ مسلمان ضرور ہے مگر گناہ گار مسلمان ہے' خدا کو اختیار ہے اس پر عذاب کرے یا معاف کردے"۔

امام صاحب کی تائید دوسرے اکابر سے

یہاں چند اقوال دوسرے حضرات کے بھی فتح الملہم شرح مسلم صفحہ ۱۵۸ سے لکھے جاتے ہیں' جو امام صاحب وغیرہ کی تائید میں ہیں' امام الحرمین شافعیؒ نے فرمایا کہ ایمان میں زیادتی وکمی نہیں ہوتی' کیونکہ وہ تو اس تصدیق کا نام ہے جو مرتبہ جزم ویقین تک پہنچی ہوئی ہو پھر اس میں کمی وزیادتی کیسی؟ ایسی تصدیق والا خواہ طاعات کرے یا ارتکاب معاصی' اس کی تصدیق تو بحالہ ہے' اس میں کیا تغیر ہوا؟ البتہ اگر تصدیق کے ساتھ طاعات کو بھی ایمان کا جزو مان لیں' تب ضرور اس کے ایمان میں بھی طاعات کی کمی وزیادتی سے تغیرات رونما ہوں گے' امام رازی شافعیؒ نے فرمایا کہ جن دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان میں تفاوت نہیں ہوتا اس سے مراد اصل ایمان ہے اور جن سے تفاوت ثابت ہوتا ہے وہاں کامل ایمان مراد ہے۔

شارح حاجبیہ نے لکھا کہ ایمان کا اطلاق اس چیز پر بھی ہوتا ہے جو اساس وبنیاد ہے نجات کے لئے' اور اس پر بھی ہوتا ہے جو ایمان کامل اور پوری نجات کا ضامن ہے اور اس بات میں بھی کسی کا خلاف نہیں ہے۔

حضرت شیخ اکبر نے فتوحات میں فرمایا کہ ایمان اصلی جو زیادہ کم نہیں ہوتا' وہ فطرت ہے جس پر خدا نے تمام لوگوں کو پیدا کیا تھا یعنی خدا کی وحدانیت کی شہادت جس کا عہد و میثاق ہم سب سے لیا گیا تھا پس ہر بچہ اسی میثاق پر پیدا ہوتا ہے مگر اس کی روح اس جسم خاکی میں محبوس ہو کر اپنے رب کی معرفت کو بھلا دیتی ہے لہٰذا دلائل فطرت میں نظر و فکر کر کے اس معرفت خداوندی و شہادت وحدانیت کو اجاگر کرنے کی ضرورت ہوئی' اگر اس کو سابق حالت کی طرف لوٹا لیا تو مومن ہے ورنہ کافر جس طرح ایک مسافر گھر سے چلا' اس وقت آسمان صاف تھا اور اس کو سمت قبلہ اور اپنی منزل مقصود اچھی طرح معلوم تھی جب بیابان میں پہنچا تو آسمان پر بادل چھا گئے' اب نہ وہ سمت قبلہ کو پہچانتا ہے' نہ منزل مقصود کی جانب کو' اس لئے نظر و اجتہاد سے کام چلائے گا۔

علامہ شعرانی سے تشریح ایمان

علامہ شعرانی شافعی نے فرمایا کہ ''ایمان فطرت'' تو وہی ہے جو آدمی کے ساتھ مرتے وقت ہوتا ہے وہ نہ زیادہ ہوتا ہے نہ کم ہوتا ہے' البتہ اس میں زیادتی و کمی ان احوال کے اعتبار سے کہی جا سکتی ہے جو اس کو مرنے سے پہلے تک کی زندگی میں پیش آتے ہیں''۔

ابن حزم

ابن حزم ظاہری (جو امام صاحب وغیرہ کے سخت مخالفین میں ہیں) اپنی کتاب ''الفصل'' میں لکھتے ہیں کہ کوئی بھی تصدیق خواہ وہ توحید و نبوت کی ہو یا کسی اور امر کی' اس میں زیادتی و کمی ممکن ہی نہیں کیونکہ کسی چیز کی دل سے تصدیق یا اقرار کرنے والا یا تو اس کی تصدیق کرے گا یا تکذیب' یا تردد و شک آئے گا۔ اس کے علاوہ چوتھی صورت نہیں ہے۔ پس یہ تو محال ہے کہ ایک شخص اسی چیز کی تکذیب بھی کرے جس کی تصدیق کر رہا ہے اور یہ بھی محال ہے کہ تصدیق کے باوجود شک بھی کرے' لہٰذا ایک ہی صورت درست ہے کہ وہ اپنے اعتقاد کے مطابق بے شک و شبہ تصدیق کرے' اسی کے ساتھ یہ بھی جائز نہیں کہ ایک کی تصدیق زیادہ ہو' دوسرے کی تصدیق سے' کیونکہ دونوں میں سے ایک کی تصدیق میں کوئی رخنہ پڑ گیا تو ظاہر ہے کہ اس کی تصدیق میں شک داخل ہو گیا تصدیق تو مصدق بہ کے وجود پر یقین و جزم کا نام ہے اور اس صفت میں کمی و بیشی ہوتی ہی نہیں جزم و یقین میں کمی تو شک ہے جب شک آ گیا تو تصدیق گئی لہٰذا ایمان بھی نہ رہا۔ پس ثابت ہو گیا کہ جس زیادتی ایمان کا ذکر خداوند تعالیٰ نے فرمایا ہے وہ تصدیق و اعتقاد میں ہرگز نہیں ہے' بلکہ یقیناً غیر تصدیق میں ہے جو یہاں فقط اعمال ہیں''۔

امام غزالی

امام غزالی شافعیؒ نے فرمایا کہ ''سلف کے قول ''الایمان قول و عمل یزید و ینقص'' سے خود ہی ثابت ہے کہ عمل اجزاء ایمان و ارکان سے نہیں ہے' کیونکہ کوئی چیز خود اپنی ذات سے زیادہ نہیں ہوتی' کوئی یہ نہیں کہے گا کہ انسان اپنے سر کی وجہ سے زیادہ ہوتا ہے ہاں! یہ کہتے ہیں کہ اپنی داڑھی' مثاپے وغیرہ سے زیادہ ہوتا ہے' جس طرح یہ نہیں کہہ سکتے کہ نماز میں رکوع و سجود سے زیادتی ہوتی ہے بلکہ آداب و سنن سے زیادتی ہوتی ہے۔

پس ثابت ہوا کہ ایمان کا فی ذاتہ ایک وجود ہے پھر وجود کے بعد اس کا حال مختلف ہوتا ہے زیادتی بھی ہوتی ہے کمی بھی''۔ آپ نے دیکھا کہ امام غزالی نے سلف کے قول کو بھی امام صاحب وغیرہ کی تائید میں قرار دیا اور یہ فرما کر قرار دیا کہ سلف شہود عدول ہیں' لہٰذا ان کے قول سے عدول مناسب نہیں' انہوں نے جو کچھ فرمایا وہ حق ہے مگر اس کو صحیح طور سے سمجھنے کی ضرورت ہے پھر مذکورہ بالا تشریح فرمائی۔

قاضی عیاض

آپ نے فرمایا کہ ''مجرد ایمان جو تصدیق ہے اس کے اجزاء نہیں ہیں اور جو کچھ زیادتی اس میں کہی جاتی ہے وہ اس سے الگ شئی زائد'

عمل صالح ذکر خفی یا کسی عمل قلب (شفقت مسکین، حسن نیت یا خوف خداوندی وغیرہ) کے سبب ہوتی ہے"۔

نواب صاحب

محترم علامہ نواب صدیق حسن خان صاحب نے "انتقاد الترجیح" میں لکھا کہ "جمہور محققین" کا مذہب یہ ہے کہ ایمان صرف تصدیق قلبی ہے اور زبان سے اقرار کرنا دنیاوی احکام جاری کرنے کی شرط ہے کیونکہ تصدیق قلبی ایک پوشیدہ امر ہے اس کی کوئی علامت ہونی چاہئے پس جو شخص اپنے دل سے تصدیق کرے اور اپنی زبان سے اقرار نہ کرے تو وہ عند اللہ مومن ہے اگرچہ احکام دنیا میں مومن نہیں۔

یہ چند اقوال صرف اس لئے نقل کئے گئے کہ امام صاحبؒ کی اصابت رائے دقت فہم اور اتباع کتاب وسنت کی شان پوری طرح معلوم ہو جائے اور آئندہ بھی آپ دیکھیں گے کہ تمام اختلافی مسائل میں امام صاحب ہی دوسرے ائمہ ومحدثین کے مقابلہ میں روایت ودرایت کی رو سے غالب رہیں گے ان شاء اللہ۔

امام بخاری اور دوسرے محدثین

لیکن اسی کے ساتھ نہایت افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے اور پہلے بھی کچھ لکھ آیا ہوں کہ امام بخاریؒ نے شیخ حمیدی، اسحاق بن راہو یہ وغیرہ سے متاثر ہو کر امام صاحب کے بارے میں بے بنیاد باتوں کے الزامات لگائے ہیں جبکہ دوسرے اصحاب صحاح کا رویہ اس قسم کا نہیں ہے، امام مسلم وابن ماجہ تو خاموش ہیں، نہ ان سے مدح منقول ہے نہ مذمت، امام ابوداؤد پوری طرح مداح ہیں، امام ترمذی ونسائی نے امام صاحب سے روایت حدیث بھی کی ہے امام نسائی سے کچھ تضعیف کے الفاظ بھی منقول ہیں، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلی بات ہے۔

پھر جب وہ امام طحاوی سے ملے اور امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق زیادہ صحیح حالات معلوم کئے تو امام صاحب کی تضعیف سے رجوع فرما لیا، جس کی دلیل یہ ہے کہ امام صاحب سے اپنی صحیح میں روایت بھی کی، جو اصل نسائی میں ہے اس وقت جو نسائی شریف مطبوعہ ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے وہ امام نسائی کے تلمیذ ابن السنی کا اختصار ہے (کما صرح بہ الذہبی فی کتاب "النبلاء") اور صحاح ستہ میں جس کتاب کا شمار ہے وہ بھی اصل کتاب نسائی کی ہے یہ اختصار نہیں ہے (کما صرح بہ الحافظان ابن الملقن والمزی) اور وہی عام اطلاقات محدثین میں بھی مراد ہوتی ہے (ذب الذبابات صفحہ ۲/۲۳۳)

اساتذہ امام بخاری

ان کے علاوہ خود امام بخاریؒ کے تین بڑے اساتذہ وشیوخ امام احمد، امام یحییٰ بن معین اور علی ابن المدینی بھی امام صاحب کی توثیق و مدح فرماتے ہیں، جن کے بارے میں خود امام بخاریؒ نے جزء رفع الیدین میں فرمایا کہ یہ حضرات اپنے زمانے کے بڑے اہل علم تھے۔

امام بخاریؒ کے چھ اعتراض

لیکن پھر بھی امام بخاریؒ نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمہ میں اپنی تینوں کتب تاریخ (صغیر اوسط وکبیر) اور کتاب "الضعفاء و المتروکین" میں آپ کو مرجی لکھا۔ اور جامع صحیح میں تعریضات سے کام لیا، پھر اپنے دونوں رسالوں جزاء القرات خلف الامام اور جزء رفع الیدین میں تو بقول حضرت شاہ صاحبؒ کے تیز لسانی تک پہنچ گئے، جو شدت تعصب اور سخت برہمی پر دال ہے مثلاً ایک جگہ اپنے رسالہ جزء القراۃ خلف الامام میں امام صاحب کے بارے میں لکھا کہ "مدت رضاعت ڈھائی سال قرار دی۔ حالانکہ یہ نص قرآنی حولین کاملین لمن اراد ان یتم الرضاعۃ کے خلاف ہے اور انہوں نے کہا کہ امام صاحب کے نزدیک خنزیر بری میں کچھ حرج نہیں اور امت میں قتال وخوں ریزی جائز سمجھتے تھے ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ اگلے پچھلے واقعات کے بارے میں حکم خداوندی مخلوق وحادث ہے پس وہ نماز کو بھی بندوں پر دین (فریضہ) نہیں سمجھتے"۔

ان چھ بڑے اعتراضات میں سے بعض کے بارے میں کچھ حضرات نے حسن تاویل کی گنجائش پیدا کی اور کہا کہ امام بخاریؒ نے ارجاء سے مرادار جاسنت لیا ہوگا' اوراس کے بعد جو فرمایا کہ محدثین نے امام صاحب کی رائے اور حدیث سے سکوت کیا تو اس کا مطلب بھی یہ ہے کہ انہوں نے آپ کی رائے وحدیث پر کوئی جرح نہیں اگر یہ مطلب نہیں لیتے تو امام بخاری پر صریح جھوٹ کا الزام آئے گا۔ کیونکہ اس امر سے انکار نہیں ہوسکتا کہ امام صاحب سے روایت حدیث کرنے والے اوران کی رائے پر عمل کرنے والے بڑی کثرت سے محدثین ہیں۔ یہی رائے محدث شہیر محقق بے نظیر' حافظ حدیث شیخ محمد ہاشم سندھیؒ کی بھی ہے (ملاحظہ ہو ذب ذبابات الدراسات صفحہ۲/۳۰۷) مگر محقق عصر علامہ عبدالرشید نعمانی دام فیضہم نے اس غلط فہمی کی تصحیح بھی اسی صفحہ کے حواشی میں فرمادی ہے آپ نے لکھا کہ مصنف کی یہ توجیہ غالباً اس لئے ہے کہ انہوں نے امام بخاری کی اصطلاحات کی طرف توجہ نہیں فرمائی' چنانچہ حافظ ابن کثیر نے ''الباعث الحثیث الی معرفۃ علوم الحدیث'' صفحہ۲۴ میں لکھا'' کچھ اشخاص کی اصطلاحات پر بھی وقوف ضروری ہے۔ مثلاً بخاری جب کسی کے بارے سکتوا عنہ یا فیہ نظر کہیں تو اس سے ادنی وار داء مرتبہ کی طرف اشارہ ہوتا ہے کیونکہ وہ لطیف عبادت سے جرح کرنا چاہتے ہیں' اس کو اچھی طرح جان لینا چاہئے۔'' حافظ سیوطیؒ نے تدریب الروی صفحہ۱۲۷ میں لکھا'' بخاری جن لوگوں کو'' متروک الحدیث'' قرار دیتے ہیں ان کیلئے فیہ نظر اور سکتوا عنہ لکھتے ہیں۔''

حافظ حدیث ابن رشید کا قول علامہ زبیدی نے شرح احیاء العلوم صفحہ۴/۹۴ میں نقل کیا کہ'' بخاری حنفیہ کی بہت زیادہ مخالفت کرنے والے ہیں'' حافظ زیلعی کو مخالفین نے بھی کثیر الانصاف تسلیم کیا ہے اور نہایت نرم خو ہیں مگر انہوں نے بھی جو کچھ نقد امام بخاری کی شدت عصبیت ومخالفت حنفیت کے بارے میں کیا وہ ہم بسم اللہ کی بحث میں نقل کر آئے ہیں۔ حافظ سخاوی نے اپنی کتاب'' الاعلان بالتوبیخ'' صفحہ ۶۵ میں جو کچھ امام بخاری اور دوسرے حضرات کے تعصب ائمہ حنفیہ کے متعلق لکھا وہ ہم مقدمہ کتاب ہذا کے صفحہ ۲/۵۹ میں نقل کر چکے ہیں۔

پھر بقول علامہ نعمانی یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر واقعی امام صاحب ایسی ہی کم مرتبہ تھے کہ لوگوں نے ان کی رائے وحدیث کو کوئی وقعت نہیں دی' تو امام بخاری کو اتنے اہتمام وکاوش کی کیا ضرورت تھی کہ'' جامع صحیح'' میں بھی جگہ جگہ بعض الناس کی طرف تعریض فرمار ہے ہیں اور دوسری تصانیف میں بھی' ہاں! ایک بات اور سمجھ میں آتی ہے اس سے امام بخاری کی بات بھی جھوٹ نہیں بنتی' جس سے محدث سندھی بچنا چاہتے ہیں' وہ یہ کہ امام بخاریؒ نے اپنے بہت سے شیوخ حدیث اور متقدمین ومعاصرین کو دیکھا کہ انہوں نے امام صاحب کی رائے وحدیث پر کوئی جرح نہیں کی تو وہ اپنے نزدیک حق بات کا اظہار ضروری سمجھ رہے ہیں اور بتلار ہے ہیں کہ امام صاحب ان کی تحقیق میں مرجئی ہیں اور دوسرے عیوب مندرجہ بالا بھی ان میں موجود ہیں اس پر بھی ان لوگوں کا سکوت اور عدم جرح' لاعلمی یا کسی اور وجہ سے ہے' چنانچہ ہم امام بخاریؒ کے حالات میں نقل کر آئے ہیں کہ انہوں نے بعض مسائل کی بحث کے ضمن میں یہ بھی فرمادیا کہ عجیب بات ہے کہ لوگوں نے بے علم لوگوں کی تقلید کی اس سے تو وہ اگر عبداللہ بن مبارک ہی کی تقلید کرتے تو اچھا تھا کیونکہ وہ اپنے زمانے کے سب سے بڑے عالم تھے اور ہم نے وہاں لکھا تھا کہ خود عبداللہ بن مبارک کا اعتراف یہ ہے کہ میں جاہل تھا' جو کچھ علم کی دولت ملی وہ امام صاحب سے ملی' اور لوگوں نے بہت کوشش کی کہ میں امام صاحب تک نہ پہنچوں اور مجھے غلط باتیں سنا کر متاثر کرنا چاہا۔ مگر خدا کے فضل نے دستگیری کی یہ بھی منقول ہوا کہ جب وہ امام صاحب سے وابستہ ہوگئے تو لوگوں نے پھر بھی پیچھا نہ چھوڑا اور آپ کے پاس آآ کر امام صاحب کی برائیاں کرتے تھے آپ امام صاحب کی طرف سے برابر مدافعت کرتے اور جب وہ کسی طرح باز نہ آتے تو فرماتے کہ یا تو میرا پیچھا چھوڑ دو یا ایسا بڑے علم وفضل تقوی وطہارت کا پیکر مجسم کوئی دوسرا مجھے بتادو۔

غرض اس قسم کے حالات ہم نے کافی لکھے تھے اور بہت کچھ باقی ہیں' امام صاحب اتنے بڑے تھے کہ بڑے بڑوں سے ان کی سیرت نگاری کا فرض پورا نہ ہوسکا' یہ عاجز کس شمار میں ہے! یہاں تھوڑی سی جوابدہی اور صفائی امام بخاری کے مذکورہ بالا اعتراضات کی کردی جائے تو مناسب ہے۔

امام بخاریؒ نے ان اتہامات واعتراضات کی کوئی سند نہیں بیان کی' حالانکہ انہوں نے امام صاحب کا زمانہ نہیں پایا' یہ بات ان کی

جلالت قدر کے لیے موزوں نہیں تھی، لیکن تاریخی پس منظر سے واقف جانتے ہیں کہ یہ سب وہی باتیں ہیں جو امام صاحب کے مخالفین نے چلائی تھیں، اور خطیب بغدادی نے ان کو مع دوسرے بہت سے اتہامات کے اپنی تاریخ بغداد میں جمع کر دیا ہے اور علامہ کوثریؒ نے ''تانیب الخطیب'' میں ایک ایک روایت پر مفصل نقد کیا ہے، راویوں کا غیر معتمد اور جھوٹا ہونا کتب رجال وتاریخ سے ثابت کر دیا ہے۔ امام بخاری چونکہ مسئلہ لفظ بالقرآن کے سلسلہ میں اپنے زمانہ کے علماء احناف سے کبیدہ خاطر ہو گئے تھے اور اپنے بعض شیوخ واساتذہ مثلاً امام حمیدی، اسحق بن راہویہ، نضر بن شمیل، احمد بن زہیر، عبدالرحمٰن بن مہدی، نعیم بن حماد خزاعی اسماعیل بن عرعرہ، وغیرہ سے بہت متاثر ہو گئے تھے، جن میں سے بعض تو امام صاحب کے سخت مخالفین میں سے تھے اور بعض وہ تھے جنھوں نے فرط تعصب ومخالفت کی وجہ سے امام صاحب کی کتابوں کو دریا میں بہا کر نابود کرنے کی سعی کی تھی۔ اسحق بن راہویہ بھی باوجود اپنی جلالت قدر کے اسی گروہ میں تھے جن کے مشورہ وایما سے امام بخاری نے جامع صحیح مرتب کی، اور اس میں اپنی یاد کردہ ایک لاکھ صحیح احادیث میں سے صرف ۲۳۵۳ احادیث جمع کیں جو ان کے اپنے اجتہاد کے موافق مسائل سے مطابق تھیں، دوسرے کبار ائمہ مجتہدین کے اجتہاد کے موافق احادیث جمع کرنے کا کوئی التزام واہتمام نہیں فرمایا۔

غرض امام بخاریؒ میں تاثر اور یکطرفہ غیر معمولی رجحان کا مادہ بہت تھا اس لئے امام صاحب کے بارے میں غلط نظریات پر جم گئے، اور جہاں وہ جامع صحیح میں رواۃ کی صداقت ودیانت وغیرہ کی حتی الامکان بڑی چھان بین فرماتے ہیں، جامع صحیح کے باہر اپنی تاریخ اور دوسری تصانیف میں وہ بلند معیار باقی نہیں رکھا، اس وقت اس کی ایک دوسری مثال بھی ذکر کرتا ہوں رسالہ رفع یدین میں دعویٰ فرمادیا کہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے کسی ایک صحابی سے بھی رفع یدین نہ کرنا ثابت نہیں ہے، حالانکہ یہ بات کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتی، امام ترمذی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے حدیث نفی رفع یدین ذکر کرنے کے بعد لکھا کہ بہت سے اہل علم اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تابعین میں سے اسی کے قائل ہیں اور مصنف ابی بکر بن ابی شیبہ، شرح معانی الآثار، امام طحاوی اور شروح صحیح بخاری وغیرہ سے بھی۔ امام ترمذی ہی کی بات صحیح معلوم ہوئی ہے۔ اب امام بخاریؒ کی جلالت قدر کے پیش نظر ان کے قول کی تاویل کرنی پڑی، کسی نے کہا کہ ثبوت عدم رفع کا ایک اخص خصوص درجہ مراد ہوگا جو مہیا نہیں ہو سکا، کسی نے کہا مطلب یہ ہے کہ ہر صحابی رفع یدین تو کرتا ہی تھا، خواہ صرف تکبیر تحریمہ کے وقت ہو، اس لئے عدم رفع کا ثبوت بالکلیہ نہیں ہوا وغیرہ لیکن ظاہر ہے کہ محل نزاع میں ایسی تاویلات کا کوئی موقع نہیں، اس کے بعد ہم ان اعتراضات کے مختصر جوابات تحریر کرتے ہیں۔

۱- ارجاء کے بارے میں پہلے بھی لکھا گیا ہے کہ امام صاحب کا ارجاء، ارجاء سنت تھا جو تمام اہل حق کا مسلک ہے، خود امام صاحب نے اپنے مکتوب گرامی میں شیخ عثمان بتی کو یہ الفاظ تحریر فرمائے تھے کہ آپ نے جو ہمارے مرجئہ کہے جانے کے بارے میں لکھا ہے تو آپ ہی سوچئے کہ جن لوگوں نے عدل واعتدال کی بات کہی انہوں نے کیا جرم کیا کہ اہل بدعت نے ان کو مرجئہ کہنا شروع کر دیا۔ درحقیقت ہمارے اصحاب اہل عدل واہل سنت ہیں، اور ان کو مرجئہ کا لقب ان کے دشمنوں نے دیا ہے۔[۱]''

علامہ کوثری نے اس پر ایک نوٹ بھی دیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو گمراہی کی طرف منسوب کرنا، جو مرتکب کبیرہ کو خدا کی مشیت پر محمول کرتے ہیں کہ وہ چاہے تو معاف فرمادے گا، چاہے گا عذاب دے گا۔ معتزلہ خوارج یا ایسے لوگوں کا کام ہوسکتا ہے جو سمجھے بے سمجھے ان ہی کے نقش قدم پر چلنا پسند کریں، حافظ ابن ابی العوام نے امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ سے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ''میں اور علقمہ بن مرثد حضرت عطاء بن ابی رباح کے پاس گئے اور بتلایا کہ ہمارے بلاد میں کچھ ہیں جو ہمارے اس قول کو ناپسند کرتے ہیں کہ ''ہم مومن ہیں'' انہوں نے پوچھا اس کی کیا وجہ؟ ہم نے کہا کہ وہ کہتے ہیں کہ اگر تم یہ کہو کہ ہم مومن ہیں تو یہ بھی کہو کہ ہم جنتی ہیں'' (گویا ہمارے دعوائے ایمان کو

---

[۱] جس طرح محض دشمنی کی وجہ سے بریلوی اہل بدعت فرقہ نے دیوبندیوں کو ''وہابی'' کا لقب دے دیا۔ جس پر حضرت تھانویؒ کو لکھنا پڑا کہ ہمارے اور ابن عبدالوہاب کے عقائد میں بڑا فرق ہے اور ان بریلویوں سے قیامت کے دن اس بہتان پر مواخذہ ہوگا۔ (اشرف الجواب)

دعوائے اہل جنت ہونے کے مرادف قرار دے کر ناپسند کرتے ہیں' حضرت عطاء نے فرمایا کہ نحن مومنون کہنا چاہئے' اس میں کچھ حرج نہیں' البتہ نحن من اہل الجنۃ نہیں کہنا چاہئے کیونکہ کوئی ملک مقرب یا نبی مرسل بھی ایسا نہیں جس پر حق تعالیٰ کی حجت نہ ہو' پھر وہ چاہے گا عذاب دے گا' چاہے گا بخش دے گا۔ پھر حضرت عطا نے فرمایا' اے علقمہ! تمہارے اصحاب اہل جماعت کے نام سے مشہور تھے پھر نافع بن ازرق نے ان کو مرجیہ کہنا شروع کیا''۔ اور اس کی ابتداء اس طرح ہوئی کہ نافع نے ایک شخص اہل سنت سے پوچھا کہ آخرت میں کفار کس جگہ جائیں گے؟ اس نے کہا دوزخ میں۔ پوچھا مومن کہاں جائیں گے؟ کہاں ان کی دو قسم ہیں' نیک جنت میں جائیں گے اور مومن فاسق فاجر کو خدا چاہے گا تو گناہوں کی وجہ سے عذاب دے گا اور چاہے گا تو ایمان کی وجہ سے اس کی بخشش فرما دے گا۔ اس نے پھر کہا کہ آخر تم نے اس کے لئے کون سی جگہ متعین کی؟ اس نے کہا مجھے اس کے لئے کوئی ایک جگہ طے کرنے کا کوئی حق نہیں بلکہ اس کے فیصلے کو خدا کی طرف مؤخر کرتا ہوں' اس پر نافع بولا کہ اچھا تم مرجی ہو۔ (مرجی کے معنی ہیں کسی چیز کو مؤخر کرنے والا)

تو جو لوگ اہل سنت کو مرجئی کہتے ہیں وہ نافع خارجی کے پیرو ہیں' جس کے نزدیک مرتکب کبیرہ ہمیشہ دوزخ میں رہے گا۔ علامہ کوثری نے یہ بھی لکھا کہ ''علامہ مقبلی نے کسی ایسے شخص کا نام مرجئی رکھنا اور اس پر احادیث مذمت مرجہ کا چسپاں کرنا جو مرتکب کبیرہ کو توبہ نہ کرنے کی صورت میں تحت المشیۃ کہے' اغلاط خواص میں سے گنایا ہے' کیونکہ اس کے مصداق تو وہ لوگ ہیں' جو تارکین صلوٰۃ کے لئے بھی کسی وعید کے قائل نہیں اور ان کو وعید کی زد سے ہٹا کر بالکل مؤخر کر دیا ہے رہا ان کا مشیت خداوندی کے تحت داخل ہونا تو یہ کتاب و سنت میں پوری طرح اور بطریق تواتر معلوم ہے۔ لہٰذا امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا ارجاء بھی خالص سنت ہے اس کو ارجاء بدعت کہنا محض اتہام ہے۔''

سید الحفاظ المتاخرین علامہ زبیدی نے ''عقود الجواہر المنیفہ'' کے مقدمہ میں لکھا ''امام صاحب کی طرف ارجاء کی نسبت ہرگز صحیح نہیں' کیونکہ آپ کے تمام اصحاب کی رائے' مرجئین کے خلاف ہے پس اگر امام صاحب مرجئی ہوتے تو آپ کے اصحاب بھی اسی خیال پر ہوتے دوسرے یہ کہ امام صاحب تو مرجئی کے پیچھے اقتداء نماز کو بھی ناجائز فرماتے تھے پھر جس کے بارے میں اجماع و اتفاق ہو۔ کہ وہ ائمہ اربعہ میں سے ایک جلیل القدر امام ہیں اس کے بارے میں کسی ناواقف کی جرح بے اثر و بے محل ہے (اصحاب صحاح ستہ کے شیخ الشیوخ) حماد بن زید (جن کا تذکرہ مقدمہ انوار الباری صفحہ ۲۱۳/۱ میں ہو چکا ہے' اور ابن معین کا قول تہذیب ہی میں ان کے بارے میں ہے کہ حضرت ایوب سختیانی سے روایت میں ان سے زیادہ باوثوق دوسرا نہیں[1] ہے' اور تمام لوگ بھی کوئی بات ایوب سے خلاف نقل کریں تو حماد بن زید ہی کا قول معتبر ہوگا اور ابوزرعہ نے فرمایا کہ حماد بن زید حماد بن سلمہ سے زیادہ اثبت' اتقن' اور اصح حدیثا ہیں''۔ وغیرہ)

یہ حماد حضرت ایوب سختیانی کی خدمت میں طویل مدت تک رہے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ کسی شخص نے آ کر امام صاحب کا ذکر

---

[1] جلیل القدر تابعی اور مشہور محدث ہیں' حضرت انس کو دیکھا' حضرت نافع' عطا' عکرمہ' عمرو بن دینار وغیرہ سے روایت حدیث کی۔ آپ سے اعمش' حماد' ابن زید' حماد بن سلمہ' سفیان بن عیینہ' سفیان ثوری' شعبہ' امام مالک وغیرہ نے روایت کی' علی بن المدینی کا قول ہے کہ آٹھ سو حدیث آپ سے مروی ہیں (معلوم ہوا کہ ہمارے امام صاحب بہ نسبت ان کے کثیر الحدیث ہیں' امیر المومنین فی الحدیث شعبہ فرمایا کرتے تھے کہ ہم سے سید الفقہا ایوب نے اس طرح روایت کی' حماد بن زید کا قول ہے کہ جن لوگوں کی صحبت میں میں رہا ان سب سے زیادہ افضل اور نہایت شدت سے متبع سنت ایوب ہی کو پایا شیخ حمیدی نے حضرت سفیان بن عیینہ سے نقل کیا ہے کہ ایوب جیسا میں نے نہیں دیکھا ابن مدینی سے کسی نے سوال کیا کہ حضرت نافع سے روایت میں کون زیادہ اثبت ہے؟ فرمایا ایوب فضل و کمال میں' امام مالک اتقان میں' اور عبید اللہ حفظ میں ممتاز ہیں' ابن سعد نے کہا کہ ''ایوب ثقہ' ثبت' جامع' الفضائل' کثیر العلم' حجۃ وعدل تھے' امام مالک نے فرمایا کہ ایوب علماء عاملین خاشعین عباد و خیار ناس میں سے تھے' میں نے بھی ان سے علم حاصل کیا جب دیکھا کہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہایت اجلال و تعظیم کا معاملہ کرتے ہیں'' امام احمد سے پوچھا گیا کہ کیا ایوب کو امام مالک پر بھی تقدم ہے؟ تو فرمایا ہاں! آپ کی ولادت ۶۶ھ یا ۶۸ھ میں ہوئی۔ اور وفات ۱۳۱ھ میں رحمۃ اللہ رحمۃ واسعۃ (تہذیب صفحہ ۳۹۷' محدث خوارزمی نے لکھا کہ زہاد و کبار تابعین میں سے ہیں۔ آپ نے امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ سے بھی روایت حدیث کی ہے (جامع المسانید صفحہ ۳۸۳)

برائی سے کیا تو آپ نے یہ آیت پڑھی یریدون ان یطفؤا نور اللہ بافواھم ویابی اللہ الاان یتم نورہ پھر فرمایا کہ ہم نے بہت سے مذاہب ان حضرات کے دیکھے ہیں جنہوں نے امام ابوحنیفہ پر جرح کی کہ وہ سارے مذاہب ختم ہوگئے! اور امام صاحب کا مذہب قیامت تک باقی رہنے والا ہے اور انشاء اللہ جتنا وہ پرانا ہوگا اس کے انوار و برکات میں زیادتی ہوگی اب تمام لوگوں کا اس امر پر اتفاق ہو چکا ہے کہ اہل سنت والجماعت اہل مذاہب اربعہ ہیں' جو شخص امام ابوحنیفہ کے مذہب میں کلام کرے گا اس کا مذہب صفحہ ہستی سے نابود ہو جائے گا اور امام صاحب کا مذہب شرق سے غرب تک پھیلتا رہے گا اور اکثر لوگ اسی پر ہوں گے''۔ (صفحہ ۱۴-۱۵ طبع اسکندریہ ۱۳۹۲ھ)

علامہ کوثری نے تانیب الخطیب میں ایک دوسرے نہج سے بھی ارجاء پر کلام کیا ہے' وہ یہ کہ امام صاحب اور ان کے بعد کے زمانے میں کچھ سادہ لوح نیک نیت لوگ ایسے بھی تھے' جو ایمان کے مجموعہ قول و فعل ہونے اور اس کی زیادتی و نقص کے متعلق بہت زیادہ یقین رکھتے تھے اور اپنے یک طرفہ رجحان و غلو کے باعث وہ ان لوگوں کو مرجئی کہنے لگے تھے' جو ایمان کو مجموعہ عقد و کلمہ (تصدیق قلبی و شہادت لفظی) سمجھتے تھے' حالانکہ حجج شرعیہ کی رو سے حق وہی تھا' جو وہ سمجھتے تھے' کیونکہ قرآن مجید میں ہے'' ولما یدخل الایمان فی قلوبھم (یعنی ابھی ایمان ان کے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔ معلوم ہوا کہ ایمان دل کے اندر کی چیز ہے' اور حدیث مسلم میں ہے کہ ایمان' خدا' ملائکہ' کتب' رسل' یوم آخرت' قدر خیر و شر پر یقین رکھنا ہے اور یہی جمہور اہل سنت کا عقیدہ ہے۔ مگر یہ نیک بزرگ اگر واقعی اپنے اعتقاد مذکور کے خلاف کو بدعت و ضلالت سمجھتے تھے تو معتزلہ و خوارج کی پوری موافقت کر گئے وہی یہ کہتے ہیں کہ اعمال رکن ایمان ہیں جو ان میں کمی و کوتاہی کرے گا وہ دائرہ ایمان سے خارج ہو جائے گا اور مخلد فی النار ہوگا۔ حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ یہ نیک بزرگ بھی ان دونوں فرقوں اور ان کے عقائد سے قطعاً بیزار تھے' لیکن یہ نہ سوچا کہ جب ہم ان فرق باطلہ کے عقائد سے برات کرتے ہیں اور دوسری طرف امام اعظمؒ اور ان کے اصحاب اور دوسرے حضرات سے بھی برات کا اظہار کریں گے تو یہ کس قدر بے معنی بات ہوگی اور اگر واقعی طور سے یہ لوگ اپنے خلاف کو بدعت و ضلالت نہیں سمجھتے تھے اور اعمال کو صرف کمال ایمان کے لئے ضروری سمجھتے تھے تو پھر امام صاحب وغیرہ سے اختلاف ہی کیا رہا کہ ان کو معطون کیا جائے۔ لیکن ان کے ظاہری تشدد نے یہی بات باور کرائی کہ وہ عمل کو مکمل کے درجہ میں نہیں بلکہ ایمان کا رکن اصلی قرار دیتے ہیں جس کا نتیجہ ظاہر ہے سب سے زیادہ تعجب امیر المومنین فی الحدیث سے ہے کہ وہ بڑی خوشی کا اظہار کر کے فرماتے ہیں میں نے اپنی کتاب میں کسی ایسے شخص سے روایت نہیں لی جو'' الایمان قول و عمل یزید و ینقص'' کا قائل نہیں تھا' حالانکہ انہوں نے غالی خارجیوں تک سے روایتیں لی ہیں' اور وہ یہ بھی خوب جانتے ہوں گے کہ'' الایمان قول و عمل یزید و ینقص'' کا بطور حدیث رسول' ناقدین حدیث کے نزدیک کوئی ثبوت نہیں ہے پھر اس قدر وضاحت و اتمام حجت کے بعد ان لوگوں پر طعن و تشنیع کا کیا جواز ہے جو عمل کو اگرچہ ایمان کا رکن اصلی نہیں قرار دیتے لیکن جتنی اہمیت اعمال کی قرآن و سنت سے ثابت ہے اس کے قائل بھی ہیں' اور یہی مذہب جمہور صحابہ اور جمہور اہل سنت کا ہے جو خوارج و معتزلہ کے عقیدوں سے بیزار ہیں اور جو ارجاء بدعت فرقہ باطلہ مرجئہ کا مذہب ہے کہ سرے سے اعمال کی کوئی ضرورت و اہمیت ہی نہیں اور ایمان کے ساتھ کوئی معصیت بھی مضر نہیں' اس قول و عقیدہ سے بھی امام صاحب وغیرہ بری ہیں حتیٰ کہ مرجئی کے پیچھے ان کے نزدیک نماز بھی صحیح نہیں''۔ (تانیب صفحہ ۴۴)

اسی طرح ارجاء بدعت کے بارے میں شیخ معین سندھیؒ نے بھی آخر دراسات میں امام صاحب کی طرف سے نہایت عمدگی کے ساتھ دفاع کیا ہے اور شیخ جزری نے جامع الاصول کی دسویں جلد میں بھی نہایت زوردار الفاظ میں لکھا کہ'' امام صاحب کی طرف جو ارجاء' خلق قرآن اور قدر وغیرہ کی نسبتیں کی گئی ہیں خواہ وہ کسی نے بھی کی ہوں وہ گھڑی ہوئی جھوٹی باتیں ہیں' اور ظاہر یہ ہے کہ امام صاحب کی ذات ان سب سے منزہ تھی' جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کے مسلک کو مشرق سے مغرب تک غیر محصور علماء و صلحا نے اختیار کیا اگر اس میں سر الٰہی اور رضاء خداوندی نہ ہوتی جس سے امام صاحب مشرف ہوئے تو دنیا کے آدھے مسلمان ان کی تقلید پر جمع ہوتے اور اس وقت تک ساڑھے چار سو سال

گزر گئے ان کی رائے و مذہب پر عمل ہو رہا ہے یہ آپ کے مذہب و عقیدہ کی صحت پر سب سے بڑی دلیل ہے امام جزری شافعی کا تذکرہ مقدمہ انوارالباری صفحہ۱۱۴ میں ہو چکا ہے ان کی وفات ۷۰۶ھ میں ہوئی اور انہوں نے امام صاحبؒ کی وفات سے اپنے زمانے تک کا حال ذکر کیا ہے چونکہ یہ بحث ایمان کی چل رہی ہے اور امام صاحب کے بارے میں ارجاء کی نسبت ایک بہت بڑا مغالطہ تھا' بالفرض اگر امام صاحب ایمان کی حقیقت پوری طرح نہ سمجھ سکے تھے تو بنیاد ہی غلط ٹھہرتی ہے اور آگے کی ساری عمارت ہی بے بنیاد ہو جاتی ہے اس لئے اس مسئلہ کی وضاحت مختلف پیرایوں سے ضروری ہوئی اور یوں بھی ایمان اصل دین ہے اس کی حقیقت اور اطراف و جوانب سے جتنی زیادہ واقفیت ہو سکے بہتر ہے اس لئے طوالت کا خیال نہیں کیا گیا۔

یہاں سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ امام صاحب کے مدارک اجتہاد کس قدر دقیق اور دقت نظر کتنی زیادہ تھی کہ جو فیصلہ فرما گئے' وہ عقل و نقل کی کسوٹی پر پورا ہی اترتا تھا' بقول امام حدیث عبداللہ بن مبارکؒ کے امام صاحبؒ "مخ العلم" علم کا مغز تھے' علوم نبوت کے لب لباب اور ان کے انتہائی مقاصد تک رسائی حاصل تھی' مسائل کی ارواح و حقائق پر مطلع تھے ان کے اصول و مبادی سے واقف اور ان کی فروع نکالنے میں ماہر کامل تھے' بہت جلد اپنی جودت فکر' وسعت علم' اور مناظروں کی شوکت سے سارے زمانہ کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ایک وقت متکلمین کی مجلس میں بیٹھے ان سے مناقشات کر رہے ہیں دوسرے وقت اہل ہوا کی معترتوں کو دفع کر رہے ہیں تیسرے وقت فرق باطلہ سے بحث و مجادلہ کر رہے ہیں۔ مسائل علم کلام[1] میں آپ کی آراء کی بڑی اہمیت ہے۔ علم حدیث میں آپ کی طرف ۲۲-۲۳ مسانید منسوب ہیں لہٰذا حدیث میں بھی آپ کا خاص مقام ہے اور فقہ' تخریج' فہم معنی حدیث' علم ناسخ و منسوخ احادیث' استنباط علل احکام وغیرہ میں تو سب مجتہدین سے اعلیٰ مرتبے پر فائز ہوئے' حتیٰ کہ آپ کے معاصرین نے بھی اعتراف کیا کہ ہم نے آپ سے اچھا حدیث کو سمجھنے والا نہیں دیکھا' یہ صرف اسی لئے تھا کہ آپ حدیث کے ظاہری الفاظ کے فہم پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ ان الفاظ کے گہرے معانی و مطالب پر غور کر کے ان کے مناسبات علل' ملابسات و حکم دریافت کرتے تھے اور ان ہی پر بنا کر کے اصول منضبط اور فروع متفرع کرتے تھے یہ اتنا بڑا محیر العقول فضل و امتیاز امام صاحب کو کیسے حاصل ہوا' خود امام صاحب کے فطری ملکات و کمالات کس قسم کے تھے' اور کن اساتذہ اور کس ماحول سے ایسی عظیم شخصیت مکمل ہوئی ان سب امور مبہمہ کی کماحقہ تنقیح و تشریح استاذ ابوزہرہ مصری نے اپنی تالیف "ابوحنیفہؒ" کے مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت کی ہے۔

علی ابی حنیفۃ و مصادرہ' صفات ابی حنیفۃ شیوخہ۔ دراساتہ الخاصۃ و تجاربہ"۔ پھر عنوان "السنۃ" کے تحت صفحہ ۲۶۸ سے ۲۹۸ تک امام صاحب کے عمل بالحدیث اور عمل بالقیاس پر اتنا کافی و شافی لکھ دیا ہے کہ اس کو پڑھ کر ہر شخص امام صاحب کو اہل حدیث اور ان کے مقابلہ پر دوسروں کو اہل رائے و قیاس کہنے پر مجبور ہوگا اور حقیقت بھی یہی ہے' حنفیہ میں سے جن محدثین نے ائمہ احناف کے عمل بالحدیث کی شان زیادہ نمایاں کی' ان میں سے چند اکابر نمایاں یہ ہیں۔

امام طحاوی حافظ ابوبکر جصاص' محدث خوارزمی' حافظ زیلعی' حافظ مغلطائی' حافظ عینیؒ شیخ ابن ہمام' حافظ قاسم بن قطلو بغا' ملا علی قاری' شیخ عبدالحق محدث دہلوی' شیخ الاسلام دہلوی' شیخ محمد حیات سندھی' شیخ محمد ہاشم سندھی' علامہ زبیدی' شیخ محمد عابد سندھی' الشیخ الکنگوہی' شیخ خلیل احمد سہارنپوری شیخنا الاستاذ مولانا محمد انور شاہ کشمیری' شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ شیخ التفسیر علامہ شبیر احمد عثمانی' شیخ محمد زاہد الکوثری' شیخ نیموی' شیخ محمد' الشیخ اشرف علی و الشیخ ظفر احمد التھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ و شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا المہاجر مدنیؒ۔

---

[1] اس سلسلہ میں یہ امر خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ ماتریدیہ نے حق تعالیٰ کی آٹھویں صفت تکوین کا اثبات کیا ہے وہ امام اعظم ہی کی دینی فکری و کلامی منقبت کی دین ہے جس کی عظمت و اہمیت کا اعتراف حافظ ابن حجرؒ نے بھی فتح الباری میں کیا اور کہا کہ اس کلامی مسئلہ میں امام بخاری نے امام صاحب کی رائے کا اتباع کیا ہے یہ نہایت اسلم صورت ہے کیونکہ اس کو مان لینے کے بعد وہ اعتراضات وارد نہیں ہوتے جو اشاعرہ پر کئے گئے ہیں زیادہ تفصیل اپنے موقع پر آئیگی انشاء اللہ (مؤلف)

ایمان کے ساتھ استثناء کی بحث

ایمان کے متعلق یہ بحث ہو چکی کہ اس کی اصل کیا ہے اور فروع کیا ہیں؟ اور یہ بھی واضح ہو چکا کہ نفس ایمان میں کمی وزیادتی ہوتی ہے یا نہیں اب ایک تیسری بحث باقی ہے اس کو بھی مختصراً پڑھ لیجئے۔

سلف میں سے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ابراہیم نخعیؒ علقمہؒ سفیان ثوریؒ ابن عیینہؒ، امام مالکؒ شافعی واحمدؒ سے منقول ہے کہ وہ ''انا مومن انشاء اللہ'' کہتے تھے اور صرف انا مومن کہنے کو پسند نہیں کرتے تھے' ہمارے متکلمین میں سے بھی بعض اصحاب کا یہی مسلک نقل ہوا ہے امام اوزاعی وغیرہ دونوں صورتوں کو برابر سمجھتے تھے لیکن امام اعظمؒ اور دوسرے متکلمین انا مومن کے ساتھ انشاء اللہ کہنے کو پسند نہ کرتے تھے لیکن باوجود اس کے امام صاحب سے اس قسم کا تشدد بھی منقول نہیں' جو متاخرین حنفیہ نے اختیار کیا کہ انا مومن کے ساتھ انشاء اللہ کہنے والوں کو منتگیہ' شکیہ کہتے تھے اور بعض نے یہاں تک کہہ دیا کہ یہ لوگ چونکہ اپنے ایمان میں شک کرتے ہیں ان کے پیچھے نماز بھی درست نہیں' اس کو تشدد بیجا ہی کہنا چاہئے۔ اگر سلف سے بھی اس قسم کے تشدد کی مثال ملتی ہے۔ علامہ کوثری نے سند کے ساتھ واقعہ لکھا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بکری لائے اور ایک شخص سے کہا کہ اس کو ذبح کردو اس نے ذبح کرنے کے لئے چھری اٹھائی آپ نے پوچھا کیا تم مومن ہو؟ اس نے کہا میں مومن ہوں' انشاء اللہ تعالیٰ' حضرت ابن عمر نے فرمایا لاؤ مجھے چھری دو اور وہیں چلے جاؤ جہاں کے لئے خدا نے تمہارا مومن ہونا چاہا ہے دوسرا شخص گزرا بلا کر فرمایا' ہماری بکری ذبح کردو اس نے بھی چھری لے کر ذبح کرنے کا ارادہ کیا' آپ نے پوچھا کیا تم مومن ہو؟ اس نے بھی کہا ''میں مومن ہوں انشاء اللہ تعالیٰ'' اس سے بھی آپ نے چھری لے لی اور فرمایا جاؤ اپنا کام کرو' پھر تیسرے شخص سے کہا کہ ہماری بکری ذبح کردو اس نے بھی چھری اٹھالی' آپ نے پوچھا کیا تم مومن ہو؟ اس نے کہا کہ ''میں ظاہر و باطن سے مومن ہوں'' آپ نے فرمایا اچھا ذبح کرو' ذبح کرو۔ پھر فرمایا کہ ''خدا کا شکر ہے کہ ہماری بکری کو ایسے شخص سے ذبح نہیں کرایا جس کو اپنے خدا پر ایمان میں بھی شک تھا''۔

اس روایت میں ایک راوی کو مجہول کیا گیا ہے مگر علامہ کوثری نے اس کی جہالت رفع کردی ہے (تانیب صفحہ ۳۵) عامہ سلف کے قول مذکور کی توجیہ کس طرح کی گئی ہے ایک یہ کہ انشاء اللہ باعتبار ایمان موافاۃ ہے یعنی وقت وفات کا ایمان' چونکہ مدار نجات وہی ایمان ہے جو آخر وقت تک رہے۔ اس لئے اسی کا لحاظ واعتبار کر کے انشاء اللہ کہتے تھے کیونکہ کل کے ہر کام کو خدا کی مشیت پر معلق کرنا چاہئے' حافظ ابن تیمیہ نے اس توجیہ کو پسند نہیں کیا اور کہا کہ خود آئمہ سلف سے اس کی توجیہ اس طرح منقول ہے کہ ایمان مکمل انقیاد ظاہری اور تمام واجبات کی بجا آوری اور ترک جمیع ممنوعات کو مقتضی ہے تو انا مومن کہنے کا مطلب یہ ہوا کہ اپنے لئے کمال ایمان کا دعویٰ کیا اس سے بچنے کے لئے انشاء اللہ تعالیٰ کہتے تھے جس طرح کوئی مومن اپنے لئے بر و تقویٰ اور تزکیہ نفس کی شہادت نہیں دے سکتا۔ حافظ ابن تیمیہؒ کی توجیہ مذکور کا مدار چونکہ اعمال کو ایمان کے اجزاء جوہری ماننے پر ہے اور اس کو ہم خلاف تحقیق بتلا چکے ہیں اس لئے وہ بھی صرف ایک سطحی تاویل کا درجہ رکھتی ہے امام صاحب کی نظر چونکہ ٹھوس حقائق پر ہوتی ہے اس لئے وہ ایمان کو اس کے ٹھیک مقام میں اور اعمال کو ان کے صحیح مرتبہ میں رکھتے ہیں' جہاں سلف سے قول وعمل اور یزید و ینقص کا قول حسب تحقیق حضرت علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ اس زمانے کے مقتضیات احوال کے تحت تھا اور اس کو حقیقت نفس الامری نہیں قرار دے سکتے''۔ (جس کی تفصیل اوپر گزر چکی اسی طرح سلف سے انا مومن کے ساتھ انشاء اللہ کا اضافہ بھی ان کے بلند مقامات و مراتب تواضع وکسری شان موافاۃ' یا حسن خاتمہ کو خدا کی مشیت سے وابستہ کرنے' یا اعمال کی غایت اہمیت کے لحاظ سے ضرور ان حضرات کے لئے حسب حال تھا مگر اس کو حقیقت و شریعت قرار نہیں دیا جا سکتا جو سب کے لئے ایک اصول کا کام دے سکے اسی لئے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے ذبح شاۃ کے قصہ میں پہلے دو آدمیوں پر نکیر کی اور تیسرے کی تقویت فرمائی۔

حسب تحقیق حضرت علامہ کشمیری قدس سرہٗ امام صاحب نے ایک دقیق امر کی طرف توجہ کی، جس سے سلف نے تعرض نہیں کیا تھا، یعنی ایمان کے اس مرتبہ محفوظ خاصہ سے بحث کی، جو مدار نجات ہے اور اس کے بعد کفر عی ہوسکتا ہے اور وہ مرتبہ ایسا جزم و یقین ہے کہ اس کے ساتھ کسی ادنیٰ شک کی بھی گنجائش نہیں، جب ایمان کی یہ حقیقت متعین ہوگئی تو ظاہر ہے کہ امام صاحب انا مومن کے ساتھ انشاء اللہ کا اضافہ بطور تبرک بھی پسند نہیں کریں گے کیونکہ اس کے لئے جہاں بہتر توجیہات نکل سکتی ہیں ایک شق شک والی بھی ہے جس کا وجود ایمان کے ساتھ کسی طرح بھی گوارہ نہیں کیا جاسکتا' جیسا کہ حضرت ابن عمرؓ نے بکری ذبح کرانے کے لئے پہلے دو شخصوں کے انشاء اللہ کہنے کو پسند نہیں کیا۔

امام صاحب کی یہ بہت بڑی خصوصیت ہے کہ وہ ایک صحیح فیصلہ کرنے کے بعد' کسی کے سخت سے سخت طعن و ملامت کی وجہ سے بھی مداہنت کو ہرگز روا نہیں رکھتے ہیں' تانیب میں ہے ایک شخص شراب کے نشہ میں چور امام صاحب کے پاس آیا اور امام صاحب کو یا مرجیٔ کہہ کر خطاب کرنے لگا' امام صاحب نے برجستہ فرمایا "اگر میں تم جیسوں کے لئے ایمان ثابت نہ کرتا تو آج تم مجھے مرجیٔ نہ کہتے' اور اگر ارجاء بدعت نہ ہوتا تو مجھے اس کی بھی پروانہ ہوتی کہ مجھے اس کی طرف منسوب کیا جائے" معلوم ہوا کہ امام صاحب بدعت سے سخت نفرت کرتے تھے اور اس کی طرف نسبت بھی آپ کو گوارہ نہ تھی۔

امام صاحب کی جس طرح ظاہر کی آنکھیں کھلی تھیں باطن کی آنکھیں بھی روشن تھیں' اس لئے ان سے کوئی حقیقت کیونکر محجوب رہ سکتی تھی' امام شعراوی شافعیؒ نے "المنہج المبین" میں لکھا کہ "چاروں مذاہب سنت صحیحہ سے ماخوذ اور شریعت حقہ سے مستنبط ہیں' خصوصاً امام اعظم کا مذہب' لیکن اس کے استنباطات بہت دقیق ہیں' ان تک بعض لوگوں کی سمجھ نہیں پہنچ سکتی اور ان کی صحت کا حال کشف صحیح والے ہی پر منکشف ہوسکتا ہے۔

پھر انہوں نے اپنی کتاب "طبقات الاولیاء الکبار" میں اور علامہ منادی شافعی نے اپنی طبقات میں ائمہ اربعہ کو اولیاء کبار میں شمار کیا ہے اور ان کے مناقب جلیلہ لکھے ہیں اور عارف باللہ شعیب الحریفیش یمنی شافعیؒ نے "الروض الفائق" میں امام صاحب کے مناقب اور علم باطن کے کمالات کا ذکر کیا ہے۔(ذب صفحہ ۶۸۰/۲)

۲۔دوسرا اعتراض یہ تھا کہ امام صاحب نماز کو خدا کا فریضہ و دین نہیں سمجھتے' اگر کوئی ادا نہ کرے تو کسی وعید کا مستوجب نہیں تو یہ قول مرجئہ اہل بدعت کا ہے' (مرجئہ اہل سنت کا نہیں) امام صاحب اس اتہام سے قطعاً بری ہیں' جس کی تفصیل ہو چکی ہے۔

۳۔تیسرا اعتراض امام بخاریؒ نے امام صاحب پر رضاع کی مدت کے بارے میں کیا ہے' اور ڈھائی سال کی مدت کو خلاف نص قرآنی بتلایا ہے' لیکن جس آیت کا حوالہ امام بخاریؒ نے دیا ہے' وہ اجرت رضاعت سے متعلق ہے کہ دو سال تک اجرت رضاعت مطلقہ بیوی کو دی جانی چاہئے۔ فان ارادافصالا سے بتلایا کہ مشورہ کے بعد شوہر و بیوی دودھ چھڑا سکتے ہیں کوئی حرج نہیں اور وان تسترضعوا سے یہ بتلایا کہ اس کے بعد بھی دودھ پلانا چاہو تو کوئی حرج نہیں' اس اختیار دینے سے واضح ہوا کہ یہاں مدت رضاعت کی تعیین و تحدید مقصود نہیں ہے (تفسیر احکام القرآن للجصاص) دوسری جگہ سورۂ احقاف میں ارشاد ہوا وحملہ و فصالہ ثلاثون شھرا جس کا مطلب زمخشری نے یہ بتلایا کہ ہاتھوں میں اٹھانے اور دودھ چھڑانے کا زمانہ ۱/۲-۲ سال کا ہے۔ لہٰذا یہ کل مدت رضاعت ہوئی۔

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ پہلی آیت سورۂ بقرہ میں دو سال دودھ پلانے کا حکم ہے اور ظاہر ہے کہ دو سال پر فوراً دودھ چھڑانے اور دوسری غذائیں دینے سے فوراً صحت بگڑ جائے گی۔ اس لیے دو سال کے بعد کچھ زمانہ غذاؤں کی عادت ڈالنے کے لیے بھی ہونا چاہئے تاکہ رفتہ رفتہ دودھ پلانے کے ساتھ تمرین غذا بھی ہو پھر دو سال کے بعد کتنی مدت اور اس کے لیے لی جائے' اس میں اختلاف ہے (جس کی تفصیل آگے آئی ہے) غرض دو سال کی مدت ایسی نہیں ہے کہ اس کے بعد دودھ پلانا حرام ہو' اگر ایسا ہوتا تو احادیث میں اس کی تشریح آتی' جو مدار احکام فقہی' بلکہ ایک حدیث میں الرضاعۃ من المجاعۃ وارد ہے' یعنی دودھ پلانا بھوک کے لیے ہے کہ جب تک دودھ کی خواہش و ضرورت ہو پلی

سکتا ہے' اس سے بھی ظاہر یہی مفہوم ہوتا ہے کہ دو سال پر مدار نہیں ہے' البتہ دو سال کے بعد تمرین غذا ضروری ہے تا کہ جلد چھڑایا جا سکے۔

شیخ ابوبکر جصاص نے یہ بھی لکھا کہ لمن اراد ان یتم الرضاعة میں تمام کے لفظ سے یہ ضروری نہیں کہ اس پر زیادتی ممنوع ہو جیسے حدیث میں آتا ہے کہ جو وقوف عرفہ کرلے اس کا حج تمام ہو گیا' حالانکہ ابھی دوسرے فرض و واجب باقی ہیں' جو وقوف عرفہ کے بعد ادا کیے جاتے ہیں۔

مدت رضاعت میں بہت سے اقوال ہیں۔

۱۔ دو سال کے اندر دودھ پینے سے حرمت رضاعت ثابت ہوگی' جس کے قائل یہ ہیں:۔ حضرت عمرؓ' ابن عباسؓ' ابن مسعودؓ' امام اعظم (ایک روایت میں) امام مالکؒ' امام شافعیؒ' ابو یوسفؒ' محمدؒ' زفرؒ وغیرہ۔

۲۔ رضاع مقتضی حرمت وہ ہے جو دودھ چھڑانے سے قبل ہو۔ اس کے قائل ابن عباسؓ' ام سلمہؓ' اوزاعیؒ' عکرمہ وغیرہ ہیں۔

۳۔ حالت صغر میں موجب حرمت ہے اس کی کوئی حد مقرر نہیں' کی یہ رائے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ دیگر ازواج مطہرات اور ابن عمرؓ وغیرہ کی ہے۔

۴۔ ڈھائی سال' یہ ایک روایت حضرت امام اعظمؒ وزفرؒ سے ہے۔

۵۔ دو سال اور اس سے کچھ زیادہ' یہ امام مالکؒ کا قول ہے۔

۶۔ تین سال یہ قول ایک جماعت اہل کوفہ اور حسن بن صالح کا ہے۔

۷۔ سات سال یہ قول حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے مروی ہے۔

۸۔ دو سال اور بارہ دن' حضرت ربیعہ کا قول ہے۔

۹۔ رضاعت میں چھوٹی عمر کا اعتبار ہے' مگر خاص حالات میں رضاع کبیر میں معتبر ہے' جیسے کوئی بڑی عمر کا لڑکا کسی مجبوری سے کسی عورت کے پاس آتا جاتا ہو اور اس سے حجاب بھی دشوار ہو' یہ حافظ ابن تیمیہ کی رائے ہے (بذل المجہود ملخصا من النیل صفحہ ۲/۱۱)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اول تو نص قرآنی کا خلاف ہی نہیں ہے' اور اگر ہے تو صرف امام صاحب کو ہدف طعن بنانا درست نہیں۔

۴۔ چوتھا اعتراض یہ ہے کہ امام صاحب نے خنزیری کو حلال و جائز قرار دیا' یہ بات بھی فرقہ مرجئہ سے تعلق رکھتی ہے' جیسا کہ ہم ان کا مذہب بتلا آئے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ماجاء به الرسول کی معرفت اجمالی کافی ہے۔ تفصیل ضروری نہیں بس اتنا جانتا ہو کہ کعبہ معظمہ کہیں ہے' مکہ معظمہ میں ہونے کی معرفت ضروری نہیں' صرف اتنا جاننا ضروری ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نبی تھے۔ یہ جاننا ضروری نہیں کہ وہ وہی تھے' جن کی پیدائش و بعثت مکہ معظمہ میں اور وفات مدینہ طیبہ میں ہوئی یا کوئی اور تھے' سور کو حرام جانتا ہو' خواہ یہ نہ جانتا ہو کہ وہ بکری ہے یا کوئی دوسرا جانور' چونکہ امام بخاریؒ کے خیال میں امام صاحب مرجئی تھے' لہٰذا وہ اسی مذکورہ بالا اجمال و تفصیل کے تحت' خنزیر و بکری میں فرق نہ کر سکنے والے کے لئے گویا خنزیر ہی کو حلال کہتے تھے (نعوذ باللہ منہ) اگرچہ امام بخاریؒ نے ان اتہامات کے لیے کوئی سند ضروری نہیں سمجھی' مگر اس بات کا کچھ سراغ اس امر سے مل جاتا ہے کہ خطیب نے سند کے ساتھ امام صاحب کی طرف اس قسم کی بات منسوب کر دی ہے۔ علامہ کوثری نے خطیب کی یہ روایت تانیب کے صفحہ ۳۶ میں ذکر کی ہے' اس کی روایت کا شرف بھی علامہ حمیدی شیخ بخاری کو حاصل ہے' جنہوں نے امام بخاری کو امام صاحب وغیرہ سے بدظن کرنے میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں' علامہ کوثری نے اس روایت کے رواۃ کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا کہ طبقات سبکی شافعی صفحہ ۲۲۴/۱ میں ہے کہ شیخ محمد بن عبداللہ بن عبدالحکم نے کہا کہ حمیدی لوگوں کے حالات بیان کرنے میں کذب و غلط بیانی سے کام لیتے ہیں' (ان کے تعصب وغیرہ کا حال مقدمہ انوار الباری صفحہ ۲۲۴/۱ میں لکھا جا چکا ہے) دوسرے راوی۔ حارث بن عمیر ہیں' جن کو ذہبی نے بین الضعف' ابن حبان نے اثبات سے گھڑی ہوئی باتیں نقل کرنے والا' حاکم نے موضوع احادیث نقل کرنے والا' ازدی

نے ضعیف' منکر الحدیث' ابن خزیمہ نے کذاب لکھا' پھر از روئے درایت بھی یہ کیونکر ممکن ہے کہ امام اعظم ایسی کفر صریح بات اور وہ بھی مسجد حرام میں بیٹھ کر فرمائیں' ہاں جھوٹوں کو کوئی الزام نہیں دے سکتا' جو چاہیں جس کے بارے میں کہہ سکتے ہیں' مشہور ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو بدزبانیوں سے نہایت تنگ ہو کر خدا کی بارگاہ میں عرض کیا کہ ''ان کی لسانی دل آزاریوں سے مجھے بچادیجئے'' حق تعالیٰ نے فرمایا ''اے موسیٰ! لوگوں کی زبان کو اپنے ہی بارے میں نہیں روکا تو تمہارے بارے میں کیا روکوں گا۔

امام صاحب سے تو امام ابو یوسف صاحبؒ نے مسئلہ نقل کیا ہے کہ اگر کوئی شخص جان بوجھ کر غیر کعبہ کی طرف نماز پڑھے اور اتفاق سے اپنی غلطی سے وہ کعبہ ہی کی طرف پڑھ لے' تو اس کی نماز تو کیا ہوگی' وہ اپنی اس کافرانہ حرکت سے جان بوجھ کر کعبہ کی سمت سے اعتراض کیا اور غیر کعبہ کی طرف نماز کا ارادہ کر کے نماز پڑھی۔ کافر ہو جائے گا۔

ہاں! یہ ممکن ہے کہ امام صاحب نے کسی نو مسلم کے لیے اجمالی ایمان کو ابتداء میں کافی فرمایا ہو' تاکہ پھر وہ تدریجاً ایمان تفصیل حاصل کر لے' اور اسی کو روایت بالمعنیٰ کی آڑ لے کر راویوں نے مسخ کر کے پیش کیا ہو' علامہ ابن حزم نے ''فصل'' میں لکھا ہے کہ ایک جاہل ان پڑھ کے لیے ابتداء میں ایمان اجمالی بھی کافی ہے مثلاً یہ کہ محمد رسول ہیں خدا کے' اور بھی وہ نہیں جانتا کہ آپ قریشی تھے' یا تمیمی یا فارسی' حجاز میں تھے یا خراسان میں' وغیرہ' البتہ اس کو علم ضروری تفصیلی حاصل کرنا چاہیے اگر جاننے کے بعد بھی عناد سے ایسی بات کہے تو کافر ہے۔

خنزیر بری کے اتہام کے بارے میں حافظ ابن تیمیہ نے بھی ''منہاج السنۃ'' میں صفحہ ۲۵۹/۱ میں لکھا کہ ''امام صاحب کی بعض چیزوں سے اگرچہ کچھ لوگوں نے خلاف کیا ہے' مگر ان کے علم' فہم و تفقہ میں کوئی بھی شک نہیں کر سکتا' بعض لوگوں نے ان کی طرف طعن و تشنیع کے لیے ایسی باتیں بھی منسوب کر دی ہیں' جو آپ پر یقیناً بہتان و جھوٹ ہیں' مثلاً خنزیر وغیرہ کے مسائل۔

علامہ محقق مولانا عبدالرشید نعمانی نے حاشیہ ذب صفحہ ۵۳/۲ میں لکھا ''ناقلین روایات کے یہاں کسی روایت کو ساقط و رد کرنے کے لیے انقطاع' عدم ضبط' تہمت کذب' جہالت' بدعت حسد' بغض' عصبیت میں کوئی ایک بھی کافی ہے' مگر تعصب کا برا ہو کہ جب کوئی بات امام اعظمؒ کے کسی عیب و منقصت کی ہاتھ لگتی ہو تو اس کو باوجود ان علل مذکورہ کے بھی قبول کر لیا جائے گا۔ چنانچہ خطیب نے بھی بیسوں روایات اسی قسم کے کذابین' مرجئین' معتزلین اور افتراء پردازوں سے جمع کر دی ہیں (جن کی قلعی علامہ کوثری نے کھول دی ہے۔ جزاء اللہ تعالیٰ خیر الجزاء)

۵۔ پانچواں اعتراض' رای السیف علی الامتہ کا ہے' جس کا جواب ہم نے امام صاحب کے حالات میں بھی دیا ہے اور اس جلد کے شروع میں بھی ایک جگہ ضمناً لکھ آئے ہیں' اور امام ابوبکر جصاص نے اپنی مشہور تصنیف ''احکام القرآن'' کے صفحہ ۸۱/۱ میں بھی اس پر خوب لکھا ہے' چند جملے ملاحظہ ہوں۔

''امام صاحب کا مسلک ظالم حکام اور ائمہ جور سے قتال کے بارے میں مشہور تھا (وہ اس بارے میں شمشیر بے نیام تھے' ان کی تلوار حق کی حمایت میں باطل کے مقابلہ کے لیے تھی' امت پر نہیں بلکہ امت کو ظالموں کے ظلم و جور سے نجات دلانے کے لیے تھی' اسی لیے امام اوزاعی (محدث شام) نے فرمایا تھا کہ ''امام ابوحنیفہ کی وجہ سے ہم ہر بات کے لیے آمادہ ہو گئے' یہاں تک کہ انہوں نے ہمیں تلوار اٹھانے پر بھی آمادہ کرنا چاہا (یعنی ظالموں کے خلاف) مگر ہم اس کو برداشت نہ کر سکے' امام صاحب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو فرض فرماتے تھے' اول زبان سے' اور نہ مانیں تو تلوار کے زور سے مجبور کرنے کو ضروری سمجھتے تھے'' اس کے بعد امام جصاص نے کچھ واقعات امام صاحب کی مجاہدانہ زندگی کے ذکر کئے' پھر فرمایا کہ ''امام صاحب کے اس مسلک پر بعض سادہ مزاج اصحاب حدیث نے نکیر کی ہے' جن کی کمزوری کے باعث امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا کام سست و بے اثر ہو گیا' اور اسلامی امور پر ظالموں کا تغلب ہو گیا'

۶۔ چھٹا اعتراض یہ تھا کہ امام صاحب قرآن کو مخلوق کہتے تھے' یہ بھی محض بہتان و افتراء ہے' امام بیہقی شافعیؒ نے اپنی کتاب ''الاسماء و الصفات'' صفحہ ۲۵۰ میں امام محمد صاحب کا قول نقل کیا کہ وہ فرماتے تھے ''جو شخص قرآن کو مخلوق کہے اس کے پیچھے نماز مت پڑھو'' محمد بن سابق نے

امام ابو یوسف سے سوال کیا:۔ کیا امام ابو حنیفہ قرآن کو مخلوق کہتے تھے؟ فرمایا:۔ معاذ اللہ بالکل غلط ہے اور نہ میں ایسا کہتا ہوں' پھر پوچھا کیا امام صاحب جہم کا عقیدہ رکھتے تھے؟ فرمایا معاذ اللہ' بالکل غلط ہے اور نہ میرا ایسا عقیدہ ہے امام ابو یوسف نے یہ بھی فرمایا کہ ایک دفعہ میں نے امام صاحب سے اس بارے میں گفتگو کی کہ قرآن مخلوق ہے یا نہیں' تو ہم دونوں اس امر پر متفق ہوئے کہ جو قرآن کو مخلوق کہے وہ کافر ہے۔

حافظ ابن تیمیہ نے ''کتاب الایمان'' صفحہ ۱۶۳ میں لکھا'' خدائے تعالیٰ کی مسلمان بندوں پر بڑی رحمت تھی کہ جن آئمہ دین کی لسان صدق کا سکہ ساری امت کے قلوب پر جما ہوا تھا' یعنی ائمہ اربعہ وغیرہم جیسے امام مالک ثوری اوزاعی لیث بن سعد امام شافعی امام احمد اسحٰق ابو عبید امام' ابو حنیفہ ابو یوسف محمد سب حضرات قرآن مجید ایمان وصفات رب کے بارے میں فرقہ جہمیہ کے عقائد باطلہ پر نکیر کرتے تھے' اور سب کا بالاتفاق وہی عقیدہ تھا جو سلف کا تھا''۔

علامہ سلیمان بن عبدالقوی الطوفی حنبلی نے ''شرح مختصر الروضہ'' میں لکھا:۔

واللہ میں امام ابو حنیفہ کو ان تمام اتہامات وبرائیوں سے معصوم سمجھتا ہوں جو ان کی طرف منسوب کی گئی ہیں اور آپ کے بارے میں فیصلہ شدہ بات یہ ہے کہ آپ نے کسی جگہ بھی ازروئے عناد واعراض سنت کی مخالفت ہرگز نہیں کی' ہاں جہاں کہیں کوئی خلاف کیا ہے تو وہ ازروئے اجتہاد اور حجج واضحہ و دلائل صالحہ لائحہ کی بنیاد پر کیا ہے اور ان کے وہ دلائل اب بھی موجود ہیں' اور بہت مشکل ہی سے ان کے مخالفین ان سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں' اور امام صاحب کے لیے بصورت خطا ایک اجر اور بصورت صواب دو اجر ہیں' ان پر طعن کرنے والے یا تو حاسد ہیں یا جاہل جو مواقع اجتہاد سے ناآشنا ہیں۔

امام احمدؒ سے بھی آخری بات جو صحت کو پہنچی ہے وہ امام صاحب کے بارے میں ذکر خیر اور مدح وثناء ہی ہے جس کو ہمارے اصحاب میں سے ابوالورد نے کتاب اصول دین میں ذکر کیا ہے''۔

عقود الجواہر المنیفہ میں امام احمدؒ کا قول نقل ہوا ہے کہ'' ہمارے نزدیک یہ بات صحت کو نہیں پہنچی کہ امام ابو حنیفہؒ قرآن کو مخلوق کہتے ہیں۔

الحمد للہ الذی بیدہ تتم الصالحات کہ ایمان سے متعلق اکثر ضروری مباحث پر سیر حاصل بحث ہو چکی' اور ضمناً امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں بعض اکابر کی طرف سے جو ایمان وغیرہ مسائل کے متعلق غلط باتیں آ گئی تھیں' ان کا بھی ازالہ کیا گیا **و اللہ ولی التوفیق للخیرات ' او لاو آخرًا**۔

ایک اہم غلط فہمی کا ازالہ

ایک محترم فاضل نے لکھا کہ'' دوسری ہجری میں اصحاب الرائے اور محدثین کے نام سے دو طبقے پیدا ہو گئے تھے' امام بخاریؒ کا امام اعظمؒ سے اختلاف شخصی ہرگز نہیں' بلکہ طبقاتی اختلاف ہے' مصر کے مشہور فاضل استاذ ابو زہرہ نے اپنی کتاب '' فقہ ابی حنیفہ وآثار'' میں اس پر مفصل بحث کی ہے اس پس منظر میں دیکھنے کے بعد امام بخاریؒ نے امام صاحبؒ کی شان میں جو سخت کلامی اور بعض جگہ گستاخی کی ہے' اس کی اہمیت بہت کم ہو جاتی ہے''۔ ہم نے ابھی تک استاذ ابو زہرہ کی کتاب مذکورہ نام کی نہیں دیکھی' البتہ امام اعظمؒ پر ان کی نہایت مبسوط تحقیقی کتاب جو ''ابو حنیفہ'' حیاتہ وعصرہ آراءُ وفقہ'' کے نام سے دوبار شائع ہو چکی ہے' ہمارے پاس موجود ہے' اس میں کہیں نہیں لکھا گیا کہ امام بخاری کا خاص امام صاحب سے کوئی طبقاتی اختلاف تھا نہ ہمارے علم میں کسی اور نے آج تک امام صاحب سے امام بخاری کے اختلاف کی یہ نوعیت کبھی یا بتلائی۔ نہ امام بخاری ہی سے کہیں یہ نقل ہوا کہ انہوں نے خصوصیت سے امام صاحب یا دوسرے حنفیہ کو اصحاب الرائے ہونے کا طعنہ دیا ہو۔

امام بخاریؒ اور ان کا قیاس

البتہ یہ ضرور ہے کہ امام بخاری قیاس کے منکر ہیں لیکن یہ ان کا قیاس کی بات صرف امام صاحب کے خلاف نہیں ہے بلکہ تمام صحابہؓ تمام

تابعین، تمام ائمہ مجتہدین سب اصولیین، سارے متکلمین، اولیاء کاملین و عارفین، اکثر محدثین و فقہاء کے خلاف ہے۔

امام مالکؒ نے فرمایا کہ "قیاس خبر واحد پر مقدم ہے کیونکہ قیاس باجماع صحابہ حجت ہے، اور اجماع خبر واحد سے زیادہ قوی ہے لہذا جو امر اجماع سے ثابت ہے وہ بھی زیادہ قوی ہوگا"۔

نفی جواز قیاس کی رائے عہد تابعین کے بعد پیدا ہوئی ہے۔ اور معدودے چند محدثین و اصحاب ظواہر اس طرف گئے ہیں مثلاً امام بخاری، داؤد ظاہری، ابن حزم، ابن عربی وغیرہ۔ (ذب ذبابات الدراسات صفحہ/ ۹۸ صفحہ/ ۹۹)

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ حنفیہ کے نزدیک قول صحابی قیاس پر مقدم ہے، اور سنت مرفوعہ قیاس و قول صحابی دونوں پر مقدم ہے۔ ادبابہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ نرحمهم الله ما احسن او بهم و صنیعهم۔ (ذب صفحہ ۱۹۱)

غرض امام بخاری کا امام صاحب اور دوسرے اکابر حنفیہ کے خلاف جو کچھ رویہ رہا، اس کے لیے کوئی ایسی معقول وجہ اب تک ہمیں معلوم نہ ہو سکی، جو امام بخاری کی جلالت قدر کے لیے موزوں ہو، اور کافی مطالعہ و تفتیش کے بعد جو کچھ معلوم ہو سکا وہ ہم نے پہلے کئی جگہ لکھا ہے۔ مثلاً ابتدائی تعلیم حنفی شیوخ سے لینے کے بعد یک دم دوسرے مکتب فکر کے شیوخ سے وابستگی جو اکثر ردعمل کی صورت پیدا کیا کرتی ہے، خصوصاً ایسے شخص کے لیے جو زود متاثر ہو، اور پھر وہ شیوخ بھی امام صاحب وغیرہ سے سخت تعصب رکھتے تھے، مثلاً حمیدی اسحٰق بن راہویہ نضر بن شمیل وغیرہ،

مسئلہ ۲۔ لفظ بالقرآن میں امام بخاری اور ان کے استاذ شیخ ذہلی کا اختلاف ہے، اور اس میں شدت

بعض ۳۔ حنفی قضاۃ سے آپ کو تکلیف پہنچنا۔

بعض ۴۔ مسائل حنفیہ سے پوری طرح واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے اختلاف میں زیادتی

ایمان ۵۔ کے مسئلہ میں حنفیہ سے مزید توحش، جس کے بارے میں پوری تفصیل ابھی گذر چکی،

۶۔ انکار قیاس کی وجہ سے مذاہب اربعہ کی فقہ سے اختلاف، جس کے ضمن میں فقہ حنفی اور ائمہ حنفیہ سے بھی بعد لازمی تھا، وغیرہ۔ خلاصہ یہ کہ اسی قسم کے اسباب بہت سے ہو سکتے ہیں، مگر اس اختلاف کو طبقاتی اختلاف کہہ کر ہلکا کرنا صحیح نہیں ہو سکتا، اور اگر تھوڑی دیر کے لیے اس کو تسلیم بھی کر لیں تو اس کی وجہ سے امام صاحب، امام ابو یوسف، امام محمد وغیرہ پر بے سند اور غلط الزامات قائم کرنے کی وجہ جواز کیا ہو سکتی ہے؟!"

امت میں سے سب سے زیادہ خطیب بغدادی نے اکابر امت امام اعظم، اور امام احمد وغیرہ کے خلاف مواد اپنی تاریخ بغداد میں جمع کیا ہے، مگر انہوں نے ہر بات کو "روایتی سند کے ساتھ لکھا ہے، اگرچہ وہ روایتیں غیر معتمد اور متہم راویوں سے ہیں جن سے روایات کرنا ان کی مؤر خانہ شان کے خلاف تھا مگر بہر حال سند تو لکھی ہے، جس سے راویوں کے حالات پر نظر کی جا سکتی ہے، چنانچہ علامہ کوثری رحمتہ اللہ علیہ نے "تانیب الخطیب" میں ایک ایک سند پر بحث کر کے ان راویوں کا حال کھول دیا ہے، جس کے بعد یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ سارے اتہامات غلط اور بے بنیاد ہیں۔ لیکن امام بخاری جو ہر بات کو سند کے ساتھ روایت کرنے کا بڑا التزام کرتے ہیں اپنی تاریخ کبیر وغیرہ میں بھی جو بات کسی کے متعلق کہتے ہیں اس کے ساتھ اکثر حوالہ دیتے ہیں، اور جہاں حوالہ نہیں دیتے' وہ ان کی ذاتی تحقیق کہی جا سکتی ہے، مگر بڑی حیرت ہے کہ امام صاحب وغیرہ کے بارے میں جو کچھ تاریخ کبیر رسالہ قرأت خلف الامام وغیرہ میں لکھا، اس کے ساتھ کوئی سند نہیں لکھی، نہ کسی کا حوالہ دیا، ظاہر ہے کہ امام بخاری اور امام صاحب کے زمانے میں بہت فاصلہ ہے اس لیے ان کی اپنی ذاتی تحقیق بھی نہیں ہو سکتی۔

بہر حال! ہم نے جو کچھ امام بخاریؒ کی اس قسم کی جرح وغیرہ کے بارے میں لکھا تھا، وہ مجبور ہو کر لکھا تھا کہ آج بھی بہت سے مخالفین ائمہ حنفیہ کے خلاف امام بخاری وغیرہ کی آڑ لے کر فرض تبرا انجام دینے سے نہیں چوکتے۔ ولا نرید الا الا صلاح ما استطعنا یرحمنا الله و ایاهم جمیعا۔

درحقیقت امام صاحب وغیرہ کی طرف رائے کی نسبت بھی اسی طرح بطور طعن مشہور کی گئی تھی' جس طرح ارجاء کی نسبت پھر جس طرح ارجاء سنت وارجاء بدعت دو قسم کا تھا اور دونوں کا فرق عظیم آپ نے ہماری مذکورہ بالا تشریحات سے اچھی طرح سمجھ لیا ہے' اسی طرح رائے کا اطلاق بھی ''قیاس شرعی'' اور ''عقلی ڈھکوسلہ'' دونوں پر ہو سکتا تھا معاندین حنفیہ یا حقیقت حال سے ناواقف حضرات نے یہی مشہور کیا ہے کہ امام صاحب اور ان کے متبعین اصحاب الرائے دوسرے معنی سے ہیں' لیکن محققین نے ہر دور میں صحیح صورت حال کو سمجھا کہ امام صاحب وغیرہ قیاس شرعی کا استعمال کرتے ہیں جس کا بجز اصحاب ظواہر (داؤد ظاہری وغیرہ) کے کوئی محدث وفقیہ منکر نہیں' صحابہ' تابعین' ائمہ مجتہدین سب ہی نے اس کو اپنایا ہے' کبار محدثین میں سے امام مسلم' امام ترمذی' امام ابوداؤد' امام نسائی' امام ابن ماجہ' امام طحاوی' حضرت عبداللہ بن مبارک' حضرت یحییٰ القطان وغیرہ تو ائمہ مجتہدین کے مقلد تھے (اس لیے ان کے اتباع میں یہ سب اصحاب الرائے ہی تھے) فرق صرف اس قدر تھا کہ فقہاء عراق عالی احکام میں کسی قدر زیادہ تعبیر و توسیع سے کام لیتے تھے' اور جب تک قیاس شرعی بن سکے' تخصیص کو جائز نہیں رکھتے تھے' فقہاء حجاز اس قدر تعمیم کے قائل نہ تھے' اس لیے فقہاء عراق کی شہرت ''اہل الرائے'' کے لقب سے زیادہ ہوئی' یہ نہیں کہ ''وہ سنت نبوی کے مقابلہ میں قیاس کو جائز سمجھتے تھے' یا اہل بدعت کی طرح رائے کا اتباع کرتے تھے' حاشا وکلا' یہی اختلاف فقہاء عراق وحجاز کا خلاصہ' طویل بحث کے بعد' استاذ ابوزہرہ نے بھی بحث قیاس کے آخر میں لکھا ہے۔ (دیکھو صفحہ ۳۴۱)

معلوم ہوا کہ امام بخاری کا امام اعظم سے اختلاف فروعی مسائل میں تھا' نہ امام بخاری اصحاب ظواہر میں سے تھے' بلکہ وہ خود ایک درجۂ اجتہاد رکھتے تھے' (اگرچہ ان کے اجتہاد میں بقول ہمارے استاذ الاساتذہ حضرت شیخ الہند' ایک آنچ کی کسر رہ گئی تھی۔)

امام بخاری نے جن مسائل میں اجتہاد کیا ہے۔ ان میں کہیں امام صاحب کی موافقت ہے اور دوسرے ائمہ مجتہدین کی مخالفت اور کہیں برعکس ہے' مگر ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ کی تحقیق یہ ہے کہ پوری صحیح بخاری شریف میں موافقت کا پلہ بھاری ہے یہ ساری بحث فقہی نقطۂ نظر سے ہے جو اوپر کی غلط فہمی زائل کرنے کے لیے لکھی گئی' اس سے اس حقیقت کا انکار نہیں کہ امام بخاری کچھ اسباب وجود کے تحت امام صاحب اور ائمہ حنفیہ سے ناراض ومنحرف تھے' جس کا اظہار بھی وہ فرماتے رہے ان کی جلالت قدر اور علمی احسانات' نیک نیتی اور اخلاص کا کسی طرح انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن چونکہ امام اعظمؒ کا درجہ ومرتبہ نہ صرف امام بخاری وغیرہ کبار محدثین سے بلکہ دوسرے ائمہ مجتہدین سے بھی بہت بلند ہے' اس لیے ہمیں امام صاحب پر سے ان اتہامات کو بھی اٹھانا ضروری تھا' جو امام بخاری ایسے جلیل القدر امام ومحدث کی طرف سے ان پر عائد کیے گئے تھے۔ اس سلسلہ میں راقم الحروف نے پوری کوشش کی ہے کہ صحیح منازل ومراتب رجال میں کوئی اونچ نیچ نہ ہو پاوے' پھر بھی اپنی کوتاہیوں' لغزشوں' اور علمی بے مائگی کا اعتراف ہر قدم پر ہے' اور ناظرین باتمکین سے عفو ودرگزر کی بھی توقع ودرخواست ہے۔ **فمن عفا واصلح فاجرہ علی اللّٰہ۔**

امام بخاریؒ کے دلائل پر نظر

ایمان واعمال کے متعلق اصولی مباحث اور مختلف فرقوں کے عقائد ونظریات کی تفصیل ہو چکی ہے' یہاں ہم اختصار کے ساتھ امام بخاریؒ کے ان ۱۵ اشارات پر بھی کچھ لکھتے ہیں' جو انہوں نے کتاب الایمان کے شروع میں ضمن ترجمۃ الباب کیے ہیں۔

۱۔ باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم بنی الاسلام علی خمس' اس سے مقصد یہ ہے کہ ایمان مجموعۂ تصدیق واعمال ہے' امام بخاری چونکہ ایمان' اسلام' ہدایت' دین' تقویٰ سب کو شئی واحد سمجھتے ہیں' اس لیے یہاں اسلام کو بھی مرادف ایمان قرار دے کر استدلال کیا ہے' ورنہ حدیث میں یہاں ایمان کی تشریح نہیں ہے' اور جن احادیث میں تشریح ہے مثلاً حدیث جبریل میں وہاں ایمان واسلام کی تشریح الگ الگ ہے۔

مصنف ابن ابی شیبہ میں رواۃ ثقات سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول مروی ہے کہ ''اسلام علانیہ اور ظاہر چیز ہے اور ایمان

یہاں ہے (آپ نے اپنے سینہ پر ہاتھ رکھ کر اشارہ کیا معلوم ہوا کہ صحابہ دونوں کا فرق سمجھتے تھے بقول حضرت شاہ صاحب ایمان کے آثار پھوٹ کر جوارح کی طرف نکلتے ہیں جو ظاہری انقیاد و اطاعت اور اسلام ہے اور اسلام جوارح سے قلب کی طرف سرایت کرتا ہے ایمان (جس کی حقیقت تصدیق قلبی ہے) اس کو اقرار لسانی سے قوت اور اعمال صالحہ سے جلاء حاصل ہوتی ہے اور تصدیق و اذعان اگر اپنی جگہ صحیح و مکمل ہے تو وہ اقرار و اعمال پر ضرور مجبور کرتا ہے حضرت سفیان ثوری کا قول ہے اگر یقین جیسا چاہیے قلب میں پیدا ہو جائے۔ تو وہ فرط اشتیاق سے جنت کی طرف اڑتا ہے اور دوزخ سے بھاگتا ہے (فتح صفحہ ۱/۳۷) پھر ہر عمل صالح کا ایک نور ہوتا ہے جس قدر طاعات بڑھیں گی اسی قدر انوار بڑھیں گے اور ایمان میں رونق شادابی آئے گی اس کے برعکس معاصی ہیں کہ ہر معصیت ظلمت ہے اور قلب پر ایک سیاہ نقطہ پیدا کرتی ہے اگر توبہ کی تو وہ داغ دھل جائے گا ورنہ اسی طرح معاصی کے داغ بڑھتے بڑھتے تمام قلب کو گھیر لیتے ہیں غرض اسلام کے اندر حنفیہ بھی اعمال کو داخل مانتے ہیں اور ان کی اہمیت و اثرات سے بھی انکار نہیں۔

۲۔ امام بخاری نے فرمایا کہ ایمان قول و فعل ہے اور کم و بیش ہوتا ہے آپ نے سلف[۱] کے قول کو مختصر کر کے پیش کیا ان کا قول یہ تھا کہ ایمان طاعت سے بڑھتا ہے اور معصیت سے گھٹتا ہے۔ (کما نقلہ الحافظ ابو القاسم اللا لکائی واخرجہ ابو نعیم فی ترجمۃ الشافعی من الحیلۃ عن الربیع عن الشافعی ایضاً۔ فتح الباری صفحہ ۱/۳۶) یہ بات بالکل صاف تھی کہ ایمان بمعنی تصدیق قلبی و معنوی میں فرمانبرداری سے قوت و نمو حاصل ہوتا ہے اور معاصی سے کمزوری آتی ہے امام بخاری نے طاعت و معصیت کے الفاظ حذف کر کے اپنی خاص رائے کو مضبوط کیا ہے لہٰذا قول سلف سے استشہاد صحیح نہ ہوا۔

(۳) امام بخاری نے آیت **لیزدادوا ایمانا مع ایمانھم** پیش کی ظاہر ہے کہ یہ آیت صحابۂ کرام کے بارے میں نازل ہوئی اور ان کے کمال ایمانی میں کون شک کر سکتا ہے لہٰذا ان کے نفس ایمان کے اندر کمی و زیادتی کا مطلب صحیح نہیں ہو سکتا البتہ زیادتی باعتبار مومن بہ کے تھی یا نورانیت و انشراح کی زیادتی تھی جس کا انکار نہیں حافظ ابن تیمیہ نے لکھا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں دو قسم کے لوگ تھے ایک وہ کہ اجمالی اسلام کو قبول کیا پھر جب تکالیف و مصائب پیش آئے تو دل تنگی و کم حوصلگی کا ثبوت دینے لگے۔ دوسرے وہ کہ ایمان لانے کے بعد طرح طرح کے مصائب آنے پر اور زیادہ انشراح صدر کے ساتھ ایمان پر جم گئے یہ ان کی ثابت قدمی اور استقامت ہی ان کے پہلے ایمان پر ایمان کی زیادتی تھی۔

۴۔ **وزدناھم ھدی** اور بعد کی چار آیات امام بخاری چونکہ ہدایت و تقویٰ کو باعتبار مصداق عین ایمان سمجھتے ہیں اس سے استدلال کیا یہاں بھی جواب وہی ہے کہ یہ آیات اس وقت کی ہیں کہ مومن بہ کی تدریجی آمد ہو رہی تھی لہٰذا ایمان و ہدایت میں زیادتی ہو رہی تھی یا باعتبار کیفیت کے زیادتی مراد ہو اور یہ ہمارے یہاں بھی مسلم ہے کہ عام لوگوں کا ایمان صحابۂ کرام جبریل و میکائل اور انبیا علیہم السلام جیسا نہیں ہے۔

---

[۱] سلف کا مسلک کیا تھا؟:۔ حافظ ابو القاسم عبد اللہ لا لکائی نے "شرح اصول اعتقاد اہل السنت والجماعت" میں یہ قول نقل کر کے لکھا کہ یہی قول صحابہ میں سے حضرت عمرؓ علیؓ ابن مسعودؓ ابن عباسؓ ابن عمرؓ ابو ہریرہؓ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم وغیرہم اور تابعین میں سے کعب الاحبار عروہ عطاء مجاہد عمر بن عبد العزیزؒ وغیرہ بہت سے نام لکھے پھر ابن مبارک اسحق بن ابراہیم ابو عبید بن سلام دارمی ذہلی ابو زرعہ ابو حاتم ابو داؤد وغیرہ کے نام لکھے" (عمدۃ القاری صفحہ ۱۲۶ معلوم ہوا کہ ایمان کی زیادتی و کمی کا نظریہ مکملات وغیرہ کے باعث تھا صرف ایمان یا تصدیق سے متعلق نہ تھا بعد کے لوگوں نے نقل مذہب میں اختصار کر کے صرف یزید و ینقص لکھنا شروع کر دیا اور اسی کو لالکائی نے "کتاب السنن" میں بھی وکیع سعید بن عبد العزیز شریک ابو بکر بن ابی عیاش عبد العزیز بن ابی سلمہ حماد بن ابو ثور امام شافعی و امام احمد سے بھی نقل کیا ہے۔ (عمدہ صفحہ ۱۶۷)

پھر لکھا کہ امام نے فرمایا کہ یہ بحث لفظی ہے "اگر ایمان سے مراد تصدیق ہے تو زیادہ و کم نہ ہوگا اور اگر طاعات بھی ہیں تو ہو سکتا ہے پھر فرمایا کہ طاعات تصدیق کی تکمیل کرنے والی ہیں جو دلائل عدم قبول زیادۃ و نقص کے ہیں وہ سب اصل ایمان کی طرف لوٹتے ہیں جو تصدیق ہے جو دلائل قبول پر دال ہیں وہ کامل سے متعلق ہیں یعنی ایمان مع اعمال کے اور بعض متاخرین نے تصدیق کے قائل تو ۃ وضعف ہونے پر قبول زیادۃ و نقص کو رکھا ہے۔ اور بعض محققین نے دو وجہ قبول زیادۃ و نقص کی قرار دی ہیں ایک قوت و ضعف (جو کیفیات سے ہیں) دوسرے کمیت کے اعتبار سے قبل تقرر شرائع کے زمانے کے لحاظ سے۔ (عمدۃ القاری صفحہ ۱۶۸)

۵۔ **فاخشو ھم فزادھم ایماناً** یہاں ایمان سے مراد ثبات واستقامت ہے اس آیت میں واقعۂ بدر صغریٰ کی طرف اشارہ ہے' علامہ عینی نے صفحہ ۱۲۱/۱ میں لکھا ہے کہ ابوسفیان جب غزوۂ احد سے شکست کھا کر لوٹنے لگا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اگلے سال بدر کے میدان میں یہاں کا بدلہ چکایا جائے گا' حضورؐ نے فرمایا' بہت اچھا! ہم تیار ہیں' انشاء اللہ تعالیٰ' جب وہ وقت آیا تو ابوسفیان نے نعیم بن مسعود اشجعی سے (جو عمرہ کے لیے مکہ معظمہ گئے تھے) کہا کہ میں غزوۂ احد سے واپسی میں اس طرح کہہ آیا تھا اب اگر میں اپنے لوگوں کے ساتھ نہ جاؤں اور ادھر سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے ساتھیوں کے ساتھ میدان بدر میں پہنچ گئے تو اس سے ان کی جرأت وحوصلہ بہت بڑھ جائے گا' اور اصلی بات یہ ہے کہ یہ سال قحط کا ہے' لڑائی کے لیے نکلنا آدمیوں اور جانوروں کی ہلاکت کا مترادف ہے' اس لیے تم مدینہ جا کر ان لوگوں کا حوصلہ پست کرو' تا کہ وہ بھی میدان کا رخ نہ کریں' میں تمہیں اس کے صلہ میں دس اونٹ دوں گا۔

نعیم نے مدینہ منورہ پہنچ کر دیکھا کہ مسلمان جہاد کے لیے تیاریاں کر رہے ہیں تو کہا کہ تم گذشتہ سال احد کے غزوہ میں اپنے گھروں میں تھے اور وہ لوگ اتنی دور سے آئے تھے پھر بھی تمہیں پریشانی کا سامنا کرنا پڑا تھا' اب تمہارا اتنی دور مقابلہ کے لیے جانا کسی طرح مناسب نہیں ہے' اگر اس طرح تم مقابلہ کے لیے جاؤ گے تو خیال ہے کہ تم میں سے کوئی بھی بچ کر نہ آسکے گا۔ یہ بات سن کر منافق تو کچھ متاثر ہو گئے' مگر پکے سچے مسلمانوں کے دلوں میں صبر وثبات اور جہاد وشہادت کا ذوق وشوق لہریں لینے لگا' جس سے ان کے نور ایمان میں اور بھی زیادہ قوت آگئی' اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں ضرور نکلوں گا' خواہ میرے ساتھ ایک آدمی بھی نہ جائے (یہ پیغمبرانہ اولوالعزمی کی شان تھی) چنانچہ آپ ستر ۷۰ مجاہدین کے ساتھ بدر پہنچے۔ اس وقت **حسبنا اللہ و نعم الوکیل** ان کا ورد زبان تھا' مال تجارت بھی ساتھ تھا وہاں پہنچ کر تجارت کا سامان اچھے منافع سے فروخت کیا اور اسی طرح بغیر کسی قتال وجدال کے سالمین غالمین واپس ہوئے' اور اپنے لوگوں کے ساتھ ابوسفیان مکہ معظمہ پہنچے تو مکہ والوں نے اس لشکر کو 'جیش السویق' کا نام دیا اور کہا کہ تم تو ستو پینے کے لیے گئے تھے۔

۶۔ **ومازادھم الا ایماناً و تسلیما** میں ایمان سے مراد ذات خداوندی کی تعظیم واجلال ہے' یعنی اس ذات بے چون وچگوں کی عظمت وجلال کو اس طرح جاننا اور اس کا سکہ اپنے قلب پر بٹھانا کہ اس کی کامل اتباع وانقیاد نتیجۃً حاصل ہو' اور تسلیم کے معنی اس کی بات ماننا (عمل کے درجہ میں) یہ حضرت شاہ صاحب کی تعبیر ہے' اور فرمایا کہ اگر ایمان کا تعلق عقائد سے ہو تو وہ تصدیق قلبی والا ایمان ہے اور اگر اس کا تعلق ذات باری سے ہو تو وہ تصدیق قولی وانقیاد ظاہری ہے' جس کو تسلیم کہا جائے گا۔

اس آیت میں غزوہ خندق کی طرف اشارہ ہے جو ۵ ھ میں پیش آیا' اس وقت مسلمانوں پر چاروں طرف سے یورش کی گئی تھی' کفار نے بارہ ہزار یا چوبیس ۲۴ ہزار کی تعداد میں پورے سامان حرب سے تیار ہو کر مدینہ منورہ کا محاصرہ کیا تھا' اس وقت مدینہ منورہ میں مسلمان بمشکل چار ہزار ہوں گے۔ اور کفار کے مقابلہ میں میدان میں آنے والوں کی تعداد تو دو ہزار سے زیادہ نہ تھی ظاہر ہے کہ ایسے وقت میں ان میں خوف وہراس اور گھبراہٹ وتراس کی صورت پیدا ہونی چاہیے تھی مگر اس کے برعکس ان کے اندر ایمان وتسلیم اور استقلال واستقامت میں اضافہ ہوا۔ اور جب ان کی یہ کیفیت ہوئی تو حق تعالیٰ کی نصرت اور امداد بھی پوری طرح ان کی طرف متوجہ ہو گئی' رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر مدینہ کی اس جانب خندق کھدوائی تھی جس طرف سے کفار مکہ کے حملہ کا خطرہ تھا' یعنی شمال ومغرب کی سمت' خندق کافی گہری اور چوڑی تھی۔ جس پر جگہ جگہ مسلمان جاں باز متعین کر دیئے گئے تھے کہ دشمنوں کو آگے نہ بڑھنے دیں' ان کو خندق کو عبور کر کے مدینہ منورہ میں گھسنا بہت دشوار کر دیا تھا' اگر کوئی بہادر ہمت کر کے آگے بڑھنا بھی چاہتا تو محافظ دستے اس کو تیروں سے چھلنی کر دیتے تھے' ۲۸' ۲۹ روز تک کفار نے محاصرہ جاری رکھا' ان کی بہت تعداد تھی' کھانے پینے وغیرہ کے لیے مصارف اور مسلسل ناکامیوں نے ان کی ہمت پست کر دی' مزید حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمادی کہ یا اللہ! اپنے مخلص مومن بندوں کی مدد فرما اور کفار کو ایسی ہزیمت دے کہ پھر بار بار چڑھ دوڑنے کا حوصلہ ہی باقی

نہ رہے' چنانچہ ایسی زبردست آندھی آئی کہ کفار کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے خیمے اکھڑ اکھڑ کر دور جا پڑے سخت پریشان ہوئے اور سمجھے کہ بس اب قیامت ہی آ گئی' اور میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

۷۔ **والحب فی اللہ والبغض فی اللہ من الایمان** امام بخاری نے یہ استدلال کیا ہے کہ خدا کے واسطے محبت اور بغض بھی ایمان کا جزو ہیں' جو کہ احوال میں سے اور اکثر غیر اختیاری ہوتے ہیں' لیکن یہ استدلال اس پر موقوف ہے کہ من کو تبعیضیہ سمجھا جائے' ہم کہیں گے کہ ابتدائیہ واتصالیہ ہے' جیسے **"انت منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ"** میں ہے۔

۸۔ **کتب عمر بن عبد العزیز الخ** چونکہ آپ نے ایمان کے لیے فرائض' شرائع' حدود وسنن بتلائے' معلوم ہوا کہ ایمان ان سب سے مرکب ہے۔ یہ استدلال بھی ناقص ہے' کیونکہ اول تو ایمان کے لیے یہ خارجی چیزیں بتلائیں' یہ نہیں فرمایا کہ ایمان یہ سب امور ہیں' پھر استکمال کا لفظ بھی بتلا رہا ہے کہ یہ سب خارجی اوصاف ہیں' جن کا وجود ایمان کے لیے ضروری ہے۔ متممات نہیں فرمایا۔ جس سے جزئیت پر استدلال صحیح ہوتا۔

پھر یہ امر بھی پہلے واضح ہو چکا کہ ایمان کامل تو وہی ہے جو اعمال صالحہ اور احوال طیبہ سے مزین ہو' باقی نفس ایمان کی اصل حقیقت صرف وہی مرتبۂ محفوظ (غیر مرکب' ہے جو امام صاحب وغیرہ کی تحقیق ہے۔

۹۔ **ولکن لیطمئن قلبی**۔ اس آیت سے استدلال حنفیہ کے لیے زیادہ موزوں ہے' کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایمان نہ صرف کامل بلکہ اعلیٰ مراتب کمال میں موجود تھا' پھر اس میں زیادتی کا کیا سوال ہو سکتا ہے۔ **اولم تؤمن** اور **قال بلیٰ** سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ نفس ایمان حاصل تھا' اور مطالبہ زائد چیز کا تھا' جو خارجی کیفیات واحوال سے متعلق ہے۔

۱۰۔ **قال معاذ اجلس بنا نؤمن ساعۃ** یہاں مقصود صرف ایک ساعت کے لیے ایمان لانا نہیں ہے بلکہ حسب روایت حصن حصین **"جددوا ایمانکم بقول لا الہ الا اللہ"** تجدید واحضار ایمان مراد ہے' ظاہر ہے کہ ایمان کی نضرت وتازگی' اس کے حسن کی افزائش وبہار وغیرہ اصل ایمان کے علاوہ اوصاف ہیں۔

۱۱۔ **قال ابن مسعود "الیقین الایمان کلہ** یہاں لفظ کل سے استدلال کیا گیا ہے' کہ ایمان کے اجزاء ہیں' جب ہی تو کل کا اطلاق ہوا ہے' لہٰذا ایمان اجزاء سے مرکب ہوا' اس کی تائید روایت طبرانی سے بھی ہوتی ہے جس میں صبر کو نصف ایمان فرمایا ہے' لیکن اس کا جواب بھی یہ ہو سکتا ہے کہ اس سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ نفس ایمان کی پوری حقیقت تو یقین واذعان ہی ہے' جو تصدیق قلب ہے لہٰذا ایمان کی بساطت ظاہر ہوئی اور اشارہ اس طرف ہوا کہ یقین واذعان قلبی کے سوا دوسری سب چیزوں کا تعلق اسلام سے ہے کہ اسلام تمام اعمال و اخلاق حسنہ کا مقتضی ہے اور دین کا اطلاق ایمان واسلام دونوں پر آتا ہے۔ **ان الدین عند اللہ الاسلام** اور **رضیت لکم الاسلام دینا** اور مشہور حدیث جبرائیل میں فرمایا کہ ایمان واسلام دونوں کی تشریح آپ فرما چکے تو صحابہ سے ارشاد فرمایا کہ یہ جبرائیل تھے' جو تمہیں دین سکھانے آئے تھے' چنانچہ بغوی شافعی نے حدیث جبرائیل میں فرمایا کہ ایمان باطنی اعتقاد کا نام ہے اور اسلام ظاہری اعمال کا اور ان دونوں کا جامع دین ہے اور خدا کے یہاں دین وہی مرضی ومقبول ہے جو ایمان واسلام دونوں کو شامل ہو۔ (نووی شرح مسلم صفحہ ۲۵ انصاری دہلی)

امام نووی نے صفحہ ۲۶ میں یہ بھی لکھا کہ ہمارے اصحاب متکلمین میں سے محققین کا یہ قول ہے کہ نفس تصدیق میں کمی وزیادتی نہیں ہوئی البتہ ایمان شرعی میں کمی وزیادتی' ثمرات ایمان یعنی اعمال کے سبب ہوتی ہے اور اس صورت سے ایمان حسب ظواہر نصوص واقوال سلف کی ایمان بمعنی لغوی وایمان حسب اصطلاح متکلمین کے ساتھ مطابقت ہو جاتی ہے پھر امام نووی نے لکھا ہے کہ اگرچہ فی نفسہ متکلمین کی بات تو اچھی ہے' مگر ہماری سمجھ میں ایک بات یہ بھی آتی ہے کہ نفس تصدیق میں بھی کثرت نظر وفکر اور ادلہ وافرہ کے باعث زیادتی ہو سکتی ہے اور اسی لئے صدیقین کا ایمان دوسروں سے زیادہ قوی ہوتا ہے۔

ہماری طرف سے اس استدلال کا جواب صاف ہے کہ کیفیت کے اعتبار سے ایمان میں زیادتی وکمی ہم بھی مانتے ہیں۔ ہمیں اس کا انکارنہیں اسی لئے کسی مومن کو یہ حق نہیں کہ وہ اپنے ایمان کو صدیقین یا ملائکہ کے جیسا کہے' کیونکہ ان کے ساتھ کیفیات میں کوئی برابری نہیں ہو سکتی البتہ کم میں برابری ہے کہ جن چیزوں پر ان سب کو ایمان رکھنا ضروری ہے ہمیں بھی ان پر ایمان رکھنا ضروری ہے دوسرے یہ کہ ایمان تصدیق قلبی کا ایک خاص درجہ ہے جو بسیط ہے اس میں کمی وبیشی نہیں ہے' کمی کی صورت شک وریب والی ہے' اس لئے ایمان نہیں اور زیادتی کی صورتیں کیفیات کے لحاظ سے ہیں اس ۔لئے وہ بھی نفس ایمان سے زائد ہیں۔ معتزلہ اعمال کو شرط صحت ایمان ومتمات قرار دیتے ہیں' محدثین شرط کمال ایمان ومکملات کہتے ہیں' مرجئہ اعمال کو کوئی درجہ نہیں دیتے' حنفیہ ومتکلمین اعمال کو ضروری لازمی' شرط دخول اولی جنت اور بطور مقویات وحافظات مکملات[1] ایمان سمجھتے ہیں۔ متمات نہیں کہتے۔

مراتب ایمان واعمال پر دوسری نظر

تمام دلائل شرعیہ اور مذاہب اہل سنت کی روشنی میں اعمال صالحہ کو مقویات وحافظات یا مکملات ثانوی ہی کا درجہ دینا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے' جو حنفیہ ومتکلمین فقہاء ومحدثین احناف کا مختار ہے' اس کی ایک وجہ یہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ علماء نے روح کی غذا علوم نبوت کو قرار دیا ہے' اعمال کو نہیں' طاعات کو روح کے لیے بطور مقوی ومحافظ صحت ادویہ اور معاصی کو بطور ادویہ مہلکہ وبد پرہیزیوں کے قرار دیا ہے۔ پھر قلب اشرف اعضاء انسانی ہے۔ جس کے صلاح وفساد پر بمجوائے حدیث صحیح تمام جسم کا صلاح وفساد موقوف ہے۔ اس سے جو امور متعلق ہیں' ان کا مرتبہ بھی بہت بلند ہے' پھر ان میں سے ایمانیات وعقائد کا درجہ اول ہے اور اخلاق وملکات فاضلہ کا درجہ ثانوی ہے' اس کے بعد لسان کو دوسرے جوارح پر شرف ہے تو اس سے تمام کلمات طیبات' تلاوت کلام اللہ' دعاء' ذکر واستغفار' تعلیم وتعلم' درود وسلام وغیرہ متعلق ہوئے اس کے بعد دوسرے جوارح کے اعمال کا درجہ ہے' البتہ بعض اعمال فرض وواجب ہونے کی حیثیت سے افضل ہو جاتے ہیں (کہ طاعت نافلہ کی زیادہ سے زیادہ تعداد بھی ایک فرض کو نہیں پہنچتی) یا جس عبادت میں مختلف قسم کی طاعات جمع ہوں وہ دوسری عبادات سے افضل ہوگی۔ مثلاً نماز۔

---

[1] حضرت علامہ کشمیریؒ کی خاص تحقیق: یہاں مکملات کے سلسلہ میں حضرت شاہ صاحب کی ایک نہایت اہم تحقیق قابل ذکر ہے اس کو بھی پیش نظر رکھئے' فرمایا امام بخاری اور شوافع کے یہاں ایمان ایک مجموعہ مرکب ہے۔ جس کے اجزاء اعمال بھی ہیں' لیکن یہ بھی مانتے ہیں کہ اس کے بعض اجزاء وعقائد تو ایسے ہیں جن کے نہ ہونے سے ایمان ختم ہو جاتا ہے اور بعض اجزاء (اعمال وغیرہ) ایسے ہیں کہ ان کے نہ ہونے سے بھی ایمان باقی رہتا ہے اور ان اجزاء کو وہ اجزاء مسلمہ مانتے ہیں۔ اسی طرح نماز میں اختلاف ہے کہ شوافع اس کو مجموعہ ارکان وسنن ومستحبات کہتے ہیں' پھر یہ بھی کہتے ہیں کہ بعض اجزاء ایسے ہیں کہ ان کے نہ ہونے سے نماز نہ ہوگی اور بعض ایسے ہیں کہ ان کے نہ ہونے سے بھی نماز درست ہے' حنفیہ نے کہا کہ نماز مجموعہ ارکان ہے' فرائض اجزاء مقومہ ہیں اور سنن ومستحبات اس کے اجزاء مکملہ غیر مقومہ ہیں۔

پس اگر نزاع کا اصل محور اس امر کو قرار دیں کہ آیا کوئی حقیقت چند ایسے اجزاء سے مرکب ہو سکتی ہے یا نہیں جن میں سے بعض اجزاء کے نہ ہونے پر بھی کل کا اطلاق صحیح ہو سکتا ہو تو اس صورت میں تو شافعیہ کا نظریہ زیادہ صحیح ہے کیونکہ ایسی بہت سی چیزیں ملتی ہیں جن کے بعض اجزاء موجود نہ ہونے پر بھی ان پر کل کا اطلاق ہوتا ہے جیسے نماز وغیرہ اور اگر نزاع کا اصل محور اس امر کو مانیں کہ کسی شئی کے مکملات ہمیشہ اس کے صرف اجزاء ہی نہ ہوں گے بلکہ غیر اجزاء بھی ہو سکتے ہیں' تو حنفیہ کا نظریہ زیادہ صواب ہے کیونکہ ایمان پر اعمال کے عطف سے (جو تغایر کا مقتضی ہے) یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اعمال ایمان کے لئے اجزاء نہیں' اور پھر بھی مکملات ہیں' لہٰذا حنفیہ کے ہی مختار کو ترجیح ہوئی کہ ایمان مجموعہ مرکب نہیں ہے۔

البتہ اب یہ دیکھا جائے گا کہ "ایمان کا اطلاق جو اعمال پر احادیث میں بکثرت ہوا ہے اس کی وجہ کیا ہے؟ اگر کہا جائے کہ تصدیق پر اطلاق اصالتہً ہے اور اعمال پر تبعاً تو یہ توجیہ حنفیہ کی تائید کرتی ہے اور اگر کہا جائے کہ دونوں پر اطلاق بطور جزو کل کے ہے تو یہ بات شافعیہ کے موافق ہوگی۔ راقم الحروف کے نزدیک اجزاء شئی کو مکملات اولیہ اور غیر اجزاء کو مکملات ثانویہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم۔

نوٹ: حضرت شاہ صاحبؒ کی مذکورہ بالا تحقیق سے (اور اس قسم کے آپ کے فیصلے آئندہ بھی بہ کثرت آئیں گے) آپ کی شان انصاف اور دقت نظر پوری طرح نمایاں ہے اور یہی شان ہمارے دوسرے اکابر محققین حنفیہ کی بھی ہے۔ نفعنا اللہ بعلومھم المصمعۃ۔

مذکورہ بالا نظریہ کی تائید حافظ ابن تیمیہ کے اس قول سے بھی ہوتی ہے، جو ایمان واسلام کا فرق بتاتے ہوئے انہوں نے کتاب الایمان صفحہ ۱۴۹ میں لکھا ہے "فرق یہ ہے کہ اسلام دراصل عمل ہی عمل ہے اور ایمان ایک علم ہے عمل یہاں تابع ہے اس کے بعد اگر احادیث پر ایک اجمالی نظر ڈالو گے تو اس سے بھی تم کو معلوم ہوگا کہ وہاں بھی اس فرق کی رعایت کی گئی ہے یعنی اسلام کا تعلق ظاہر سے اور تصدیق کا باطن سے قرار دیا گیا ہے"۔

مسند احمد میں حضرت انس رضی اللہ عنہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ "اسلام ظاہر ہے اور ایمان دل میں ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا کہ "مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے کسی مسلمان کو تکلیف نہ پہنچے اور مومن وہ ہے جس کی طرف سے لوگ اپنے جان و مال کے لیے کوئی خطرہ محسوس نہ کریں"۔

ان تصریحات سے حنفیہ کے موقف کی پوری پوری تائید ہوتی ہے اور ہر امر کو اپنے اپنے صحیح مرتبہ ومقام میں رکھنے کی عملی شکل سامنے آ جاتی ہے، جس سے ائمہ حنفیہ و متکلمین کی دقت نظر و اصابت رائے کا یقین حاصل ہوتا ہے۔

۱۲۔ قال ابن عمر لا یبلغ العبد حقیقۃ التقوی الخ بعض روایات میں حقیقت الایمان آیا ہے، اور امام بخاری بھی چونکہ ایمان وتقویٰ کو ایک ہی سمجھتے ہیں اس لئے استدلال درست ہوگیا کہ بقول ابن عمر حقیقت ایمان کا حصول اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک ایسی باتوں کو بھی ترک نہ کر دیا جائے جو دل میں کھٹکتی ہوں۔ یعنی معمولی مشتبہ چیزوں سے بھی اجتناب چاہئے جو تقویٰ کا اعلیٰ مرتبہ ہے گویا امام بخاری ترقی کر کے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ بڑے اعمال ہی نہیں چھوٹے عمل بھی ایمان کے اجزاء ہیں جس کا حاصل یہ ہوگا کہ امام بخاری کی بات تو ٹھیک ہو جائے گی، مگر مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد حقیقت ایمان تک رسائی سے محروم قرار پائے گی، یہ وہی بات ہے کہ امام بخاری کے مزاج میں یک طرفہ رجحان کا مادہ زیادہ تھا جس کی وجہ سے افراط وتفریط تک نوبت پہنچ جاتی تھی اور اعتدال کی بات وہی ہے جو امام صاحب وغیرہ نے اختیار فرمائی۔

۱۳۔ قال مجاهد شرع لکم من الدین الخ امام بخاری نے اس طرح استدلال کیا کہ حضرت نوح علیہ السلام کے وقت سے اب تک دین وہی ایک ہے، اگرچہ جزئیات و فروع بدلتے رہے ہیں اور جب دین کے اجزاء اصول و فروع رہے ہیں تو ایمان کے بھی ہوں گے۔ کیونکہ امام بخاری دین وایمان کو ایک سمجھتے ہیں۔

یہاں بھی غلطی دونوں کو ایک سمجھنے سے ہوئی ہے، ہم نے امام نووی سے نقل کیا تھا کہ دین کا اطلاق ایمان واسلام دونوں کے مجموعہ پر ہوتا ہے۔ اور اسلام کی حقیقت میں ہمارے نزدیک بھی انقیاد ظاہری کے تمام اعمال داخل ہیں، لہٰذا ایمان جس میں بحث تھی، اس کے لیے یہ استدلال بے محل ہے، ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے بھی وقت درس فرمایا تھا کہ امام بخاری کا یہ استدلال بے محل ہے۔ اور امام بخاری کے اس استدلال کے مقابلہ میں بہت کچھ کہنے کی گنجائش ہے۔ واللہ اعلم و علمہ اتم

۱۴۔ قال ابن عباس "شرعة و منهاجا" ہر ایک کے لیے ہم نے چھوٹے اور بڑے راستے مقرر کئے، یعنی ہر امت کے لیے منہاج (بڑا راستہ اصول وعقائد کا) تو ایک ہی رہا مگر شریعتیں امتوں اور زمانوں کے مناسب حال بدلتی رہیں، امام بخاری نے استدلال کیا کہ فروع و شرائع کے اختلاف کے باوجود دین و منہاج ایک ہی رہا ہے، جس کے تحت عملی شرائع ہیں، یہاں بھی جواب حسب سابق ہے۔ کہ منہاج و دین یا سبیل و شرعت میں بحث نہیں ہے بلکہ ایمان میں ہے۔ جس سے استدلال ہٹ گیا۔ آپ اگر سب کو ایک کہنے لگیں تو یہ بات دوسروں پر تو حجت نہیں ہوسکتی۔ کما لا یخفی۔

۱۵۔ ودعاء کم ایمانکم"۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے دعاء کی تفسیر ایمان سے ہوئی حالانکہ وہ عمل ہے، معلوم ہوا کہ ایمان میں عمل داخل ہے، حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ میرے نزدیک آیت مذکورہ کو محل نزاع سے کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ وہ کافروں کے بارے میں ہے، پوری آیت آخر سورت فرقان میں ہے اور ترجمہ یہ ہے۔ کہہ دیجئے! میرے رب کو تمہاری پروا نہیں اگر تم اس کو نہ پکارو، سو تم جھٹلا چکے اب آگے کو ہوتی

ہے مڈبھیڑ (یعنی کافر جو حق کو جھٹلا چکے' یہ تکذیب عنقریب ان کے گلے کا ہار بنے گی' اس کی سزا سے کسی طرح چھٹکارا نہ ہوگا' آخرت کی ابدی ہلاکت تو ہے ہی دُنیا میں بھی اب جلد مڈبھیڑ ہونے والی ہے' یعنی لڑائی جہاد' چنانچہ "غزوۂ بدر" میں اس مڈبھیڑ کا نتیجہ دیکھ لیا"۔) (فوائد علامہ عثمانیؒ)

علامہ ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں لکھا کہ حضرت ابن عباسؓ کو تفسیر **و دعاء کم ایمانکم** کا مطلب یہ ہے کہ کفار کو حق تعالیٰ نے خبر دی "ان کی خدا کو ضرورت نہیں' اسی لیے ان کو ایمان کی دولت سے نہیں نوازا' ورنہ جس طرح مومنوں کے لیے ایمان کو محبوب بنا دیا تھا ان کے لیے بھی بنا دیتا۔ پھر فرمایا کہ تم تو حق کی تکذیب کر چکے ہو' پھر اس کا نتیجہ بھی جلد دیکھ لو گے (تفسیر ابن کثیر صفحہ ۳۲۰/۴ مطبعہ مصطفےٰ محمد)

حضرت شاہ صاحب کا جواب

مذکورہ بالا تشریحات سے آیت مستدلہ امام بخاری کا کفار کے حق میں ہونا واضح ہو چکا اس کے بعد ہمارے حضرت شاہ صاحب کی تحقیق پڑھیے' فرمایا کہ اگر دعا کو اپنے معنی میں رکھا جائے۔ تو اس سے مراد یہاں عرفی دعا نہیں بلکہ دلوں کی پکار اور خدا کی طرف توجہ قلبی وتضرع مراد ہے' جو بعض مرتبہ سخت مصائب و پریشانیوں میں گھر کر کفار سے بھی واقع ہوا ہے' جیسے قرآن مجید میں آیا' **واذا غشیھم موج کالظلل دعوا اللہ مخلصین لہ الدین**' (لقمان) مطلب یہ ہوا کہ حق تعالیٰ تمہارا خیال اس لیے فرما لیتے ہیں کہ تم اس کو پکار لیتے ہو' فتاویٰ قاضی خاں میں ہے کہ دنیا میں کفار کی دعاء بھی قبول ہوتی ہے' اسی طرح ان کے استغفار سے بھی دنیا میں ان کو نفع ہو سکتا ہے' مسلم کی حدیث میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ ابن جدعان (جو ایام جاہلیت میں مر گیا تھا) کیا اس کے صدقات سے اس کو نفع پہنچا ہوگا؟ آپ نے ارشاد فرمایا "نہیں' کیونکہ اس نے کبھی اپنی زبان سے خدا کی مغفرت ورحمت طلب نہیں کی تھی'۔ حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ اس سے میں سمجھا کہ استغفار سے کفار کو بھی نفع پہنچتا ہے' مگر دوزخ سے نجات نہ ملے گی۔

اور اگر دعا سے مراد حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی تفسیر کے مطابق ایمان لیا جائے تو حق تعالیٰ یہ تنبیہ فرما رہے ہیں کہ خدا جس چیز کا لحاظ وخیال فرماتے ہیں' وہ عرفی دعاء یا پریشانی ومصیبت سے گھبرا کر اس کو پکارنا نہیں' بلکہ ایمان ہے' جس کی وجہ سے اس کی رحمت خاصہ مومنوں کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ اگر ایمان نہیں تو وہ خصوصی فضل ورحمت کا معاملہ بھی نہیں' غرض حضرت شاہ صاحب کی رائے میں امام بخاری کا یہ استدلال بے محل ہے اس لیے کہ بحث ایمان شرعی اور مومنین کے ایمان میں ہے' اور یہ آیت کفار کے بارے میں نازل ہوئی ہے' راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ اگر امام بخاری کے استدلال کو برمحل کہیں گے اور تفسیر ابن عباس کی مدد سے دعاء کو ایمان یا جزو ایمان قرار دیں گے جس طرح اور جگہ امام بخاری نے استدلال کیا ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہو جائے گا کہ خاص اس مقام میں دعاء کفار کو ایمان یا ایمان کا جزو سمجھیں تو ایمان کی حقیقت کس قدر نیچے گر جائیگی کہ اس کا ایک جزو یا فرد مستحقین عذاب کفار کی تکذیب کے ساتھ بھی جمع ہو سکتا ہے' اور پھر ہمیں یہی کہنا پڑے گا کہ امام بخاری اپنے یک طرفہ رجحان کے غلو اور بہاؤ میں اتنی دور تک چلے جاتے ہیں جو ان کی جلالت قدر ورفعت شان علم کے لیے موزوں نہیں۔

امام صاحب کی دقت نظر

یہاں سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ امام صاحب رضی اللہ عنہ نے جو ایمان شرعی کا ایک محفوظ مرتبہ سمجھا ہے' جو ہر قسم کے شک وشبہ اور تکذیب سے بالاتر ہو' اس سے کم درجہ اگر کوئی ہے تو وہ کفر ہے ایمان ہرگز نہیں' پھر وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ ایسا ایمان ویقین جن ایمانیات و عقائد سے متعلق ہونا چاہیے' ان کو ماننے میں اولین وآخرین' ادنیٰ مومنین سے لے کر انبیاء ومرسلین تک سب برابر ہیں' یہ نہیں کہہ سکتے ہیں کہ مقرب فرشتوں یا برگزیدہ نبیوں کا ایمان زیادہ چیزوں پر ہوتا ہے' اور کم درجہ کے مسلمانوں کا کم چیزوں پر ہوتا ہے' اس کے بعد امام صاحب وغیرہ کو اس امر سے انکار ہرگز نہیں کہ سب کے مراتب یکساں نہیں' فرق مراتب سے جو کیفیات ایمان کے باعث ہوتی ہے بڑے سے بڑا

فرق ہوتا ہے حتیٰ کہ صرف حضرت صدیق اکبرؓ کا ایمان ساری امت کے ایمانوں سے زیادہ وزنی مانا گیا ہے' ہم یہ بھی لکھ آئے ہیں کہ سلف سے جو منقولہ امام بخاری نے نقل کیا ہے کہ ایمان قول وعمل' اور کم وزیادہ ہوتا ہے' اور یہ بھی فرمایا کہ میں ایک ہزار سے زیادہ لوگوں سے ملا' سب کا قول یہی تھا اور اپنے گہرے تاثر کا اظہار امام بخاریؒ نے اس سے بھی ظاہر کیا کہ میں نے

اپنی کتاب میں کسی ایسے شخص کی روایت نہیں لی۔ جو اس قول مذکور کا قائل نہیں تھا' ہم حوالوں سے لکھ آئے ہیں' اور حضرت شاہ صاحبؒ نے درس بخاری میں ارشاد فرمایا تھا کہ امام بخاری نے اس جملہ کو پورا نقل نہیں کیا۔ اور فرمایا کہ قول وعمل تو اس زمانے کے مقتضاء حال کے مطابق تھا کہ نساق وفجار نے ترک عمل وارتکاب کبائر کے لیے مرجئہ کی آڑ میں بہانے بنا لئے تھے' اس کی روک تھام کے لیے قول وعمل اہل حق کا شعار بن گیا تھا' دوسرا جملہ یزید وینقص والا یہ تھا کہ طاعات سے ایمان میں زیادتی اور معاصی سے نقص آتا ہے' جس کو امام بخاری نے مختصر کر دیا' تو طاعات سے زیادتی اور معاصی سے نقص کا کیفیت کے اعتبار سے امام صاحب وغیرہ کو بھی انکار نہیں' بلکہ ان سے اتنی بات تو نقل بھی کی گئی ہے کہ طاعات سے ایمان میں زیادتی ہوتی ہے' اور کوئی نقل اس قسم کی خود امام صاحب سے نہیں ملی کہ ایمان کے طاعات سے زیادہ ہونے اور معاصی سے ناقص ہونے کا انکار فرمایا ہو' اگر ایسا ہوتا تو یہ بات ضرور قول سلف کے خلاف وضد ہوتی' غرض اعمال صالحہ سے ایمان کے اندر نورانیت میں اضافہ اور انبساط وانشراح وغیرہ کیفیات پیدا ہونے سے حنفیہ کو بھی انکار نہیں ہے۔ **واللہ اعلم بالصواب۔**

حافظ عینی کے ارشادات

آخر میں اس سلسلہ کی تکمیل کے لیے راس المحققین' عمدۃ المحدثین' حافظ بدرالدین عینی کی وجوہ ثمانیہ کا خلاصہ درج کرتا ہوں۔

۱۔ اقرار لسانی ایمان کا رکن نہیں ہے' کیونکہ اس کا وجود وجود تصدیق قلبی کے لیے یا عدم اس کے عدم کے لیے دلیل قطعی نہیں ہے البتہ اجراء احکام ظاہری کے لیے شرط ہے' کیونکہ ان احکام کا مدار ظاہر پر ہی ہے' پس بدوں اقرار لسانی بھی خدا اور بندہ کے مابین ایمان کا تحقق ہو جاتا ہے' کیونکہ حدیث صحیح میں ہے کہ ''دوزخ سے وہ شخص بھی نکال لیا جائے گا جس کے دل میں ذرہ بھر بھی ایمان ہوگا'' تو ایسا شخص جس کو خدا کی پوری معرفت حاصل ہوگئی اور تمام عقائد پر پختگی بھی اس کو حاصل ہے اور اس کا دل نور ایمان سے معمور ہو چکا ہے پھر محض زبان سے کلمہ نہ پڑھنے کی وجہ سے اس کو غیر مومن کیونکر کہہ سکتے ہیں۔

اگر کہا جائے کہ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اقرار لسانی ایمان میں معتبر نہ ہوا اور یہ خلاف اجماع ہے' کیونکہ اس امر پر اجماع ہو چکا ہے کہ وہ معتبر ہے'' خلاف صرف اس میں ہے کہ رکن ہے یا شرط جواب یہ ہے کہ امام غزالی نے اجماع کا انکار کیا ہے' اور شخص مذکور کے مومن ہونے کا حکم کیا ہے اور باوجود قدرت یا وقت ملنے کے اقرار لسانی نہ کرنے کو منجملہ معاصی قرار دیا ہے اور بعض حالات میں ترک اقرار بحالت اختیار کا جواز بھی ان کے یہاں مفہوم ہوتا ہے۔

۲۔ اعمال جوارح ایمان میں داخل نہیں ہیں' کیونکہ آیات میں عمل صالح کو ایمان سے الگ کر کے عطف کے ذریعے بتایا گیا ہے۔ اگر وہ ایمان میں داخل تھے' تو تکرار بے فائدہ ہوا۔

۳۔ آیات قرآنی میں ایمان کے ساتھ ضد عمل صالح کو ذکر کیا گیا ہے جیسے **وان طائفتان من المؤمنین اقتتلوا الایۃ** حالانکہ ایک چیز کو اس کے جزو کی ضد کے ساتھ ملانا درست نہیں ہے' معلوم ہوا کہ عمل صالح ایمان کا جزو نہیں ہے۔

۴۔ آیت **الذین آمنوا و لم یلبسوا ایمانھم بظلم** میں ظلم سے مراد ارتکاب محرمات ہیں' اگر طاعت ایمان کا جزو ہوتی تو ظلم و ایمان سے خود ہی منفی ہوتا' کیونکہ ضد جزو الشئی' اس سے منفی ہوا کرتا ہے' ورنہ اجتماع ضدین لازم آئے گا۔ پس ایسی صورت میں **ولم یلبسوا**

ایمانھم بظلم کا عطف الذین آمنوا پر تکرار بے فائدہ ہوا۔

۵۔حق تعالیٰ نے بہت سی آیات میں ایمان کو صحت اعمال کے لیے شرط قرار دیا جیسے واصلحوا ذات بینکم و اطیعوا اللہ ورسولہ ان کنتم مومنین ۔ و من یعمل من الصالحات و ھو مومن۔ وغیرہ اور قاعدہ ہے کہ شرط شئی' اس کی ماہیت وحقیقت سے خارج ہوتی ہے۔

۶۔حق تعالیٰ نے بندوں کو وصف ایمان کے ساتھ خطاب کیا' پھر ان کو اعمال بجالانے کے احکام دیئے جیسے کہ آیات صوم وصلوٰۃ ووضوء میں اس سے معلوم ہوا کہ عمل مفہوم ایمان سے خارج ہے' ورنہ تحصیل حاصل کی تکلیف لازم آئے گی۔

۷۔حدیث جبریل میں ایمان کے سوال پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف تصدیق پر اکتفا فرمایا کہ فلاں فلاں باتوں پر ایمان لاؤ اور آخر میں یہ بھی فرمایا کہ یہ جبرائیل تھے جو تمہیں دین سکھانے آئے تھے' پس اگر ایمان میں تصدیق کے علاوہ اعمال وغیرہ بھی داخل تھے' تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کیوں بیان نہیں فرمایا' اور جبریل علیہ السلام نے بجائے تصدیق کے اصلاح کیوں نہیں دی؟ دین سکھانے آئے تھے' تو ایسے مغالطہ والی بات کو صاف نہ کرتے' یہ کیونکر ممکن تھا؟

۸۔حق تعالیٰ نے مومنین کو توبہ کا حکم فرمایا یاایھا الذین آمنوا توبوا الی اللہ توبۃ نصوحا و توبوا الی اللہ جمیعا ایھا المومنون جس سے معلوم ہوا کہ ایمان معصیت کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے' حالانکہ کوئی چیز اپنے جزو کی ضد کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی۔ (عمدۃ القاری صفحہ ۱/۱۲۴)

اگر کہا جائے کہ حدیث میں لا یزنی الزانی حین یزنی و ھو مو من آیا ہے تو حدیث ہی میں "من قال لا الہ الا اللہ دخل الجنۃ وان زنی وان سرق بھی وارد ہے۔ نیز حدیث میں ہے کہ جو توحید و رسالت کا اقرار کرے اس کو جنت سے روکنے والی کوئی چیز نہیں ہے تاہم اہل حق اہمیت وفرضیت اعمال اور ترک اعمال وارتکاب کبائر پر استحقاق عذاب ومحرومی دخول اولی جنت کے قائل ہیں' اور فرقہ' باطلہ مرجئہ ان امور سے منکر ہے' کہتا ہے کہ ایمان کی موجودگی میں ارتکاب معصیت یا ترک اعمال پر کوئی موخذہ نہیں ہوگا واللہ یھدی من یشاء الی صراط مستقیم

۷۔حدثنا عبید اللہ بن موسیٰ قال انا حنظلۃ بن ابی سفیان عن عکرمۃ بن خالد عن ابن عمر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنی الاسلام علیٰ خمس شھادۃ ان لا الہ الا اللہ وان محمدا رسول اللہ واقام الصلوٰۃ وایتآء الزکوٰۃ والحج و صوم رمضان۔

ترجمہ:۔حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے اس امر کی شہادت دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں' اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں' نماز قائم کرنا۔ زکوٰۃ ادا کرنا' حج کرنا' اور رمضان کے روزے رکھنا۔

تشریح:۔اسلام کو مع ارکان خمسہ کے خیمہ سے تشبیہ دی گئی ہے' جس طرح ایک خیمہ کو قائم رکھنے کے لیے ایک عمود وقطب (درمیانی بانس یا دوسری مضبوط و مستحکم لانبی لکڑی) کا ہونا ضروری ہے' جس پر پورا خیمہ قائم ہو جاتا ہے اور اس کے پھیلاؤ کو قائم رکھنے اور تند و تیز ہواؤں سے محفوظ رکھنے کے لیے چاروں طرف اوتاد (کھونٹے) گاڑ کر اطناب (رسیوں) سے باندھ دیا جاتا ہے' اور اس کی تکمیل ہو جاتی ہے اسی طرح اسلام کو ایک خیمہ سمجھئے' جس کا عمود وقطب' شہادت توحید و رسالت یا ایمان وتصدیق قلبی ہے۔ اور اس کے دوسرے تمام شعبے' اعمال' اخلاق' وغیرہ بطور اوتاد واطناب ہیں کہ یہ سب مکملات ایمان اور مقویات وحافظات ہیں چنانچہ حضرت سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے کسی جنازہ پر اجتماع کے موقعہ پر مشہور شاعر فرزدق سے فرمایا کہ تم نے اس مقام کے لیے کیا تیاری کی ہے؟ انہوں نے کہا اتنے برسوں سے شہادت توحید پر قائم ہوں' حضرت حسنؓ نے فرمایا:۔ یہ تو عمود ہے اطناب کہاں ہیں؟ یعنی اعمال صالحہ (کذا فی المرقاۃ)

اس کے علاوہ حدیث معاذ رضی اللہ عنہ سے بھی اسی کی تائید ملتی ہے' جس کو ترمذی' نسائی' امام احمد وغیرہ نے روایت کیا ہے۔ غزوہ تبوک کے لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے صحابہ ساتھ نکلے' راستہ میں ایک تنہائی کا موقع پا کر معاذ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ

عمل دریافت کیا جو جنت میں لے جائے' آپ نے فرمایا' دین اسلام کا راس رئیس عمل تو شہادت توحید و رسالت ہے' پھر جس عمل سے دین کی بندش مضبوط و مستحکم ہوتی ہے وہ نماز پڑھنا اور زکوٰۃ دینا ہے اور اس کے اونچے عملوں میں سے سب سے اوپر اور چوٹی کا عمل خدا کی راہ میں جہاد کرنا ہے' پھر آخر میں فرمایا کہ فرض نماز کے بعد جہاد فی سبیل اللہ کے برابر کوئی نیکی نہیں'' ایک حدیث طبرانی وطیالسی کی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے سوال فرمایا' تم جانتے ہو' ایمان کو تھامنے والے دستوں میں سب سے زیادہ مضبوط ہینڈل (دستہ وعروہ) کون سا ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا'' نماز'' فرمایا نماز بہت اچھی ہے مگر اس کا دائرہ عمل دوسرا ہے' پھر عرض کیا'' روزہ'' آپ نے پھر اسی طرح فرمایا' صحابہؓ نے جہاد کا ذکر کیا' اس پر بھی آپ نے اسی طرح فرمایا' پھر فرمایا' ایمان کے عروون میں سے سب سے زیادہ مضبوط و مستحکم عروہ خدا ہی کے لیے دوستی اور خدا ہی کے لیے دشمنی ہے اور اسی کی وجہ سے کسی سے محبت کرنا اور اسی کے لیے کسی سے بغض رکھنا''۔

اس قسم کی تمام احادیث سے واضح ہے کہ ایمان کی تکمیل' حفاظت واستحکام کے لیے سارے اعمال کام دیتے ہیں یہ نہیں کہ خود ایمان کی جنس سے یہ سب اعمال جوارح ہیں' یا اس کے اجزاء مقومہ یا مکملہ ہیں۔ واللہ اعلم۔

پھر اگر کہا جائے کہ ایمان واسلام کے تو ۷۰-۷۷ تک شعبے ہیں' یہاں صرف چار کا ذکر کیوں کیا گیا تو ملا علی قاریؒ نے جواب دیا۔

کہ ان میں سے اہم ترین ارکان کا ذکر کر دیا گیا ہے' علامہ عینی نے فرمایا کہ عبادات دو قسم کی ہوتی ہیں قولی جیسے اداء کلمہ شہادت' یا غیر قولی اور وہ بھی دو قسم کی ہے' ترکی جیسے صوم' یا فعلی اور بھی دو قسم ہے۔ بدنی جیسے نماز' یا مالی جیسے زکوٰۃ' یا بدنی ومالی دونوں کا مجموعہ جیسے حج' اس طرح ہر قسم کی عبادات کی طرف اشارات فرما دیئے گئے۔

حافظ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ اسلام کیا ہے؟ ایک خدائے وحدہ لا شریک کے سامنے عبادات کے لیے سرنگوں ہو جانا' اب اگر دین اسلام کا تجزیہ کرو تو اس میں چند قسم کے احکام پاؤ گے۔

۱۔ وہ احکام جو سب پر یکساں واجب ہیں۔

۲۔ وہ احکام جو خاص خاص افراد سے متعلق ہیں' پہلی قسم میں ایک بڑا حصہ صرف فرض علی الکفایہ ہے کہ ہر شخص پر واجب نہیں' جیسا کہ جہاد' امر بالمعروف نہی عن المنکر' امارت' حاکم' قاضی' مفتی' شہادۃ وغیرہ ان سب کا تعلق خاص مصالح اور عارضی اسباب سے وابستہ ہے' فرض کر لو اگر یہ مصالح ہماری نقل وحرکت کے بغیر حاصل ہو جائیں تو یہ احکام واجب نہیں رہتے' اسی طرح حدود وغیرہ کے ابواب ہیں ان کا تعلق بھی چند جرائم کے ساتھ ہے' اگر اس کا انسداد ہو جائے تو ان ابواب کی حاجت بھی نہیں رہتی' دین کا دوسرا حصہ وہ ہے جس کا تعلق حقوق العباد سے ہے جیسا کہ قرض کی ادائیگی غصب وعاریت' ودیعت وامانت وغیرہ تمام ابواب انسانوں کے حقوق کے تحفظ اور مظلوم کی دادرسی کے لیے ہیں اگر صاحب حق معاف کر دے تو یہ ابواب بھی معطل ہو جاتے ہیں صلہ رحمی' حقوق زوجیت' حقوق اولاد پڑوسی' شریک' فقیر وغیرہ ان احکام کا تعلق بھی سب کے ساتھ نہیں بلکہ خاص خاص افراد سے ہے وہ بھی خاص خاص اوقات میں اسی طرح شریعت کے بقیہ ابواب پر بھی ایک اجمالی نظر ڈال جائیے اور غور کیجئے کہ اب وہ کون سے احکام ہیں جو ہر فرد پر واجب ہیں اور کسی وقتی مصلحت پر بھی مبنی نہیں' اور انسان کے انقیاد ظاہری و باطنی کا ایک مکمل ثبوت بھی ہیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہی مبانی خمسہ ہیں' اسی لیے حدیث مذکور میں صرف ان پانچ ہی کو اسلام کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ (کتاب الایمان۔ صفحہ ۱۴۶٬۱۲۶)۔

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ توحید کی دعویٰ دار تو دنیا کی اکثر قومیں ہیں' اور ایک قسم کا ناقص اقرار توحید کچھ مذاہب میں پایا بھی جاتا ہے مگر مکمل صحیح وخالص توحید جو توحید الوہیت' توحید ربوبیت' اور توحید صفات سب پر شامل ہے' صرف مذہب اسلام میں پائی جاتی ہے' اور وہی راس الطاعات' لب الاعتقادات' ام العبادات' اور راس القربات ہے' پھر مسلمانوں میں عقائد واعمال کی زیادہ صحیح تعبیر اہل سنت والجماعت میں فروعی مسائل میں حق وانصاف ائمہ احناف کے ساتھ اور موجودہ دور کے مسائل میں حق واعتدال علماء دیوبند کی طرف ملے گا۔ واللہ اعلم۔

''توحید باری تعالیٰ'' پر بہت سے دلائل عقلی ونقلی قائم ہیں اور قرآن مجید کی بعض آیات میں بھی دلائل عقلیہ کی طرف رہنمائی کی گئی ہے' مثلاً آیت سورۂ انبیاء **لو کان فیھما الھۃ الا اللہ لفسدتا** یا آیت سورۂ مومنون **و ما کان معہ من الہ اذا لذھب کل الہ بما خلق و لعلا بعضھم علی بعض** اس برہان کو ''برہان تمانع'' کہا جاتا ہے۔ جس کی بہترین توضیح وتقریر حضرت نانوتوی قدس سرہٗ نے ''تقریر دلپذیر'' میں کی ہے' اور اس کا دلنشین خلاصہ'' حضرت علامہ عثمانیؒ نے فوائد صفحہ ۴۱۹ میں حسب ذیل کیا ہے:۔ (اس میں ہم نے معمولی تصرف کیا ہے)

''عبادت کامل تذلل کو کہتے ہیں جو صرف اسی ذات کے سامنے اختیار کیا جاسکتا ہے' جو اپنی ذات وصفات میں ہر طرح کامل ہو' اسی کو ہم اللہ یا خدا کہتے ہیں' اس کو ہم تمام عیب ونقائص سے پاک سمجھتے ہیں' وہ نہ کسی حیثیت سے ناقص ہے نہ بے کار ہے' نہ عاجز ہے نہ مغلوب کوئی اس کے کسی کام میں کسی وقت بھی روک ٹوک نہیں کرسکتا' وہ مختار مطلق ہے۔ (**یفعل ما یرید** ' **یفعل ما یشاء**' **فعال لما یرید** اور **لا یسئل عما یفعل** اس کی شان ہے' اب اگر فرض کرلیں کہ آسمان وزمین میں دو خدا ہیں تو ظاہر ہے کہ وہ دونوں اسی شان کے ہوں گے پھر دیکھنا یہ ہے کہ عالم کی تخلیق اور علویات وسفلیات کی تدبیر دونوں کے کلی اتفاق سے ہوتی ہے یا گاہ بگاہ ان کے باہم اختلاف بھی ہوجاتا ہے' اتفاق کی صورت میں دو احتمال ہیں یا تو اکیلے ایک سے کام نہیں چل سکتا ہے اس لئے دونوں نے مل کر انتظام کیا تو معلوم ہوا کہ دونوں میں سے ایک بھی کامل قدرت والا نہیں' اور اگر ایک تنہا سارے عالم کا کامل طور پر انتظام کرسکتا ہے تو دوسرا بیکار ٹھیرا اس کو ماننے سے کیا فائدہ؟ خدا کو وجود تو اسی لیے ماننا پڑا ہے کہ اس کے مانے بغیر چارہ ہی نہیں اور اگر اختلاف کی صورت فرض کریں تو لامحالہ مقابلہ میں ایک مغلوب ہوکر اپنے ارادہ وتجویز کو چھوڑ بیٹھے گا تو وہ خدا نہ رہا' اور یا دونوں مساوی ومتوازی طاقت سے ایک دوسرے کے خلاف اپنے ارادہ وتجویز کو عمل میں لانا چاہیں گے۔ اول تو معاذ اللہ خداؤں کی رسہ کشی میں سرے سے کوئی چیز موجود ہی نہ ہوسکے گی' اور موجود بھی ہوگئی تو پھر اس کشمکش میں ٹوٹ پھوٹ کر ختم ہو جائے گی' غرض آسمان وزمین میں اگر دو خدا ہوتے تو ان کا یہ مضبوط ومحکم نظام کبھی کا درہم برہم ہوجاتا۔

حضرت علامہ عثمانیؒ نے اس تحقیق کا حوالہ صفحہ ۴۵۱ میں دیا ہے' مگر سورۂ انبیاء کی جگہ سورۂ حج کا حوالہ غلطی کتابت یا طباعت سے درج ہو گیا ہے' توحید کے بعد عبادات وطاعات کا درجہ ہے' ان کی حقیقت' ان کے مقصد' اور ان کے باہمی ارتباط کو سمجھنے کے لیے بھی حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کی دلنشیں اور جامع مانع تحریر سے بہرہ اندوز ہوجایئے۔

عبادت در حقیقت' عبدیت اور بندگی کی ایک عملی ٹریننگ ہے' عبدیت در حقیقت وہ صحیح رشتہ ہے جو بندہ اور اس کے معبود کے درمیان قائم ہے جتنے آسمانی دین آئے وہ اسی رشتہ کو سمجھانے کو اور اس کے حقوق بتانے کو آئے' باپ بیٹے' دوست دوست' ہمسایہ ہمسایہ کے رشتے حتیٰ کہ امتی اور رسول کا رشتہ بھی ایک مخلوق کا دوسری مخلوق کے ساتھ قائم ہوسکتا ہے اور نہ اس میں اثنینیہ کی گنجائش ہے وہ صرف مخلوق اور اس کے خالق کے درمیان قائم ہے اس رشتہ کو صرف سمجھانا نہیں ہے بلکہ اس کے ایک ایک طرز ادا سے ہم کو رنگین بنانا بھی ہے اگر اس رشتہ کا تجزیہ کرو تو جو اس کے بڑے بڑے عنصر نظر آئیں گے وہ صرف دو ہیں' طاعت ومحبت ہر غلام کا فرض ہے کہ وہ اپنے مولا کے سامنے ہمہ تن اطاعت ہو مگر وہ اطاعت نہیں جو ذوق ومحبت سے خالی ہو' اس کا فرض ہے کہ وہ اپنے مولےٰ سے محبت کرے مگر وہ محبت نہیں جس میں سر مخالف کی گنجائش باقی ہو' یہ دونوں فرائض بڑی حد تک بندوں کے ساتھ بھی مشترک ہیں' شریعت چاہتی ہے کہ ان مشترک فرائض کے درمیان ایک ایسا خط فاصل کھینچ دے جس کے بعد دونوں کی حدود میں کوئی اشتراک باقی نہ رہے اسی کا نام عبادت ہے۔

داغ عبدیت وتاج خلافت

دشواری یہ ہے کہ انسان فطرۃً داغ عبدیت برداشت نہیں کرتا اس لیے اس کے سامنے ایک ایسا آئین رکھا گیا ہے جسے وہ سمجھے اور پھر اس پر عمل پیرا ہوکر اس منزل تک پہنچ جائے جہاں یہ داغ عبدیت تاج خلافت کا سب سے آبدار موتی نظر آنے لگتا ہے اس لیے اسے صرف سمجھایا

نہیں گیا بلکہ عملی طور پر بھی اس کی ٹریننگ دی گئی۔ جس کے اثر سے تدریجاً اس کی فطرت اطاعت ومحبت کی خوگر ہوتی چلی جائے سب سے پہلے مولیٰ حقیقی نے اپنے ایسے ایسے خوبصورت نام بتائے جن میں حسن وخوبی کا جلوہ بھی ہے اور حکومت وسلطنت کا دبدبہ بھی۔ اور ہمیں حکم دیا کہ ہم ان ناموں سے اسے پکارا کریں اس کا نتیجہ نفسیاتی طور پر یہ ہونا چاہیے کہ اس کے حسن وجمال کا بے کیف وبے مثال نقش ہمارے دل پر جمتا چلا جائے اس کے ساتھ اس کی بے پناہ قدرت وطاقت کا تسلط بھی قلب پر چھاتا چلا جائے اور ان اسماء کے لحاظ سے عبادات میں یہ تقسیم کر دی گئی:۔

عبادات کی تقسیم

کچھ عبادتیں تو وہ رکھیں جو اس کی حکومت کا سکہ دل پر قائم کریں اور جو کچھ وہ جو جذبۂ محبت بھڑکائیں اب اگر تم ذرا غور کرو گے تو اسلام کی عبادت میں نماز اور زکوٰۃ تمہیں پہلی قسم میں نظر آئیں گی اور روزہ حج دوسری قسم میں نماز وزکوٰۃ میں تمام تر بارگاہ سلطنت وحکومت کا ظہور ہے اور روزہ وحج میں سرتاسر محبوبیت واجمال کا جلوہ۔

نماز: نماز کیا ہے؟ حاضری کے ایک عام نوٹس کے بعد لباس وجسم کی صفائی اس کے بعد کورٹ کی حاضری کے لیے تیاری وکیل کا انتخاب پھر کورٹ میں پہنچ کر دست بستہ باادب قیام دائیں بائیں دیکھنے بات چیت کرنے کھانے پینے حتیٰ کہ بلا وجہ کھانسنے اور نظریں اٹھانے تک کی ممانعت آخر میں بذریعہ وکیل درخواست پیش کرنا پھر باادب سلام کر کے واپس آ جانا۔

زکوٰۃ: زکوٰۃ پر غور کیجئے تو اس میں بھی غلام کی طرح اپنی کمائی دوسرے کے حوالے کر دینا سرکاری ٹیکس وصول کرنے والے آئیں تو ان کو راضی کر کے واپس کر دینا اور جو وہ لینا چاہیں بے چون وچرا ان کے سپرد کر دینا۔

اب سوچو اگر پانچ وقت اسی طرح حاضری اور اتنی عاجزانہ جبہ سائی کی تا بعمر ٹریننگ حاصل کی جائے۔ پھر سال بھر میں اپنا کمایا ہوا مال ایسی خاموشی اور بیچارگی سے سپرد کیا جائے تو کیا اس ذات کی ملکوت وجبروت کا نقش دل پر قائم نہیں ہوگا۔ جس کے پرشوکت اسماء پکارتے پکارتے اور یہ عاجزانہ عبادتیں کرتے کرتے عمر بسر ہوگئی۔

روزہ: دوسری طرف اگر غور کرو تو محبت کا پہلا اثر کم خفتن کم گفتن کم خوردن ہی ہوتا ہے اس لیے اگر پہلے ہی قدم میں یہاں کوئی عاشق نہیں ہے تو یہ فرض قرار دیا گیا ہے کہ وہ اس جمیل مطلق کی محبت کی عشقانہ ادائیں ہی اختیار کرے کھانا پینا ترک کرے راتوں کو اٹھ اٹھ کر اپنی نیند خراب کرے اور ایک جگہ جمع ہو کر اس کلام کی ایک معقول مقدار سنا کرے جسے سن کر مردہ روحیں بھی تڑپنے لگتی ہیں اگر ایک ماہ کی اس ٹریننگ سے اس کے رنگ ڈھنگ طور وطریق میں کچھ عاشقانہ انداز پیدا ہو گیا ہے تو اب اس کو دوسرا قدم اٹھانا چاہیے اور وہ یہ ہے۔

حج: جب کھانے پینے سونے جاگنے اور دنیا کے دوسرے لذائذ میں اس کے لیے کوئی لذت نہیں رہی تو اس کو اب کوئے یار کی ہوا کھانا چاہیے یہاں زیب وزینت تزک واحتشام درکار نہیں بلکہ سرتاسر ذل وافتقار ہمہ تن عجز وانکسار شکستہ حال واشکبار برہنہ پاؤں وجاں نثار غرض کہ سرتا پا دیوانہ وار چلنا مقصود ہے یہی احرام کا خلاصہ ہے پھر لق ودق میدانوں کی صحرا نوردی اور لیلائے حقیقت کے سامنے چیخ وپکار یہی تلبیہ اور میدان عرفات کا قیام ہے اس کے بعد ایک ایسے گھر کے سامنے حاضری ہوتی ہے جس کا مکیں کوئی نہیں مگر یوں معلوم ہوتا ہے کہ کسی کے حسن وجمال کی کرنیں اس کے ہر ہر پتھر سے پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی ہیں اور دلہائے عشاق کو پاش پاش کیے دیتی ہیں ایسے دل کش نظارہ کے موقع پر بے ساختہ وہی فرض ادا کرنا پڑتا ہے جو مجنوں نے دیار لیلیٰ کو دیکھ کر ادا کیا تھا اسی کا نام طواف ہے۔

روزہ وحج کا ارتباط

شاید صوم وحج کے اسی ربط کی وجہ سے ماہ رمضان کے بعد ہی حج کے ایام شروع ہو جاتے ہیں۔

جہاد:۔ اگر جذبہ محبت اس سے بھی آگے ترقی کر جائے تو آخری منزل جہاد ہے یہ عشق ومحبت کی وہ آخری منزل ہے جہاں پہنچ کر محب صادق ومدعی کاذب نکھر جاتے ہیں۔

قرآن کریم میں جہاد کی ایک حکمت یہ بھی بتائی گئی ہے اس میدان سے جو بھاگا وہ اس لائق نہیں سمجھا جاتا ہے کہ پھر خدا اور رسول کی محبت کا دم بھر سکے اور جس نے ذرا کوئی کمزوری دکھائی اس پر پھر بیوفائی کا دھبہ لگے بغیر نہیں رہتا' اس میدان کا مرد صرف وہ ہے جو اپنی موت کو اپنی زیست پر ترجیح دیتا نظر آئے' دشمن کی تلوار کی چمک اس کو اتنی محبوب ہو جائے کہ سو جان سے گلے لگانے کی آرزو ہو اور وہ بڑے جذبہ کے ساتھ یہ کہتا ہوا خدا کی راہ میں قربان ہو جائے

عمریست کہ آوازہ منصور کہن شد من از سر نو جلوہ دہم دار و رسن را

''یہ وہ عاشق صادق ہے کہ جب اس طرح پروانہ وار اپنی جان دے دیتا ہے تو قرآن کو اسے مردہ کہنے پر غیرت آتی ہے وہ اعلان کرتا ہے کہ وہ زندہ ہے اگرچہ تمہیں اس کی زندگی اور اس زندگی کے مقام بلند کا شعور نہیں''

مولانا مرحوم کے اس نقشہ کے مطابق نماز اور زکوٰۃ' روزہ اور حج کا علیحدہ علیحدہ ربط واضح ہو جاتا ہے اگر یہ چاروں عبادتیں اس تصور سے ادا ہوتی رہیں تو ممکن نہیں کہ طاعات ومحبت کی دونوں شاخیں جو ایک عبد کے لئے مطلوب ہیں پیدا نہ ہو جائیں۔

(ترجمان السنہ صفحہ ۵۸۷ تا صفحہ ۱/۵۸۹)

باب امور الایمان وقول الله عزوجل لیس البر ان تولوا وجوهكم قبل المشرق والمغرب ولكن البر من امن بالله الى قوله تعالى المتقون' قد افلح المؤمنون الاية

۸- حدثنا عبدالله بن محمد ن الجعفی قال ثنا ابو عامر ن العقدی قال سليمان بن بلال عن عبدالله بن دينار عن ابی صالح عن ابی هريرة عن النبی صلی الله عليه وسلم قال "الايمان بضع وستون شعبة والحياء شعبة من الايمان.

ترجمہ:- باب امور ایمان کے بیان میں' حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ نیکی صرف یہ نہیں کہ تم (عبادت کے وقت) اپنے چہرے مشرق یا مغرب[1] کی طرف کرلو بلکہ بڑی نیکی یہ ہے کہ آدمی خدا پر ایمان لائے (وغیرہ آخر آیت تک) اور حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ بیشک ان ایمان والوں نے فلاح حاصل کرلی جو اپنی نمازوں میں خشوع کرنے والے ہیں (وغیرہ آخر آیت تک)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ ایمان کے کچھ اوپر ساٹھ شعبے ہیں اور حیاء بھی ایمان کا ایک شعبہ ہے۔

تشریح:۔ امام بخاریؒ نے اس باب کے عنوان وترجمہ میں دو آیات پیش کی ہیں اول لیس البر الایۃ جس کا شان نزول یہ ہے کہ یہود ونصاریٰ کے لئے خرابی عقائد واعمال پر جو عذاب خداوندی وغیرہ کا ذکر سابقہ آیات میں ہوا تو انہوں نے کہا کہ ہمیں عذاب کیوں ہوگا' ہم تو ہدایت یافتہ اور مستحق مغفرت ہیں' کیونکہ نماز جیسی افضل عبادات کو خدا کے حکم ومرضی کے موافق قبلہ کی طرف رخ کر کے پڑھتے ہیں' اس سے بڑی نیکی کیا ہوگی؟ اس پر حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ان لوگوں کا یہ خیال صحیح نہیں' سب سے بڑی اور بنیادی نیکی تو ایمان باللہ وغیرہ عقائد کی درستگی ہے اور اس کے ساتھ دوسرے اعمال کی صحیح طور سے ادائیگی اس لئے یہود ونصاریٰ کا صرف اپنے استقبال قبلہ پر ناز کرنا اور محض اس کی وجہ سے اپنے کو ہدایت یافتہ اور مستحق مغفرت سمجھنا خیال خام ہے تاوقتیکہ ان سب اعتقادات' اخلاق واعمال پر قائم نہ ہوں' جو مذکورہ بالا آیت کریمہ میں مذکور ہیں۔

حضرت علامہ کشمیری قدس سرہ نے اس موقع پر یہ بھی فرمایا کہ یہاں ''نفی بر'' کی تعمیم صرف یہود ونصاریٰ کے ''زعم باطل'' کے مقابلہ

---

[1] زمخشری نے کہا کہ خطاب اہل کتاب کو ہے کیونکہ یہود مغرب (بیت المقدس) کی طرف نماز پڑھتے تھے اور نصاریٰ مشرق کی طرف (عمدۃ القاری صفحہ ۱/۱۳۴)

میں کی گئی ہے کہ انہوں نے الاھم فا لاھم کی رعایت ترک کردی تھی' ورنہ ظاہر ہے کہ فی نفسہ قبلہ کی طرف توجہ بھی معمولی نیکی نہیں ہے بلکہ اعمال جوارح میں سے بڑی نیکیوں میں شمار ہے کیونکہ ایک دو یا چند نیکیاں بھی خواہ وہ اپنی جگہ کتنی ہی اہم اور بڑی ہوں اگر ان کے ساتھ کسی درجہ کی بھی ایمان وعقائد کی خرابی شامل ہے' یا دوسرے اعمال واخلاق کی طرف سے لاپروائی ہے تو وہ چند نیکیاں بے سود ورائیگاں ہیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے اسی آیت کا اقتباس حدیث ''لیس من البرا الصیام فی السفر'' کو قرار دے کر داؤد ظاہری کے استدلال کو باطل فرمایا جو اس حدیث سے سفر میں روزہ رکھنے کو قطعاً باطل وناجائز کہتے ہیں' حضرت شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ وہاں بھی ایسی ہی صورت تھی کہ بعض صحابہ نے رمضان میں روزے کے ترک کو باوجود مشقت سفر وشدت حر وغیرہ کے بھی گوارہ نہ کیا' جس سے ان پر غشی طاری ہوگئی' حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو آپ نے تنبیہ فرمائی کو نیکی کو اسی میں منحصر سمجھنا کوئی دینی سمجھ نہیں ہے بلکہ موقع ومحل کی مناسبت اور الاھم فالاھم کی رعایت سے عمل کرنا چاہئے' لہٰذا جس وقت عزیمت پر عمل دشوار ہو تو رخصت پر عمل کرنا زیادہ مناسب ہے۔

حضرت شاہ نے کچھ مزاح کے انداز میں یہ بھی فرمایا کہ لوگوں کی ایک قسم نیک بخت بیوقوفوں کی بھی ہے اور اس حدیث سے ان ہی کی اصلاح مقصود ہے کیونکہ ایسے لوگ گو نیک بخت ہوتے ہیں مگر قلت تفقہ کے باعث معمولی باتوں کا اہتمام کرتے ہیں اور امور مہمہ عظیمہ کی طرف سے غفلت برتتے ہیں۔

دوسری آیت قد افلح المومنون الایۃ میں بھی ایمان کے ساتھ اعمال صالحہ شمار کئے گئے ہیں' جن سے اعمال کی اہمیت واضح ہے' لیکن امام بخاری کا مقصد یہ ہے کہ تمام امور متعلقہ ایمان' اجزاء ایمان ہیں' اسی لیے ان کو ساتھ ذکر کیا گیا' پھر حدیث میں ایمان کے ساٹھ سے اوپر شعبے بتلائے ہیں' جس میں اعمال واخلاق سب ہیں' لہٰذا ایمان کا ان سب سے مرکب ہونا ثابت ہوا۔ لیکن یہ استدلال صحیح نہیں کیونکہ دونوں آیتوں میں تو ایمان پر اعمال کا عطف کیا ہے۔ جس سے جزئیت کے خلاف مغایرت مفہوم ہو رہی ہے اور حدیث میں بھی شعبوں سے مراد فروع وآثار ایمان ہیں۔

علامہ قسطلانیؒ نے فرمایا کہ حدیث میں ایمان کو تنوں اور شاخوں والے درخت سے تشبیہ دی گئی ہے اور یہ مجازاً ہے کیونکہ ایمان لغۃً تصدیق ہے اور عرف شرع میں تصدیق قلب ولسان کا نام ہے' جس کی تکمیل طاعات سے ہوتی ہے' لہٰذا ایمان کے کچھ اوپر ساٹھ شعبے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اصل کا فرع پر اطلاق کیا گیا ہے۔ ایمان اصل ہے اور اعمال اس کی فروع' اور یہ اطلاق مجازی ہے قبول زیادت ونقصان کی صورت میں بھی اعمال ہی کے باعث ہے اور امام شافعی وغیرہ نے جو اعمال کو رکن ایمان قرار دیا ہے۔ وہ ''ایمان کامل'' کے اعتبار سے ہے اسی لئے تارک اعمال ان کے نزدیک حقیقت ایمان سے خارج نہیں ہوتا ہے' البتہ معتزلہ کے نزدیک خارج ہوجاتا ہے' قالہ العلامۃ التفتازانی (شروح البخاری صفحہ ۱۴۴)

ایمان کی کتنی شاخیں ہیں

یہاں بضع وستون کی روایت ہے مسلم شریف کی ایک روایت میں بضع وسبعون ہے دوسری میں بضع وسبعون او بضع وستون شک کے ساتھ ہے ابوداؤد ترمذی میں بضع وسبعون بلاشک ہے۔

قاضی عیاض نے فرمایا کہ تمام احادیث اور سب رواۃ پر نظر کرکے بضع وسبعون ہی راجح ہے' امام نوویؒ نے فرمایا کہ صواب یہی ہے کہ بضع وسبعون کو ترجیح دی جائے' کیونکہ ثقات کی زیادتی مقبول ہے دوسرے یہ کہ بضع وستون کی روایت ماسوا روایات کے منافی نہیں ہے کیونکہ تخصیص بالعدد نفی زائد پر دلالت نہیں کرتی' تیسرے یہ بھی احتمال ہے کہ کم والی روایات ابتدائی ہوں۔ پھر شعبے بڑھتے رہے ہوں گے۔

امام حافظ ابو حاتم ابن حبان بستی نے فرمایا کہ ''میں نے اس حدیث کے بارے میں مدت تک تتبع کیا اور طاعات کو شمار کرتا رہا تو عدد مذکورہ حدیث سے بہت بڑھ گیا۔ پھر صرف کتاب اللہ وسنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری مراجعت کے بعد ۷۹ شعبے دریافت ہوئے نہ کم نہ زیادہ' اس سے میں سمجھا

کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد کتاب وسنت سے ثابت شدہ عدد ہے ذکرہ ابوحاتم فی کتاب ''وصف الایمان و شعبه'' (شروح البخاری صفحہ ۱۳۴)
بضع کے اطلاق میں بہت سے اقوال ہیں' زیادہ صحیح تین اور دس کے درمیان کا قول ہے' لہٰذا ۷۹ کا عدد راجح ہوا واللہ اعلم پھر علماء نے ان شعبوں کی تعیین کے لئے بہت سی کتابیں مستقل طور سے تصنیف کی ہیں جن میں شعب الایمان امام بیہقی کی بہت مشہور ہے۔
شیخ عبدالجلیل نے بھی اسی نام سے کتاب لکھی ہے اور محدث شہیر شیخ محمد مرتضیٰ زبیدی حنفیؒ نے ان دونوں کتابوں کا خلاصہ کیا ہے جس کا نام ''عقد الجمان'' رکھا اور سب سے بہتر فوائد وتحقیقات عالیہ کے اعتبار سے شیخ ابوعبداللہ حلیمی کی کتاب المنہاج ہے۔
حافظ نے فتح الباری میں ابن حبان کی توضیح وتشریح کو زیادہ پسند کیا اور اسی کو ہم یہاں ذکر کرتے ہیں۔ شعب ایمان کا تعلق قلب' لسان اور بدن تینوں سے ہے اور ہر ایک کے ماتحت شعبوں کی تفصیل حسب ذیل ہے۔
۱۔ اعمال قلب کی (جن میں معتقدات ونیات شامل ہیں) ۲۴ خصلتیں' ایمان باللہ (جس میں اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات پر یقین اور اس امر کا اعتقاد شامل ہے کہ اس جیسا کوئی نہیں اور اس کے سوا سب حادث ہیں) ایمان فرشتوں پر' آسمانی کتب پر' انبیاء ومرسلین پر' قدر خیر وشر پر' یوم آخرت پر (جس میں قبر کا سوال' بعث ونشور' حساب' میزان' صراط' جنت ونار پر یقین شامل ہے) خدا کی محبت' دوسروں سے خدا کے لئے حسد وبغض' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت ومحبت (جس میں درود شریف اور آپ کی سنت مطہرہ کا اتباع شامل ہے) اخلاص (جس میں ترک ریاء ونفاق شامل ہے) توبہ' خوف' رجاء' شکر' صبر' وفاء عہد' رضا بالقضاء' توکل' رحم وشفقت' تواضع (جس میں بڑوں کی توقیر شامل ہے) ترک کبر وعجب' ترک حسد' ترک حقد وکینہ' ترک غضب'
۲۔ اعمال لسان' سات خصلتوں پر شامل ہیں:۔ کلمہ توحید زبان سے ادا کرنا۔ تلاوت قرآن مجید' علم دین کا سیکھنا۔ دین کا علم سکھانا' دعا' ذکر (جس میں استغفار شامل ہے) لغو باتوں سے اجتناب۔
۳۔ اعمال بدن' ۳۸ خصلتوں پر مشتمل ہیں۔ ان میں سے ۱۵ کا تعلق اعیان سے ہے۔ پاکی حسی حکمی (جس میں نجاستوں سے بچنا بھی شامل ہے) ستر عورت' نماز' فرض ونفل' زکوٰۃ' فرض ونفل' فک رکاب' جود (جس میں کھانا کھلانا شامل ہے) اکرام ضیف' روزہ' فرض ونفل' حج وعمرہ' فرض ونفل' طواف' اعتکاف' التماس لیلۃ القدر۔ دین کو بچانے کی سعی (جس میں دارالشرک سے ہجرت بھی شامل ہے) نذر کو پورا کرنا' ایمان میں تحری وادا کفارات۔
چھ خصلتیں وہ ہیں جن کا تعلق اپنے خاص متعلقین واتباع سے ہے (۱) نکاح کے ذریعہ عفت اختیار کرنا (۲) عیال واولاد کے حقوق کی نگہداشت کرنا اور تربیت کرنا (۳) بروالدین یعنی ان کے ساتھ حسن سلوک (جس میں ان کی نافرمانی سے بچنا بھی شامل ہے) صلہ رحم (۵) سرداروں کی اطاعت (۶) غلاموں اور ماتحتوں کے ساتھ نرمی کا معاملہ۔
۱۷ خصلتیں وہ ہیں جن کا تعلق دوسرے لوگوں سے ہے۔ (۱) حاکم ہو کر عدل کرنا۔ (۲) متابعت جماعت' (۳) اطاعت اولی الامر (۴) اصلاح بین الناس (جس میں قتال خوارج وبغاۃ شامل ہے) (۵) بر ونیکی کے کام میں اعانت (جس میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر بھی شامل ہے) (۶) اقامت حدود' (۷) جہاد (جس میں مرابطہ شامل ہے) (۸) ادائے امانت (جس میں ادائیگی خمس شامل ہے) (۹) ضرورت مند کو قرض دینا اور قرض کی ادائیگی (۱۰) اکرام جار (۱۱) حسن معاملہ (جس میں حلال طریقہ پر مال جمع کرنا شامل ہے' (۱۲) مال کو طریقہ حق میں صرف کرنا (جس میں ترک تبذیر واسراف شامل ہیں) (۱۳) سلام کا جواب دینا (۱۴) چھینکنے والے کو یرحمک اللہ کہنا' (۱۵) لوگوں کو ایذا پہنچانے سے باز رہنا (۱۶) لہو ولعب سے اجتناب' (۱۷) راستے سے تکلیف دینے والی چیز ہٹانا۔ یہ سب ۶۹ خصلتیں ہوئیں' اور اگر تفصیل کردی جائے کہ بعض جگہ کئی خصلتیں ایک نمبر میں آگئی ہیں تو عدد ۷۹ ہو جائے گا۔ واللہ اعلم۔ (شروح البخاری صفحہ ۱/۱۳۵)
قلبی وساوس:۔ شعب ایمان کی تفصیل وضاحت کے بعد ایک اہم امر قابل تنبیہ یہ ہے کہ شیطان جس طرح انسان کو بے عمل اور بدعمل بنانے کے لئے اپنی ہر ممکن کوشش کرڈالتا ہے اسی طرح انسان کے دل میں وساوس پیدا کر کے اس کو بے ایمان بنانے میں بھی کسر اٹھا کر نہیں

رکھتا اس لئے ایک شخص وساوس قلبی کا شکار ہو کر نہایت پریشان ہو جاتا ہے اور اس کو خطرہ ہوتا ہے کہ کہیں ایمان کی لازوال دولت سے محروم نہ ہو جائے' اس لئے اس سلسلے کی چند احادیث لکھی جاتی ہیں۔

۱- حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے میری امت سے دلوں کے برے خیالات و وساوس کو معاف فرما دیا ہے جب تک ان پر عمل نہ کیا جائے یا زبان سے کچھ نہ کہا جائے' ان پر کوئی مواخذہ نہ ہوگا (بخاری و مسلم)

۲- ایک شخص نے عرض کیا کہ کبھی کبھی میرے دل میں ایسے برے خیالات آتے ہیں کہ جل کر کوئلہ ہو جانا مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ میں ان کو زبان سے ادا کروں' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خدا کا شکر ہے کہ اس بات کو وسوسہ سے آگے نہ بڑھنے دیا۔ (ابوداؤد)

۳- اسی طرح چند صحابہ نے حال عرض کیا تو آپ نے دریافت فرمایا کیا واقعی ایسا ہوا؟ عرض کیا' جی ہاں! آپ نے فرمایا کہ یہ تو خالص ایمان کی علامت ہے (مسلم)

باب: "المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده"۔

۹- حدثنا ادم بن ابی ایاس قال حد ثنا شعبة عن عبد الله بن ابی السفر و اسمعیل عن الشعبی عن عبد الله بن عمرو عن النبی صلی الله علیه وسلم قال" المسلم من سلم المسلمون من لسانه و یده والمهاجر من هجر ما نهی الله عنه "قال ابو عبد الله و قال ابو معاویة ثنا داود بن ابی هند عن عامر قال سمعت عبد الله بن عمرو یحدث عن النبی صلی الله علیه وسلم و قال عبد الاعلیٰ عن داود عن عامر عن عبد الله عن النبی صلی الله علیه وسلم۔

باب۔ ''مسلمان وہ ہے (جس کی زبان اور ہاتھ سے) مسلمان محفوظ رہیں''۔

ترجمہ:۔ حضرت عامر شعبی نے حضرت عبداللہ بن عمرو سے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے کہ سچا مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ (کے ضرر) سے مسلمان محفوظ رہیں' مہاجر وہ ہے جو ان کاموں کو چھوڑ دے جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔

تشریح:۔ سچا اور پکا مسلمان وہ کہلائے گا جو کسی دوسرے مومن بھائی کو اپنے ہاتھ سے یا اپنی زبان سے کوئی نقصان نہ پہنچائے' اسی طرح اصل ہجرت یہ ہے کہ آدمی اللہ کی منع کی ہوئی باتوں سے رک جائے یعنی سراسر اللہ کا اطاعت گزار بن جائے اس حدیث میں مہاجرین کو خاص طور پر اس لئے ذکر کیا تاکہ لوگ صرف ترک وطن کو ہجرت سمجھ کر دین کی دوسری باتوں میں سستی نہ کرنے لگیں یا بتلایا کہ فتح مکہ کے بعد ہجرت منسوخ ہو جانے پر اب ہجرت کا ثواب اس طرح آدمی کو حاصل ہو سکتا ہے کہ وہ حرام باتوں کو قطعاً چھوڑ دے (یہ حدیث مسلم میں نہیں ہے' اس لئے بخاری کی ان حدیثوں میں شامل ہے جو افراد بخاری کے نام سے موسوم ہیں)

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اسلام جس طرح خدائے تعالیٰ کے ساتھ ایک خاص رابطہ و معاملہ ہے اسی طرح وہ لوگوں کے ساتھ بھی ایک معاملہ و رابطہ خاصہ ہے اور یہ اس دین کا خصوصی امتیاز ہے گویا ایک مسلمان کے دل کی آواز دوسرے ملنے والے کے لئے ہوتی ہے کہ تم مجھ سے مطمئن و بےخوف رہو اور میں تم سے مطمئن ہوں۔

اسلام سے پہلے عہد جاہلیت میں لوگوں کا شب و روز مشغلہ خوں ریزی' ہتک عزت اور لوٹ مار تھی' اسلامی شریعت نے ان تمام مفاسد کو ممنوع و حرام قرار دیا اور لوگوں کو ایک دوسرے کی طرف سے مطمئن زندگی گزارنے کا موقع دیا اور ہر ملاقات کے وقت ''السلام علیکم'' کہنے کو اسلامی شعار قرار دیا جس کا بہت بڑا اجر و ثواب بتلایا' حدیث میں ہے کہ آپس میں بکثرت سلام مسنون کا رواج دو' ایک دوسرے کو کھانا کھلاؤ' جنت میں بسلامت و کرامت داخل ہو جاؤ گے' یہ بھی حدیث میں ہے کہ سلام میں چھوٹے بڑے کی تخصیص نہیں ہر ایک کو ابتداء کی فضیلت حاصل کرنی چاہئے اور جان پہچان پر بھی مدار نہیں' اس لئے بہتر ہے کہ ہر مسلمان کو سلام کیا جائے خواہ اس کو جانتے ہو یا نہ جانتے ہو۔

پھر جواب دینے والے کو مزید تاکیدات ہیں کہ جواب سلام اس پر واجب کیا' اور جواب میں زیادہ بہتر اور زائد الفاظ ادا کرنے کی ترغیب دی' مثلاً اگر السلام علیکم کہے تو دوسرا وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ کہے' وہ اگر السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہے تو یہ وعلیکم السلام ورحمۃ وبرکاتہ کہے' جواب میں زیادہ بلند وصاف آواز اختیار کرنے کی بھی ترغیب ہے تاکہ پہلا آدمی اچھی طرح سن لے اور اس کا دل زیادہ خوش ہو جائے۔

سلام کرنے میں اور جواب دینے میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ پورا مجمع اور جماعت ایک شخص واحد کے حکم میں شمار ہے اسی لئے ایک بڑے مجمع میں سے ایک شخص مقابل آنے والے کو سلام کہہ دے تو وہ سب کی طرف سے ہو جائے گا اور اسی طرح جواب دینے والوں میں سے بھی صرف ایک شخص جواب دے گا تو وہ بھی ان سب کی طرف سے کافی ہو جائے گا یعنی سب سے وجوب ساقط ہو جائے گا' فرض کیجئے کہ ایک مسلمان ریڈیو پر مسلمانان عالم کو خطاب کر کے سلام کہے تو ساری دنیا کے مسلمانوں پر جو اس کی آواز سنیں گے جواب سلام واجب ہو جائے گا۔ مگر کسی ایک کے جواب دے دینے سے بھی سب کی طرف سے ادا ہو جائے گا اور دور سے بھی ادا ہو جائے گا جس طرح خطوط میں ہوتا ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے تھے کہ ایسی متعدد چیزیں ہیں' جن میں جماعت کو شخص واحد کے درجے میں قرار دیا گیا ہے یا ایک شخص سب کا قائم مقام ہو جاتا ہے جس طرح یہاں سلام میں ہے یا مسئلہ امان میں کہ اگر حرب کے وقت مسلمانوں میں سے ایک شخص بھی کسی ایک یا زیادہ اہل حرب کفار کو امن دے دے گا تو اس کا امن دے دینا سب کی طرف سے سمجھا جائے گا۔ یعنی سارے مسلمانوں پر ان کفار کی حفاظت جان و مال فرض ہو جائے گی' یا سترہ ہے کہ صرف امام کے سامنے ہو تو وہ سارے مقتدیوں کے لئے کافی ہے خواہ وہ ہزاروں لاکھوں بھی ہوں اور اسی طرح حنفیہ کی نماز جماعت بھی ہے کہ امام ضامن (ذمہ دار) ہے۔ اس کی نماز کی صحت پر سب کی نمازوں کی صحت موقوف ہے اور صرف امام کی قرات سارے مقتدیوں کی طرف سے کافی ہو جاتی ہے۔ "قراۃ الامام قراءۃ لمن خلفہ"۔

غرض یہاں یہ بتلانا تھا کہ اسلام دوسروں کے لئے بہت بڑی ضمانت اس امر کی ہے کہ ان کو ایک مسلمان سے کوئی ضرر و نقصان نہیں پہنچ سکتا' یہی وجہ ہے کہ دارالاسلام میں کفار و مشرکین اہل ذمہ کے لئے حفاظت جان و مال آزادی کاروبار عدل وانصاف آزادی عبادات وغیرہ کے وہی حقوق ہیں جو مسلمانوں کے ہیں' دارالاسلام کے سارے مسلمانوں کے لئے بھی کسی ایک ادنیٰ کافر ومشرک کی معمولی توہین یا اضاعت مال بھی جائز نہیں کسی کی مذہبی توہین یا بڑے نقصان جان و مال کا تو امکان ہی نہیں' دارالاسلام کو دارالاسلام صرف اس لئے کہتے ہیں کہ وہاں اسلام کی شوکت' اسلامی احکام وشعار کی ترویج اور مسلمانوں کے جان و مال کی حفاظت گارنٹی کے ساتھ ہوتی ہے' لیکن اسی کے ساتھ جو کفار وہاں رہتے ہیں ان کی بھی پوری حفاظت جان و مال وآبرو حکومت اسلامی کا فرض اولین ہے' اگر اس میں کوتاہی ہے تو وہ اسلام پر بدنما داغ ہے۔

اسلامی شریعت نے تو ذمی کفار و مشرکین کی عزت اور جان و مال کو مسلمانوں کی عزت و مال کے برابر مساوی درجہ دے دیا ہے حتیٰ کہ ذمی کافر ومشرک کی غیبت تک کو حرام قرار دیا ہے' اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک بوڑھے ذمی فقیر کو دیکھا کہ سوال کر رہا ہے تو ساتھیوں سے فرمایا کہ اس کا وظیفہ بیت المال سے جاری کر دو' یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ دارالاسلام میں رہنے والا ایک بوڑھا ذمی یوں پریشان ہوتا پھرے اور دست سوال دراز کر کے گزارہ کرے۔

دارالاسلام کے مقابلہ میں دوسری شرعی اصطلاح دارالحرب کی ہے۔ جہاں کفر کی شوکت ہوتی ہے اور وہاں کفر و شرک کے احکام سر بلند ہوتے ہیں' غرض سارا دارومدار اسلام یا کفر کی شوکت پر اور اسلام یا کفر و شرک کے احکام کی فوقیت و سربلندی یا محکومانہ وعاجزانہ ادائیگی پر ہے اگر کسی دارالحرب میں مسلمانوں کو بھی سر چھپانے کی جگہ میسر ہو اور وہاں ان کے لئے امن واطمینان کے ساتھ' جان و مال کی حفاظت کے ساتھ ان کا دین بھی محفوظ ہو تو اس کو دارالامان کہا جاتا ہے' ایسی جگہ اگر مسلمان ہوں تو ان کو ملکی و قومی معاملات میں کفار کے دوش بدوش چلنا چاہئے اور اسلامی مذہبی رواداری کا پورا نمونہ بننا چاہئے۔

حضرت شاہ صاحبؒ دارالاسلام' دارالحرب اور دارالامان کی یہی تشریح فرمایا کرتے تھے' اور یہی حق وصواب ہے' جن لوگوں نے یہ سمجھا کہ جس ملک میں بھی امن وامان اور عدل وانصاف کا قانون ہو اور مذہبی آزادی ہو مسلمانوں کے لئے' خواہ وہاں شوکت اسلام ہو یا نہ ہو' اور

خواہ وہاں اسلامی احکام وشعار کا اجراء بھی جیسا چاہئے نہ ہو وہ بھی دارالاسلام ہے' ان کی غلط فہمی ظاہر ہے۔ آج عدل وانصاف اور امن وامان کا قانون اور مذہبی آزادی کی خوشنما دفعہ کس ملک میں رائج نہیں؟ تو کیا دنیا کے سارے ممالک ''دارالاسلام'' کہلائیں گے۔

الحاصل کہنا یہاں یہ تھا کہ اسلام چونکہ سلام سے مشتق ہے تو اس میں سلام وامن کا بھرپور سرمایہ موجود ہے اور حدیث مذکورہ باب میں بھی سبق دیا گیا ہے کہ مسلمان وہی ہے جس کی ایذا سے مسلمان' مومن ہوں' بلکہ اگر کفار ومشرکین بھی اس کے سایہ میں آباد ہوں تو وہ بھی اپنے کو پوری طرح سے محفوظ سمجھیں اور ان کی عزت وحرمت دینوی کی پاس داری اس حد تک ہونی چاہئے کہ ان کے پیٹھ پیچھے بھی ان کو ناگوار ہونے والی کوئی بات ہم اپنی نجی مجالس میں نہیں کہہ سکتے' جس طرح ایک مسلمان کی غیبت حرام ہے' ایک ذمی کافر ومشرک کی بھی حرام وناجائز ہے' کیا اسلامی شریعت کی اس رواداری' اور حکومت اسلام کے اس قانون کی کوئی نظیر پیش کی جاسکتی ہے؟

دوسری ایک حدیث صحیح میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں کہ ''مومن وہ ہے جس سے سارے لوگ اپنے دماء واموال کے بارے میں مطمئن ہوں' '' اس سے ہماری اوپر کی تشریحات کی اور بھی تائید ہوتی ہے۔

اس حدیث کی سند میں عامر شعبی آئے ہیں' جو ہمارے امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شیخ واستاذ ہیں اور ان کا ذکر ہم نے مقدمہ انوار الباری صفحہ ۳۹/۱ میں کیا ہے۔

باب: ای الاسلام افضل؟ (کون سا اسلام افضل ہے)

۱۰ – حدثنا سعید بن یحییٰ بن سعید الاموی القرشی قال ثنا ابی قال ثنا ابو بردۃ بن عبداللہ بن ابی بردۃ عن ابی بردۃ عن ابی موسیٰ قال قالوا: یارسول اللہ! ای الاسلام افضل؟ قال: من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ

ترجمہ:۔ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ صحابہؓ نے عرض کیا:۔ یارسول اللہ! کون سا اسلام افضل ہے؟ آپ نے فرمایا: جس کی زبان وہاتھ کی ایذاء سے مسلمان محفوظ ہوں' (اس کا اسلام سب سے افضل ہے)

تشریح:۔ علامہ نوویؒ نے شرح بخاری میں فرمایا کہ ای الاسلام سے سائلین کے سوال کا مطلب یہ تھا کہ کون[1] سی خصلت اسلام کی سب سے افضل ہے؟ اس کے جواب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مسلمان کی بہت بڑی امتیازی شان اور کھلا ہوا وصف جس کا مشاہدہ وتجربہ ہر خاص وعام کرسکتا ہے یہ ہے کہ اس سے کسی مسلمان کو بھی ایذا نہ پہنچے لہٰذا ایسے ہی وصف والے کا اسلام بھی سب سے زیادہ برتر وافضل ہوگا۔ دوسری روایت میں ہم بتلا چکے ہیں کہ یہ بھی آچکا ہے کہ مومن کی امتیازی شان یہ ہے کہ تمام لوگ اپنی جان ومال کے بارے میں اس کی طرف سے مامون ومطمئن ہوں' امام بخاری نے اس وصف خاص کی اہمیت کے پیش نظر کئی طریقوں سے اس حدیث کو بیان فرمایا ہے تا کہ لوگ زیادہ سے زیادہ اس کا اہتمام کریں۔

ہمارے حضرت شاہ صاحب قدس سرہ اس امر کا غایت اہتمام فرماتے تھے کہ کسی کو بھی ادنیٰ درجہ کی جسمانی یا روحانی ایذاء نہ پہنچائی جائے اور ایسے شخص کو بہت بڑا صاحب کمال بتلایا کرتے تھے بلکہ بعض اوقات کسی شخص کی بڑی مدح کے طور پر فرماتے تھے کہ وہ شخص بے ضرر ہے اور فرمایا کرتے تھے کہ مولوی صاحب! انسانیت کی بات نہیں ہے کہ ایک آدمی دوسرے کو تکلیف پہنچائے یہ تو موذی جانوروں کا کام ہے' خود بھی اس کا بہت اہتمام فرماتے تھے' ان کی مجلس میں کسی کی غیبت یا برائی نہ ہوسکتی تھی۔

ڈابھیل کے زمانہ قیام میں راقم الحروف نے بارہا دیکھا کہ مدرسہ کی جس بلڈنگ میں آپ کا اور دوسرے اساتذہ کا قیام تھا اس کے متصل دو بیت الخلاء تھے' آپ کی عادت تھی کہ جب تک ایک بیت الخلا میں کوئی ہوتا' آپ دوسرے میں تشریف نہ لے جاتے' بعض مرتبہ کافی انتظار فرماتے' تا کہ اس کو دوسرے بیت الخلاء میں کسی کی موجودگی سے انقباض نہ ہو' اسی طرح بیت الخلاء سے نکلتے تو نل سے کئی کئی لوٹے پانی

---

[1] ای الاسلام کا مطلب ای خصال الاسلام لینا اس لئے بھی راجح ہے کہ آگے جو دوسری حدیث ای الاسلام خیر؟ والی آرہی ہے اس میں ایک روایت ای خصال الاسلام خیر؟ بھی ہے۔ حافظ عینی نے یہاں ای اصحاب الاسلام کی تقدیر کو ترجیح دی ہے' کیونکہ روایت مسلم میں ای المسلمین افضل آیا ہے واللہ اعلم (عمدۃ القاری صفحہ ۱۵۹/۱ طبع استنبول)

کے بھر کر بیت الخلاء لے جاتے اور طہارت کے قدمچہ پر بہاتے تھے تاکہ آپ کے بعد جانے والوں کو کسی قسم کی کراہت واذیت نہ ہو، یہ اس سلسلہ کی ادنیٰ مثال ہے ایک روز فرمایا کہ دنیا کی تعریف بہت سے لوگوں نے کی ہے، کسی نے کہا کہ دنیا مجمع الاضداد ہے۔

کہ اس میں اضداد کا اجتماع ہے اچھی سے اچھی چیزیں بھی موجود ہیں اور بری سے بری بھی، کفر بھی ہے ایمان بھی، نیک عملی بھی ہے اور بدعملی وفسق بھی بہترین اخلاق کے مظاہر بھی ہیں اور بدترین کے بھی وغیرہ۔

کسی نے کہا کہ دنیا وہ جگہ ہے جہاں مجتمعات افترقت ومفترقات اجتمعت کہ کبھی کچھ چیزیں جمع شدہ منتشر ومتفرق ہوجاتی ہیں اور کبھی منتشر چیزیں یکجا ہوجاتی ہیں، مگر میں نے دنیا کا نام "بیت الحمیر" رکھا ہے جس طرح ایک طویلے میں گدھوں کو جمع کردیا جاتا ہے تو وہ چین سے کھڑے نہیں رہتے بلکہ ایک دوسرے کو لاتیں مارتے رہتے ہیں، اسی طرح یہاں انسانوں کا حال ہے کہ بے وجہ ایک دوسرے کو ایذا پہنچانے میں مشغول ہیں، غرض ایذارسانی کا کام اسلام سے کسی طرح جوڑ نہیں کھاتا۔ کیونکہ اسلام انسانی اخلاق فاضلہ کی تکمیل کے لئے آیا ہے **بعثت لاتمم مکارم الاخلاق** محدثین نے یہ بھی لکھا ہے کہ ایسے شخص کی فضیلت اس لئے زیادہ ہے کہ اس کا ثواب بہت زیادہ ہے۔ اس حدیث کے تمام راوی کوفی ہیں۔

ایک اہم علمی فائدہ

امام ابوداؤد نے اپنی سنن میں پانچ لاکھ احادیث میں سے منتخب کرکے چار ہزار آٹھ سو احادیث ذکر کیں، پھر ان میں سے چار کا انتخاب کیا کہ انسان کو اپنے دین پر عمل کرنے کے لئے صرف یہ حدیثیں کافی ہیں (۱) **انما الاعمال بالنیات**۔ عبادات کی درستگی کے لئے (۲) **من حسن اسلام المرء ترکه مالا یعنیه**۔ عمر عزیز کے گرانقدر لمحات کی حفاظت کے لئے (۳) **لا یومن احد کم حتی یحب لاخیه مایحب لنفسه** حقوق العباد کی صحیح طور پر ادائیگی کے لئے، (۴) **الحلال بین والحرام بین و مابینهمامشتبهات فمن اتقی الشبهات فقد استبرا لدینه** "مشتبہات سے بچنے کے لئے۔

اگرچہ یہ بات امام ابوداؤد کی طرف منسوب ہو کر مشہور ہوئی مگر ان سے پہلے امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے صاحبزادے حمادؒ سے فرمایا تھا کہ میں نے پانچ لاکھ احادیث میں سے پانچ احادیث منتخب کی ہیں، پھر ان چار مندرجہ بالا احادیث کے ساتھ پانچویں حدیث **المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده** بیان فرمائی تھی۔

امام ابوداؤد چونکہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے بڑے مداحین میں سے ہیں، ممکن ہے یہ انتخاب ان ہی کے انتخاب سے کیا ہو،

واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم

باب: "اطعام الطعام من الاسلام" (کھانا کھلانا اسلام میں داخل ہے)

۱۱- حدثنا عمرو بن خالد قال حدثنا اللیث عن یزید عن ابی الخیر عن عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنهما ان رجلاً سال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم ای الاسلام خیر؟ قال: تطعم الطعام وتقرا السلام علیٰ من عرفت ومن لم تعرف"

ترجمہ:۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ اسلام کی کون سی خصلت سب سے اچھی ہے؟ آپ نے فرمایا:۔ لوگوں کو کھانا کھلاؤ، اور سب کو سلام کرو خواہ ان کو جانتے پہچانتے ہو یا نہیں۔

تشریح:۔ غالباً یہ سوال کرنے والے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ ہیں، اور بظاہر اسی قسم کی اسلامی تعلیمات کا اثر ان پر بہت زیادہ تھا کہ اپنے پاس کچھ جمع نہ رکھتے تھے سب کچھ مستحقین پر صرف فرمادیتے تھے اور دوسروں کو بھی اسی کی ترغیب دیا کرتے تھے۔ دولت جمع کرنے پر بھی

سختی سے نکیر کرتے تھے ان کی رائے تھی کہ زکوٰۃ وغیرہ حقوق مالیہ ادا کرنے پر بھی دولت جمع کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے اور اس کے سوا چارہ نہیں کہ جو کچھ دولت کمائی جائے وہ سب غرباء و مستحقین پر صرف کر دی جائے۔

اس روایت میں تمام رواۃ مصری ہیں اور سب جلیل القدر ائمہ حدیث ہیں' حضرت لیث بن سعد کے بارے میں علامہ قسطلانی شافعی نے لکھا کہ آپ امام جلیل مشہور قلقشندی المولد حنفی المذہب' مجتہد وقت تھے اور ان کا مفصل تذکرہ ہم نے مقدمہ صفحہ ۲۱۲ میں کیا ہے۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے تلمیذ بھی ہیں۔

اطعام الطعام میں کھلانا' پلانا' مہمانداری کرنا' اعطاء وغیرہ سب داخل ہیں چنانچہ پینے کے لئے طعام کا لفظ طالوت[1] کے واقعہ میں قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے۔

---

[1] طالوت کے واقعہ میں بہت سے فوائد ہیں اس لئے فوائد عثمانی وغیرہ سے اس کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو فرعون کے ظلم و سامراج سے نجات دلائی تھی' کچھ عرصہ تک وہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد بھی ٹھیک رہے مگر جب ان کی نیت بگڑی تو ایک کافر بادشاہ جالوت نامی ان پر مسلط ہوا اور بنی اسرائیل پھر سے غلامی کی لعنت میں گرفتار ہو گئے مجبور ہو کر بیت المقدس پہنچے اور پیغمبر وقت حضرت شموئیل علیہ السلام سے درخواست کی کہ ہم پر کوئی بادشاہ مقرر کر دیں تاکہ اس کی سرکردگی میں جہاد کریں اور اپنی عظمت رفتہ کو واپس لائیں' حضرت شموئیل علیہ السلام نے طالوت نامی ایک شخص کو بادشاہ مقرر کر دیا وہ اگرچہ غریب محنتی معمولی حیثیت کے تھے مگر علم و فضل' عقل و خرد اور جسم و جثہ کے لحاظ سے بادشاہ بننے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے' پھر بنی اسرائیل کی طلب پر خدائے تعالیٰ نے طالوت کی بادشاہت پر ایک نشانی بھی دے دی' وہ اس طرح کہ بنی اسرائیل میں ایک صندوق چلا آتا تھا جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام وغیرہ انبیاء کے تبرکات تھے' بنی اسرائیل اس صندوق کو لڑائی کے وقت آگے رکھتے تھے اور اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے فتح دیتا تھا' جب جالوت غالب آیا تو وہ اس صندوق کو بھی ساتھ لے گیا' تفسیر ابن کثیر میں تفصیل ہے کہ جب مشرکوں نے اس صندوق پر اپنا قبضہ کر لیا تو اس کو اپنے صنم خانہ میں پہنچا کر بڑے بت کے نیچے رکھا' صبح کو آ کر دیکھا تو وہ صندوق اوپر تھا اور بت نیچے اس کو اتار کر بت کے نیچے رکھا۔ اگلے دن دیکھا تو پھر وہی صورت تھی' اب انہوں نے صندوق نیچے اور بت اوپر رکھ کر میخوں سے مستحکم کر دیا' صبح کو دیکھا کہ بت کے سب ہاتھ پیر کٹے ہوئے ہیں اور دور فاصلہ پر پڑا ہے اس پر ان کو تنبہ ہوا کہ یہ بات خدا کی طرف سے ہے اس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا' اپنے شہر سے ہٹا کر اس کو دوسری آبادی میں لے گئے تو وہاں کے سب لوگوں کی گردنوں میں بیماری لگ گئی' اسی طرح پانچ شہروں میں لے گئے' سب جگہ وبا اور بلا پھیل جاتی' بستیاں ویرانے بن جاتے تھے' ناچار ہو کر دو بیلوں پر اس کو لاد دیا' فرشتے ان کو ہانک کر طالوت کے دروازے پر پہنچا گئے' اس نشانی سے بنی اسرائیل کو طالوت کی بادشاہت پر یقین آ گیا اور ان کے ساتھ جالوت کے خلاف فوج کشی کے لئے تیار ہو گئے' یہ موسم نہایت سخت گرمی کا تھا' طالوت نے کہا کہ صرف زور آور' بے فکرے جوان جہاد کے لئے نکلیں' چنانچہ اسی ہزار نوجوان ساتھ نکلے' حق تعالیٰ نے ان کو آزمانا چاہا' ایک منزل پر پانی نہ ملا دوسری منزل میں ایک نہر ملی (تفسیر ابن کثیر میں حضرت ابن عباسؓ وغیرہ کا قول نقل کیا کہ وہ نہر فلسطین اور اردن کے درمیان ہے اور نہر شریعت کے نام سے مشہور ہے) طالوت نے حکم دیا کہ جو شخص اس نہر کے پانی میں سے ایک چلو سے زیادہ پانی پئے وہ میرے ساتھ جہاد میں نہ چلے' منقول ہے کہ اس شرط پر صرف ۳۱۳ نوجوان پورے اترے (جو غزوہ بدر میں مسلمانوں کی تعداد تھی اور خدا کی قدرت کا کرشمہ کہ جنہوں نے ایک چلو سے زیادہ پانی نہ پیا ان کی پیاس بجھی اور جنہوں نے زیادہ پیا ان کو پیاس اور زیادہ لگی اور آگے نہ چل سکے جو ۳۱۳ مجاہدین جالوت کے لشکر جرار کے مقابلہ پر نکلے تھے ان میں حضرت داؤد علیہ السلام ان کے والد اور چھ بھائی بھی تھے جو بڑے قد آور جوان تھے' حضرت داؤد علیہ السلام کا قد چھوٹا تھا' تاہم حضرت شموئیل علیہ السلام نے جالوت کو قتل کرنے کے لئے حضرت داؤد علیہ السلام ہی کا انتخاب کیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو راہ میں تین پتھر ملے اور بولے کہ ہمیں اٹھا لو ہم جالوت کو قتل کریں گے۔ جالوت نے ان مٹھی بھر آدمیوں کو دیکھ کر کہا کہ تم سب کے لئے تو میں اکیلا ہی کافی ہوں میرے سامنے آتے جاؤ (پہلے زمانے میں دستور یہی تھا کہ ابتداء جنگ میں ایک ایک شخص مقابلہ پر نکل کر زور آزمائی کرتا تھا' جالوت خود باہر نکلا تو حضرت داؤد علیہ السلام مقابلہ پر گئے اور تین پتھر فلاخن (گوپھیہ) میں رکھ کر جالوت کے ماتھے پر سر کئے' جالوت کا تمام بدن زرہ سے ڈکا ہوا تھا' صرف پیشانی کھلی تھی' وہ تینوں پتھر اس کے ماتھے پر لگے اور پیچھے کو نکل گئے' جالوت کے مرتے ہی اس کا سارا لشکر بھاگ کھڑا ہوا اور مسلمانوں کو فتح ہوئی پھر طالوت بادشاہ نے حضرت داؤد علیہ السلام سے اپنی بیٹی کا نکاح کر دیا اور طالوت کے بعد وہی بادشاہ ہوئے اس سے معلوم ہوا کہ حکم جہاد ہمیشہ سے چلا آ رہا ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی بڑی رحمت و منت ہے وہ لوگ نادان ہیں جو کہتے ہیں کہ لڑائی نبیوں کا کام نہیں"۔ (فوائد عثمانی صفحہ ۵۱-۵۲) سورہ بقرہ)

اس قسم کے قرآنی واقعات میں ہمارے لئے کتنے کتنے سبق ہیں' ہدایت ہے' روشنی ہے' لائحہ عمل ہے' کاش! مسلمانوں میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو' اور وہ انبیاء سابقین علیہم السلام' امم سابقہ' خصوصاً خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور سلف کے عمل سے مستفید و مستنیر ہوں' اور ذلت کی زندگی پر عزت کی موت کو ترجیح دینے کا زریں اصول کبھی نہ بھولیں' اس کے بغیر ان کی اور ان کے دین کی سربلندی امر موہوم ہے۔ واللہ المستعان۔

ومن لم یطعمه فانه منی الایہ یعنی جس نے اس نہر کا پانی نہ پیا وہ میرا ہے مگر ایک چلو اپنے ہاتھ سے پی لے (تو اس میں کچھ مضائقہ نہیں) یہاں پانی پینے پر طعم کا اطلاق ہوا ہے۔

تقرا السلام' جو کلمہ تسلم سے عام ہے کیونکہ خط و کتابت وغیرہ کے سلام کو بھی شامل ہے اس حدیث میں اسلام کی ایسی دو خصلتیں جمع فرمائی ہیں' جو مالی و بدنی ہر دو قسم کے مکارم اخلاق و فضائل پر مشتمل ہیں' حافظ عینی نے ایک وجہ یہ بھی بیان فرمائی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ پہنچ کر سب سے پہلے ان ہی دو امر کی ترغیب دی تھی کیونکہ اس وقت کے حالات میں ان دونوں باتوں کی زیادہ ضرورت تھی' لوگوں کی ناداری کی حالت تھی اور تالیف قلب کی بھی مصلحت تھی۔

حضرت عبداللہ بن سلامؓ فرماتے ہیں کہ جب حضور مدینہ تشریف لائے تو لوگ آپ کی خدمت میں جلد جلد پہنچنے لگے۔ میں بھی حاضر ہوا۔ اور چہرہ مبارک کو دیکھتے ہی یقین ہو گیا کہ یہ منور چہرہ جھوٹے کا نہیں ہو سکتا اور حضور سے سب سے پہلا ارشاد میں نے یہ سنا' **ایھا الناس افشوا السلام واطعموا اطعام وصلوا باللیل والناس نیام تدخلوا الجنة بسلام**"۔ علامہ خطابی نے فرمایا کہ کھانا کھلانا اس لئے افضل ہوا کہ وہ قوائے بدنیہ کا محافظ ہے' پھر کسی کے ساتھ نیکی بھلائی اور اکرام و تعظیم کا معاملہ کرنے میں افشاء اسلام کا بڑا درجہ ہے' خصوصاً جب کہ وہ ہر متعارف و غیر متعارف کے لئے ہو' کیونکہ وہ خالصاً لوجہ اللہ ہوگا۔ اسی لئے حدیث میں وارد ہے کہ سلام آخری زمانہ میں صرف متعارفین میں رہ جائے گا۔ (کیونکہ ریاء و تصنع اور مصلحت پروری عام ہو جائے گی) (عمدۃ القاری صفحہ ۱/۱۶۳)

اختلاف جوابات کی وجوہ

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہی قسم کے سوال کے جواب میں مختلف قسم کے جوابات کیوں دیئے؟ تو اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ جس وقت جو جواب دیا ہے وہی اس وقت کے مناسب تھا دوسری وجہ یہ ہے کہ سوال کرنے والے کی رعایت سے جواب دیا ہے کہ اس میں جو کمی تھی اس کو ترغیب فرما کر تکمیل کی' تیسرے یہ کہ اہل مجلس کی رعایت سے وہ جواب دیا گیا کہ ان کو ایسے امور کی ترغیب و اہمیت دلائی تھی۔ (نووی شرح البخاری صفحہ ۱/۱۲۹)

باب:۔من الایمان ان یحب لاخیه مایحب لنفسه (ایمان یہ ہے کہ اپنے بھائی کیلئے وہی چیز پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے)

۱۲۔ حدثنا مسدد قال حدثنا یحییٰ عن شعبة عن قتادة عن انس رضی الله عنه عن النبی صلی الله علیه وسلم و عن حسین المعلم قال حدثنا قتادة عن انس عن النبی صلی الله علیه قال: "لایومن احدکم حتیٰ یحب لاخیه مایحب لنفسه"

ترجمہ:۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکے گا جب تک وہ اپنے بھائی کے لئے اس چیز کو پسند نہ کرے جس کو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

تشریح:۔ امام بخاری نے سابقہ احادیث میں اسلام کی شان بتلائی تھی کہ اس کے تحت فلاں فلاں اعمال کو خاص افضلیت حاصل ہے اب ایمان کے تحت خاص خاص فضائل کا ذکر کریں گے' اس حدیث کا منشا یہ ہے کہ جن امور خیر کی تمنا و طلب اپنے لئے کرتا ہے' دوسرے بھائیوں کے لئے بھی کرے' خواہ وہ چیزیں امور دنیوی سے متعلق ہوں یا امور آخرت سے' لیکن ظاہر ہے کہ ایک مسلمان کی طلب و خواہش کا تعلق کسی ناجائز امر کے متعلق نہیں ہو سکتا' اس لئے ناجائز و مکروہات شرعیہ کی طلب و تمنا نہ خود اپنے لئے کر سکتا ہے نہ دوسرے کے لئے۔

حسد وغبطہ کا فرق

اس حدیث سے حسد کی برائی بھی نکلتی ہے کیونکہ حسد کہتے ہیں' دوسرے بھائی کی اچھی حالت دیکھ کر اس کی نعمت چھن جانے کی تمنا کرنا'

جب مومن کی شان یہ ہوئی کہ دوسرے بھائی کے لئے ان چیزوں کو بھی پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے اچھی چیزوں کے لئے جس طرح خود اپنے لئے سعی کرتا ہے اس کے لئے بھی حتی الامکان سعی کرے تو حسد جیسی برائی سے تو خود ہی بہت دور ہو جائے گا' البتہ غبطہ کی گنجائش اس حدیث سے نکلتی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ دوسرے بھائی کے پاس کوئی نعمت دیکھے تو اس کی تمنا وطلب اپنے لئے بھی کرے بغیر اس کے کہ اس شخص سے اس نعمت کا زوال چاہے اس کی شرعاً اجازت ہے۔ حسد وغبطہ کا فرق اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے۔

روایت مسلم میں لجارہ کا لفظ وارد ہے یعنی اپنے پڑوسی کے لئے وہی پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے' ظاہر ہے کہ پڑوسی مسلمان بھی ہو سکتا ہے اور کافر بھی' اس لئے اخ سے بھی مراد عام ہی ہونا راجح ہے' حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ من الایمان کے لفظ سے ظاہر ہوا کہ یہاں ایک خصلت ذکر ہوئی ہے ایمان میں سے اور ان امور میں جہاں حدیث میں ان کے بغیر ایمان کی نفی کا حکم ہے وہ اس امر پر محمول ہے کہ ناقص کو بمنزلہ معدوم کہا جایا کرتا ہے اس سے تو امام بخاریؒ کے نظریہ کی وضاحت ہوئی لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ شارع علیہ السلام کا طریقہ وعظ وتذکیر کا طریقہ ہوتا ہے اس لئے وہ ایسا طرز اختیار کرتے ہیں جس سے لوگوں کو عمل کی طرف زیادہ سے زیادہ رغبت ہو اس لئے اس قسم کی احادیث میں کمال کی تقدیر نکالنا' شارع کے مقصد کو فوت کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ سلف من ترک الصلوٰۃ متعمدا فقد کفر۔ میں' ترک استحلال وغیرہ کی تاویل کو پسند نہیں کرتے کیونکہ تاویل سے بات ہلکی ہو جاتی ہے اور عمل کا داعیہ ختم ہو جاتا ہے۔

باب:۔ حب الرسول صلی اللہ علیہ وسلم من الایمان (رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ایمان میں داخل ہے)

۱۳۔ حدثنا ابو الیمان قال ثنا شعیب قال ثنا ابوالزناد عن الاعرج عن ابی ہریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: "والذی نفسی بیدہ لایؤمن احدکم حتیٰ اکون احب الیہ من والدہ وولدہ"

ترجمہ:۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس ذات باری کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے' تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک میں اسے اس کے آباواجداد اور اولاد سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں"۔

تشریح:۔ جسمانی ابوت وبنوت کا علاقہ روحانی ابوت وبنوت کے مقابلہ میں بہت کم درجہ کا اور کمزور ہے اسی لئے قرآن مجید میں جہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ابوت روحانی کا ذکر فرمایا' اس کے ساتھ یہ بھی اشارہ ہوا کہ روحانی علاقہ تمام قریب ترین علاقوں پر برتر وفائق ہے' فرمایا "النبی اولی بالمومنین من انفسھم وازواجہ امھاتھم (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو (روحانی علاقہ سے) مومنوں کے ساتھ' ان کی جانوں سے بھی زیادہ ولایت وقرب کا مرتبہ حاصل ہے اور آپ کی ازواج مطہرات ان کی مائیں ہیں") ایک قرات میں وھواب لھم بھی ہے یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے باپ ہیں پس اگر جسمانی تعلق مذکور محبت ومودت کا سبب ہوتا ہے تو مہانی تعلق محبت کا باعث کیوں نہ ہوگا بلکہ روحانی تعلق اگر کم سے کم درجہ کا بھی ہو تو وہ بڑے سے بڑے جسمانی تعلق سے زیادہ قوی ہوتا ہے اس لئے اگر یہاں محبت ہوگی تو وہاں عشق کا درجہ ہوگا اور یہاں عشق مجازی ہوگا تو وہاں عشق حقیقی کی کارفرمائی ہوگی اور عشق کا حال یہ ہے۔

عشق آں شعلہ ایست کوچوں برفروخت ؎ ہرچہ جز معشوق باشد جملہ سوخت

اور جب عشق کی لذتوں سے شناسائی حاصل ہو جاتی ہے تو عاشق عشق کی بدولت ہزار تکالیف اور رسوائیوں کو بھی بہزاء مسرت وخوشی اس طرح خوش آمدید کہتا ہے۔

شاد باش اے عشق خوش وائے ما ؎ اے دوائے جملہ علت ہائے ما
اے دواء نخوت و ناموس ما ؎ اے تو افلاطون و جالینوس ما

اور شیفتہ نے کہا۔

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ اک آگ سی ہے سینہ کے اندر لگی ہوئی

اور حالی نے یوں ادا کیا ؂

سنتے تھے عشق جسے وہ یہی ہوگا شاید خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

معلوم ہوا کہ عشق ومحبت بڑے کام کی چیز ہے مگر ایسی کار آمد اور قیمتی نعمت کو کسی فانی شے سے وابستہ کرنا نہ صرف یہ کہ اس کا بے جا مصرف ہے بلکہ بہت بڑی حماقت بھی ہے اس لئے حدیث مذکور بالا میں اسی حقیقت کی طرف رہنمائی کی گئی ہے، تا کہ اول درجہ کی محبت وعشق کا تعلق حی وقیوم سے اور اس کی وجہ سے اس کے محبوب وبرگزیدہ رسول سے قائم کیا جائے، اگر صحیح معنی میں خدا اور رسول سے جیسی محبت ہونی چاہئے ہو جائے تو اس کا ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ ان کی اطاعت سہل تر ہو جائے گی ۔ ؂

ان المحب لمن یحب مطیع

(طبعاً وفطرتاً ایک محب اپنے محبوب کا مطیع ہوا کرتا ہے)

النبی اولی بالمومنین کی بہترین تشریح وتوضیح دیکھنی ہو اور ''علوم نبوت'' کی سرسبز وشاداب وادیوں سے دل ودماغ کو بہرہ اندوز کرنا ہو تو حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ کی ''آب حیات''[1] ملاحظہ کی جائے ۔

علامہ محقق حافظ بدرالدین عینیؒ نے بھی کچھ اشارہ فرمایا ہے ۔ (عمدۃ القاری صفحہ ۱۶۹/ اطبع استنبول)

بحث ونظر: یہاں یہ بحث ہے کہ حب الرسول من الایمان میں کون سی محبت مراد ہے، طبعی یا عقلی یا ایمانی وشرعی ۔ علامہ بیضاوی نے حب عقلی مراد لی ہے کیونکہ حب طبعی ایک اضطراری امر ہے اور کسی کو اضطراری وغیر اختیاری امر کا مکلف نہیں بنایا جا سکتا ۔ بعض نے کہا کہ حب ایمانی مراد ہونی چاہئے جس کا مرتبہ حب طبعی وعقلی دونوں سے اوپر ہے لیکن ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ حقیقت میں تو محبت ایک ہی ہے اس کی اقسام نکالنا فلسفیانہ موشگافی ہے البتہ جن چیزوں سے محبت کا تعلق ہوتا ہے ان کے اختلاف سے اس ایک محبت کے متعدد نام ہو گئے ۔ مثلاً آباء وابناء کے ساتھ تعلق ہو تو اس کو حب طبعی کہتے ہیں، شریعت کے ناتہ سے جن چیزوں سے تعلق ہوا اس کو حب شرعی وایمانی کہنے لگے عقل کے راستہ سے علاقہ مفہوم ہوا تو اس کو حب عقلی کہہ دیا ۔ چنانچہ آیت قرآنی ۔ **قل ان کان آباء کم وابنآ ء کم و ازواجکم وعشیر تکم و اموال ن اقترفتموھا وتجارۃ تخشون کساد ھا ومساکن ترضو نھا احب الیکم من اللہ ورسولہ وجھاد فی سبیلہ فتربصوا** الایہ سے ظاہر ہے کہ محبت تو ایک ہی صفت ہے، جس کو میلان قلبی کہنا چاہئے اگر وہ میلان ان سب دنیوی محبوبات ومرغوبات کی طرف زیادہ ہے اور خدا ورسول اور ان کی مرضیات کی طرف کم ہے تو یہی آخرت کے بڑے خسران اور برے نتائج کا پیش خیمہ ہے، پوری آیت کا ترجمہ یہ ہے ۔

''آپ ان کو بتلا دیجئے کہ تمہارے آباؤ اجداد، تمہاری آل اولاد، تمہاری بیویاں، تمہاری برادری وکنبہ وقبیلہ، تمہارے کمائے ہوئے اموال ودولت، تجارتی کاروبار جن کے فیل ہونے کا اندیشہ تمہیں ستایا کرتا ہے (عالیشان بلڈنگیں، جن میں عیش وآرام کی زندگی گزارنا تمہیں بہت پیارا ہے یہ سب چیزیں اگر تمہیں اللہ تعالیٰ سے اس کے رسول معظم سے اور خدا کے راستہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو (اس دنیا کی عارضی وچندروزہ زندگی کے بعد) اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والے عذاب ونکال کا انتظار کرو جو لوگ (کفار ومشرکین کی موالات یا

---

[1] یہ لاجواب کتاب موضوع ''حیات سرور کائنات'' صلی اللہ علیہ وسلم پر بے نظیر وبے مثال ہے راقم الحروف نے عرصہ ہوا قیام ڈابھیل کے زمانے میں اس کی تصحیح تسہیل، تبویب اور عنوانات لگانے کی خدمت انجام دی تھی، اور اس کے اہم نظریات کی تائید وتوثیق کے لئے اکابر سلف کے اقوال بھی جمع کئے تھے خدا نے مزید توفیق بخشی تو اس کو جدید ترتیب کے ساتھ شائع کرانے کی تمنا ہے ۔ واللہ المیسر ۔

دنیوی خواہشات میں پھنس کر) خدا کی نافرمانیاں کرتے ہیں' وہ اس کی ہدایت سے محروم رہے ہیں (سورۃ توبہ)"

حدیث میں ہے کہ جب تم بیلوں کی دم پکڑ کر کھیتی باڑی سے اس طرح دل لگالو گے کہ "جہاد" کو چھوڑ بیٹھو گے تو خدا تم پر ایسی ذلت مسلط کردے گا' جس سے تم کبھی نہ نکل سکو گے' یہاں تک کہ پھر اپنے دین (جہاد فی سبیل اللہ) کی طرف واپس آؤ۔

لہ یہاں یہ امر لائق ہے کہ احکام اسلام میں جہاد فی سبیل اللہ سب سے زیادہ دشوار گذار مرحلہ ہے' جو کفر و شرک کی طاغوتی طاقتوں کے مقابلہ میں اعلاء کلمۃ اللہ دین اسلام کی سربلندی اور مسلمانوں کی عزت و سطوت کے لیے واحد نسخہ کیمیا ہے' جہاد کا حکم قیام قیامت تک باقی ہے' جب بھی اس کی ضرورت ہوگی اور مسلمان اس سے غفلت برتیں گے' ان کی دینی و دنیاوی ہلاکت و خسران یقینی ہے۔ و لا تلقوا بایدیکم الی التهلكة' میں ہلاکت سے مراد ترک جہاد ہی ہے' اور حدیث صحیح میں یہ بھی ہے کہ جو مسلمان جہاد نہ کرے' اور نہ کبھی اس کے حاشیہ خیال میں جہاد کا ارادہ و تصور آئے' وہ نفاق کے ایک شعبہ پر مرے گا (مسلم) اعاذنا اللہ منہ)

اس کے علاوہ جہاد کے فضائل بے شمار ہیں' یہاں تک کہ بخاری و مسلم کی حدیث میں وارد ہے کہ جنت میں داخل ہونے کے بعد کوئی شخص بھی دنیا کی طرف واپس ہونے کو پسند نہ کرے گا' اگر چہ اس کو ساری زمین کی دولت و حکومت بھی حاصل ہو مگر شہید کہ وہ نہ صرف دنیا میں واپس ہونے کو پسند کرے گا بلکہ تمنا کرے گا تا کہ دنیا میں آکر (کم سے کم) دس مرتبہ تو پھر خدا کی راہ میں جہاد کر کے آخرت کی اس عظیم الشان عزت و کرامت کو حاصل کرے جو شہادت پر موقوف ہے۔

جہاد و شہادت کے احکام' فضائل وغیرہ اپنے موقع پر آئیں گے' یہاں صرف یہ دکھلانا ہے کہ جہاد کی جو عظیم الشان عظمت و کرامت شریعت کی نظر میں ہے' یہاں تک کہ جہاد میں نکلنے پر ایک نیکی کا ثواب سات لاکھ گنے تک وارد ہے۔ وہ اس لئے ہے کہ جہاد کہتے ہیں کلمۃ اللہ کو بلند اور کلمہ کفر و شرک کو سرنگوں کے لیے نفس و نفیس کو خیر باد کہہ کر ہمیشہ کے لیے گھر سے نکل جانے کو' جیسا کہ آیت مذکورہ بالا میں اشارہ ہے کہ اگر تمہیں دنیا کی یہ ساری زندگی اور مال و متاع خدا اور رسول کی رضا مندی اور جہاد فی سبیل اللہ سے زیادہ عزیز ہے تو آخرت کی بھلائی سے مایوس ہو جاؤ' معلوم ہوا کہ ساری عبادات میں سے سب سے زیادہ شاق اور نفس پر گراں ترین عمل گھر بار کاروبار اور اعزہ و اقارب اور عمر کی ساری کمائی ہوئی دولت کی طرف سے پیٹھ پھیر کر اور ان کے تعلق و محبت سے دل کو صاف کر کے اسلام اور مسلمانوں کی عزت کو سربلند کرنے کی نیت سے نکل جانا ہے' تب اس کا ثواب اتنا بڑا ہے کہ دوسری کسی عبادت کا ثواب اس قدر نہیں مثلاً جہاد کے وقت ایک روپیہ صرف کرنے کا ثواب سات لاکھ روپے کے برابر ہے' اس زمانے میں عام طور سے ہماری تبلیغی جماعت کے افراد علماء و عوام کے ذہن میں یہ بات آگئی ہے کہ تبلیغ کے لیے نکلنے پر بھی ہر نیکی کا ثواب سات لاکھ کے حساب سے ملے گا' کیونکہ وہ بھی مثل جہاد کے ہے۔

تو اول تو کسی کو شارع علیہ السلام کا منصب اختیار کر کے یہ کہنے کا حق نہیں کہ فلاں عمل چونکہ فلاں عمل سے مشابہ ہے اس لیے ان دونوں کا ثواب برابر ہے' پھر جب کہ قرآن و حدیث کے مجموعی مطالعہ سے جہاد فی سبیل اللہ اور دوسرے اعمال کا فرق زمین و آسمان کا معلوم ہوتا ہے۔ ذروۃ سنامه الجهاد جہاد دین کے سب اعمال میں سے چوٹی کا عمل ہے' جس کی وجہ یہ بھی ہے کہ بغیر اعلاء کلمۃ اللہ کے دوسرے اعمال کی ادائیگی کی شان نہایت گری ہوتی رہتی ہے۔

دوسرے یہ کہ جہاد کے جو کچھ فضائل و مناقب ہیں وہ مشرحہ بالا عظیم قربانیوں کے تحت ہیں' چند روز کے لیے گھر سے نکلنا' خواہ وہ تبلیغ جیسے اہم دینی مقصد ہی کے لیے ہو' جہاد کے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتا' پھر اگر ایسا ہی قیاس کرنا ہے تو جب تین دن کے لیے گھر سے مسلمانوں ہی میں تبلیغ کے لیے نکلنا (خواہ وہ صرف ایک بستی سے دوسری بستی کے لیے ہو) جہاد فی سبیل اللہ کے حکم میں ہے' اور ایسے شخص کو ہر نماز اور ہر روپیہ صرف کرنے کا ثواب سات لاکھ گنا مل سکتا ہے تو حج جیسے فرض عین کے لیے ۳۔۴ ماہ کے واسطے اتنے دور دراز سفر پر نکلنے والے کو ہر نیکی پر سات لاکھ گنا ثواب کیوں نہ ملے گا' اگر اس کو بھی ملتا ہے تو کتابوں میں اس کا ذکر کیوں نہیں؟

ایک مرتبہ راقم الحروف نے تبلیغی جماعت میں کام کرنے والے ایک جید عالم سے اس سلسلہ میں گفتگو کی تو انہوں نے یہی کہا کہ یہ بھی جہاد کے مشابہ ہے اس لیے جہاد کی ساری فضیلت اس کو حاصل ہے اور وہ اپنی تحقیق پر مصر رہے' احقر نے خیال کیا کہ لوگوں کو رغبت دلانے کے نیک خیال سے اس قسم کی فضیلت بیان کرنے کی ضرورت سے یہ حضرات مجبور ہوئے ہیں' تو حساب لگا کر ایک بیان میں لوگوں کو بتلایا تھا کہ صرف ایک دن میں باجماعت نمازوں میں جتنا قرآن مجید پڑھا جاتا ہے اس کی نیکیاں شمار کی جائیں تو ۶۶ لاکھ سے زیادہ حسنات کا ثواب ملتا ہے۔ جب کہ نماز کے دوسرے ارکان' سنن و مستحبات کا ثواب الگ رہا۔ کیونکہ قرآن مجید کے ایک حرف پڑھنے سے دس نیکیاں ملتی ہیں اور نماز میں پڑھنے سے ایک سو نیکیاں حدیث سے ثابت ہیں اور جماعت کا ثواب ۲۷ گنا ہے' جس کو بعض علماء نے لکھا کہ ۲۷ بار ڈبل کیا جائے۔ غرض صرف ترغیب کے لیے کچھ کہنا ہے تو اس میں علماء اور ذمہ دار حضرات کو کچی بات نہ کہنی چاہیے' اس تحریر کا مقصد صرف ایک علمی تحقیق و اصلاح ہے' تبلیغ کی ضرورت و اہمیت سے صرف نظر ہرگز نہیں' خود تبلیغ کے فضائل و مناقب بھی اپنی جگہ بے شمار ہیں اور تبلیغی جماعت کے کارنامے آب زر سے لکھے جائیں تو کم ہے' ہر مسلمان کو اس کام میں لگنا چاہیے' دوسری اہم قابل اصلاح بات یہ ہے کہ عام طور سے دیکھا گیا ہے کہ تبلیغی جماعت میں کام کرنے والوں کے دلوں میں علماء اسلام اور مدارس عربیہ کی وقعت کم ہو جاتی ہے' حالانکہ علماء اور مدارس عربیہ دین کے مستحکم قلعے ہیں' ان سے کٹ کر ان سے بدظن ہو کر' یا ان سے بے نیاز ہو کر جو دین کا کام ہوگا اس کے اثرات پائیدار و مستحکم نہ ہوں گے اور مجموعی حیثیت سے دین و علم کو اس سے ناقابل تلافی نقصان بھی پہنچے گا۔ و ما علینا الا البلاغ۔

جہاد کی تشریح سے اجتناب

جہاد وقتال فی سبیل اللہ کی طرف جو اوپر چند اشارات ضمنی طور سے ذکر ہوئے ان کو لکھتے وقت راقم الحروف نے علماء حال کی چند تالیفات پر نظر کی جو اسلام کو مکمل طور پر پیش کرنے کے لئے لکھی گئی ہیں، مگر نہایت افسوس ہے کہ ان میں اصل جہاد وقتال فی سبیل اللہ کی تفصیل وتشریح کرنے سے پہلوتہی کی گئی ہے اور صرف دین کی نصرت وحمایت کا جلی عنوان دے کر کچھ لکھا گیا ہے۔ پھر شہادت کی فضیلت اور شہیدوں کا مرتبہ بتلانے کے لئے بھی صرف اتنا لکھا گیا کہ دین حق پر قائم رہنے کی وجہ سے یا دین کی کوشش وحمایت میں کسی خوش نصیب کی جان چلی جائے تو دین کی خاص زبان میں اس کو شہید کہتے ہیں، پھر آیات واحادیث میں جو مراتب شہیدوں کے ہیں وہ بھی ان ہی خوش نصیب مسلمانوں کے بتلائے ہیں جن کو بزعم خود دین کی خالص زبان میں شہید سمجھا ہے۔ جو کتابیں اسلام کا مکمل تعارف کرانے کے لئے لکھی جائیں اور ان سے ہم یہ نہ معلوم کرسکیں کہ جہاد وقتال فی سبیل اللہ بھی اسلام کا کوئی جزو ہے بلکہ دین کی خاص زبان میں شہید کا ایک جزوی ومحدود تصور بتلا کر اصل جہاد وقتال فی سبیل اللہ کو منظر عام سے بالکل ہٹا دیں، اس کی کوئی معقول وجہ نہیں معلوم ہوئی، ہاں! یہ ہوسکتا ہے کہ ہم اصل جہاد پر روشنی ڈالیں اس کے شرائط و احکام کی شرح کریں، اور ضرورت ہو تو بھی لکھ دیں کہ ہندوستان میں اصل جہاد کے قائم کرنے کی بظاہر کوئی صورت نہیں ہے یہاں کے حالات میں یہ بھی ثانوی درجہ میں جہاد فی سبیل اللہ ہی کی ایک قسم ہے کہ دین کی نصرت وحمایت کی جائے اگر کفار ومشرکین کو دعوت اسلامی نہیں دے سکتے اور اس کے خطرات سے دوچار ہونے کا حوصلہ نہیں، تو صرف مسلمانوں کو ہی مسلمان بنانے اور اسلام پر قائم رکھنے کی مہم جاری رکھی جائے اور اس میں کچھ تکالیف ومصائب پیش آئیں تو ان کو خدا کے لئے برداشت کیا جائے، وغیرہ اور اگر موجودہ ہندوستان میں جہاد وقتال فی سبیل اللہ کی اتنی تشریح بھی خطرات سے خالی نہیں سمجھی گئی تو یہ بات اس لئے سمجھ میں نہیں آتی کہ انگریزی دور سامراجیت میں جبکہ مرحوم جہاد اسلامی کے بہت سے نقوش دنیا کے مختلف خطوں پر ابھرے ہوئے تھے، اور خود ہندوستان کے مسلمانوں نے بھی امام المجاہدین حضرت سید احمد صاحب شہید قدس سرہ کی قیادت میں اور پھر حضرت حافظ ضامن صاحب شہید، حضرت حاجی صاحب، حضرت گنگوہی، حضرت نانوتوی وغیرہ (رحمہم اللہ تعالیٰ) کی رہنمائی میں بھی سرفروشانہ جہاد وقتال کیا تھا اور انگریزوں کو سب سے بڑا خطرہ مسلمانوں کی جہادی اسپرٹ ہی سے رہتا تھا۔ اس وقت بھی مودودی نے الجہاد فی الاسلام ایسی ضخیم کتاب لکھ کر شائع کردی تھی آج تک ہمارے علم میں نہیں کہ ان کی کتاب ضبط ہوئی ہو یا انگریزوں نے ان کو کوئی سزا دی ہو۔ پھر ہمارے علماء "اسلام" پر کتابیں لکھتے وقت اسلام کی پوری تصویر کھینچنے سے کیوں ہچکچاتے ہیں؟۔

اگر کسی اسلامی حکم کو موجودہ احوال وظروف کی مجبوری سے عملی صورت نہیں دی جاسکتی تو اس کا علمی ونظریاتی تصور تو حاشیہ خیال میں ضرور رہنا چاہئے اگر کہا جائے کہ اس کا فائدہ کیا ہے؟ تو اس کے لئے مسلم شریف کی حدیث سامنے رکھیے! "**من مات ولم يغز ولم يحدث به نفسه مات على شعبة من النفاق**" (مسلم شریف صفحہ ۲/۱۴۱ مطبوعہ نولکشور)

غرض آیات واحادیث سے ثابت ہے کہ خدا اور رسول کی محبت سب چیزوں کی محبت پر غالب ہونی چاہئے اور ظاہر ہے کہ ان سب مرغوبات دنیوی کی محبت طبعی ہے لہٰذا خدا اور رسول کی محبت بھی طبعی ہونی چاہئے اور جب طبعی ہوگی تو عقلی وشرعی بدرجہ اولیٰ ہوگی، صحابہ کرام کے حالات پڑھنے سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ ان کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت طبعی تھی، بطور مثال چند اشارات عرض ہیں۔

۱- حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ یقیناً آپ مجھے ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں۔ بجز میری جان کے! آپ نے فرمایا کہ ابھی ایمان کامل نہیں اور واللہ اس وقت تک کامل نہ ہوگا کہ میں سب چیزوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں، حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ:۔ حضرت! اب وہ بات نہیں رہی اور آپ کی محبت مجھے اپنی جان عزیز سے بھی زیادہ عزیز ہوگئی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا:۔اب تمہارا ایمان بھی مکمل ہو گیا۔

ظاہر ہے کہ عقلی وشرعی نقطہ نظر سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایسے جاں نثار صحابی کو کیا تر دد ہوسکتا تھا' البتہ طبعی لحاظ سے کچھ تامل تھا' جو نور مجسم' ہدایت معظم کے ادنیٰ اشارہ سے زائل ہو گیا۔

۲-حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ احد کے موقع پر ایک رات کو میرے والد نے مجھے بلا کر وصیت کی کہ مجھے معلوم ہوا کل کو اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سب سے پہلے میں شہید ہوں گا' اپنے بعد رہنے والوں میں نفس پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تم ہی مجھے سب سے زیادہ محبوب ہو' مجھ پر قرض ہے اس کی ادائیگی کا اہتمام کرنا (بخاری شریف) یہاں سے بھی معلوم ہوا کہ قسم دونوں محبت کی ایک ہی تھی۔یعنی طبعی۔

۳-حضرت عبداللہ بن زید بن عبداللہ اپنے باغ میں پانی دے رہے تھے' بیٹے نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کی خبر سنائی تو فوراً آنکھیں بند کر لیں اور حق تعالیٰ سے عرض کیا کہ جن آنکھوں سے میں نے محبوب دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کا جمال جہاں آرا' دیکھا ہے' ان سے اب کسی دوسرے کو دیکھنا نہیں چاہتا' مجھ سے میری بصیرت لے لے' چنانچہ ان کی بصیرت جاتی رہی۔شفاء قاضی عیاض میں اور بھی بعض واقعات لکھے ہیں مثلاً:۔

۴-جنگ احد میں ایک انصاری عورت کا باپ' بھائی اور شوہر تینوں شہید ہو گئے' جب اس کو خبر ملی تو اس نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عافیت دریافت کی' لوگوں نے بتلایا کہ بخیر ہیں اس نے کہا کہ جب آپ زندہ وسلامت ہیں تو پھر ہر مصیبت کا جھیلنا آسان ہے۔

۵-حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہمیں مال' اولاد' والدین اور پیاس میں سرد پانی سے بھی زیادہ عزیز تھی۔

۶-اہل مکہ جب زید بن دثنہ کو قتل کرنے کے لئے حرم سے باہر لے چلے' تو ابوسفیان نے پوچھا کہ زید' قسم کھا کر کہو کیا تمہیں اس وقت یہ پسند ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہاں تمہاری جگہ ہوتے اور تم اپنے گھر ہوتے' زید نے کہا "بخدائے لایزال مجھے ہرگز یہ گوارا نہیں کہ میں اپنے گھر میں ہوں اور یہاں آپ کے جسم میں ایک کانٹا بھی چبھے' ابوسفیان نے کہا کہ میں نے ایسی محبت کہیں نہیں دیکھی' جیسی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھی اس سے کرتے ہیں۔

۷-تفسیر ابن کثیر میں آیت **ومن یطع اللہ والرسول فاولئک مع الذین انعم اللہ علیہم من النبیین والصدیقین والشہداء والصالحین وحسن اولئک رفیقا**. کا شان نزول یہ لکھا ہے کہ ایک صحابی نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ مجھے آپ کی ذات سے بڑی محبت ہے' حتیٰ کہ جب گھر میں ہوتا ہوں تب بھی آپ کا ہی دھیان رہتا ہے اور جدائی شاق ہوتی ہے! تاہم یہاں تو ہم حاضری کا شرف حاصل بھی کر لیتے ہیں' زیادہ فکر یہ ہے کہ جنت میں آپ درجات عالیہ میں انبیاء کے ساتھ ہوں گے' اس وقت تو مستقل جدائی ہوگی اور دل یہ چاہتا ہے کہ آپ کے ساتھ رہوں' حضور نے کوئی جواب نہیں دیا' اور وحی کا انتظار فرمایا' پھر یہ آیت نازل ہوئی' اور آپ نے اس شخص کو بلا کر بشارت سنائی۔

اسی طرح دوسرے واقعات بہ کثرت ملتے ہیں' جب عقلی وایمانی' شرعی وغیرہ کی تاویل اس لئے کرنی پڑتی ہے کہ عموماً حق تعالیٰ جل ذکرہ کی رحمت عامہ وخاصہ' اس کے فضل وانعامات اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے احسانات والطاف بے پایاں کا استحضار نہیں رہتا' اگر ان امور کا نقش دل پر اچھی طرح بیٹھ جائے تو ناممکن ہے کہ ان سے ہزاروں درجہ کم احسانات کی وجہ سے آباؤ اجداد' اور مال واولاد' ازواج وغیرہ سے تو حب طبعی ہو' اور خدا اور رسول سے حب طبعی نہ ہو' انسانی روح چونکہ اس قلب خاکی میں محبوس ہو کر غفلت وجہالت کے پردوں میں مستور ہو جاتی ہے' جس طرح آگ کی چنگاری راکھ کے ڈھیر میں محبوس ہو تو اس کی اصل صفات گرمی وروشنی وغیرہ بھی چھپ جاتی ہیں' اسی طرح ایمان وعقل سلیم کے صفات وملکات کے اصل مظاہر وآثار بھی دنیوی تعیشات اور فسق وفجور کی زندگی میں پڑ کر پوشیدہ ہو جاتے ہیں۔

طاعات وعبادات کی ضرورت

التزام طاعات وعبادات اور اجتناب معاصی ومنکرات کا حکم شرعی اس لئے نہایت اہتمام سے کیا گیا ہے کہ ایمان کی چنگاری معاصی و منکرات کی راکھ میں چھپ کر بے اثر نہ ہو جائے۔ اور طاعات وعبادات کے ذریعہ جلاء وحرارت باقی رہے' یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ حسب تحقیق ومشاہدہ شیخ عبدالعزیز دباغ قدس سرہ ہم سب مومنوں کے دلوں میں جو نور ایمان کی روشنی خدا کے فضل وکرم لامتناہی کے صدقہ میں موجود ہیں وہ سب گویا ایمانی بلب ہیں' جو ساری دنیا کے مرکز انوار الٰہیہ قلب منور ونور اعظم ذات محمدی علی صاحبہا الف الف صلوٰت وتحیات سے مستنیر ومستفید ہیں' جس کو حضرت مجدد صاحب قدس سرہ نے حقیقۃ الحقائق ونور الخلائق وغیرہ سے تعبیر فرمایا اور اس سلسلے کی بہت کچھ شرح' حضرت نانوتوی قدس سرہ نے آب حیات وغیرہ میں کی ہے اس قسم کی تفصیلات میں موقع' بموقع راقم الحروف اس لئے بھی چلا جاتا ہے تاکہ ہمارا ایمان صرف اجمالی نہ رہے' کیونکہ ایمان تفصیلی ہی سے اس قسم کی احادیث کی پوری شرح سمجھ میں آسکتی ہے اور یہی وہ علوم نبوت ہیں جن سے ایمانی روح کو غذاء روحانی ملتی ہے اور اس سے ترقی ونشو ونما حاصل ہوتی ہے واضح ہو کہ روح ایمانی کی ترقیات کی کوئی حد وانتہا نہیں ہے اس کے زینے کا سب سے پہلا درجہ اعمال ہیں' اس کے بعد سارے درجات کی ترقی علوم نبوت پر موقوف ہے معلوم ہوا کہ جس درجہ پر ہم نے اکتفا کر لی ہے اور اس پر بھی ہم پوری طرح نہ چڑھ سکے وہ کم سے کم مطالبہ ہے' ہمیں انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام کی زندگی سے واقفیت حاصل کرنی چاہئے اور دیکھنا چاہئے کہ انہوں نے کس طرح اور کتنے مدارج قرب الٰہی کے طے کئے' اور سوائے قرب نبوت کے تمام مدارج ہم بھی طے کر سکتے ہیں اور ہمارا مطمح نظر اور آخری مقصد انتہائی امکانی درجہ قرب ورضاء الٰہی ہونا چاہئے' تب ہم کچھ آگے بڑھ سکتے ہیں' اگر دنیا کی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ انسان کے سامنے بڑے سے بڑا مقصد ہو تو دینی ترقی کا اصول بھی یہی ہے کہ سب سے اعلیٰ مقصد کو اپنی منزل مقصود بناؤ اور حوصلہ کر کے آگے بڑھتے جاؤ حدیث[1] میں آتا ہے کہ (دخول جنت کے وقت) صاحب قرآن سے کہا جائے گا۔ قرآن مجید پڑھتے جاؤ اور اوپر چڑھتے جاؤ' جہاں رک جاؤ گے وہی تمہاری منزل ہوگی۔

۱۴ – حدثنا یعقوب بن ابراھیم قال ثنا ابن علیة عن عبدالعزیز بن صھیب عن انس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم: وحدثنا آدم بن ابی ایاس قال ثنا شعبة عن قتادة عن انس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لایومن احد کم حتیٰ اکون احب الیہ من والدہ وولدہ والناس اجمعین.

ترجمہ:۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی شخص بھی اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا' جب تک اس کو میری محبت اپنے آباؤ اجداد' اولاد اور سب لوگوں سے زیادہ نہ ہو جائے۔

تشریح:۔ پہلی حدیث میں صرف **من والدہ وولدہ** تھا' اس حدیث میں **والناس اجمعین** کی زیادتی ہے' جس میں زیادہ وسعت اور ہمہ گیری ہے ایک روایت میں **من اھلہ ومالہ** بھی آیا ہے' اپنے اہل ومال سے بھی زیادہ محبوب ہونا۔ علامہ عینیؒ نے لکھا' کہ محبت کے تین اسباب ہیں'

---

[1] یہ حدیث ترمذی وابوداؤد میں ہے' خطابی نے کہا: اثر سے ثابت ہے کہ جتنی تعداد آیات قرآنی کی ہے' اتنے ہی درجات جنت میں ہوں گے' اس لئے حامل قرآن مجید سے (جس نے اس کی تلاوت کے ساتھ اس پر عمل بھی کیا ہوگا' یہ بات کہی جائیگی' اور ہر مومن اپنے ایمان وعمل کے اعتبار سے ان درجات پر فائز ہوگا۔ وہ اتنی ہی آیات پڑھ سکے گا جتنی پر عمل کیا ہوگا چنانچہ ہر ایک کا منتہی الثواب اس کا منتہی القراۃ ہوگا' لہٰذا پورے قرآن مجید' اس کی تفسیر حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کی شرح اور فقہی مسائل کو اپنی زندگی کا لائحہ عمل اور حال وقال بنانا چاہئے' یہ تینوں چیزیں علوم نبوت کا مکمل ترین مجموعہ ہیں' فرق اتنا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے صرف قرآن مجید کی بھی روشنی کافی تھی اس لئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ''کان خلقہ القرآن'' فرمایا' صحابہ کرام' تابعین وائمہ مجتہدین کے لئے قرآن مجید کی تفسیر واحادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی ضرورت تھی ان کے بعد آنے والے علماء وعوام کے لئے درجہ بدرجہ فقہ اسلامی کی روشنی بھی ضروری ہوئی' جو قرآن مجید' حدیث' آثار صحابہ واقوال تابعین کی روشنی میں مرتب ہوا۔ واللہ اعلم۔

کمال، جمال، جودوسخا۔ اور یہ تینوں اوصاف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں بدرجہ اتم موجود تھے، آپ کا کمال آپ کی کامل و مکمل شریعت سے ظاہر ہے، جمال جہاں آراء کا ذکر جمیل احادیث شمائل میں ہے اور آپ کا کرم وجود ظاہری و باطنی تو سارے عالم و عالمیان کو شامل ہے، پھر آپ کی محبت تمام مخلوق سے زیادہ کیوں نہ ہو اس موقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقہ میں حاصل ہونے والے چند انعامات و اکرامات کا ذکر مناسب ہے۔

(۱) پہلی امتوں پر معاصی اور کفر و شرک کے سبب عام عذاب الٰہی آتا تھا، آپ کی امت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان محبوبیت کے صدقہ میں اس سے محفوظ کر دی گئی، اس کی سپاس گزاری دوسرے خواہ نہ کریں، مگر مسلمان تو بندہ احسان ہیں۔

(۲) پہلی امتوں کے لیے جسم ولباس کی پاکی کے لیے احکام بہت سخت تھے، جو اس امت کے لیے بہت نرم کر دیئے گئے ہیں حتیٰ کہ تیمم تک کا جواز ہوا۔

(۳) پہلی امتوں کے واسطے اداء عبادت کے لئے صرف معابد مخصوص تھے، دوسری جگہ ان کی ادائیگی درست نہ تھی، اس امت کے لئے ہر جگہ عبادت کرنا درست ہے۔

(۴) اس امت کو ''خیر الامم'' کا لقب عطا ہوا

(۵) درمنثور کی روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ ''قیامت کے دن ۶۹ دوسری امتیں ہوں گی اور سترویں امت میری ہوگی، ہم سب سے آخر میں اور سب سے بہتر ہوں گے۔

(۶) ایک دفعہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے فرمایا کہ تم ہم سے پہلے ہو اور ہم آخر میں ہیں مگر قیامت کے دن حساب میں تم سے پہلے ہوں گے (مصنف ابن ابی شیبہ ابن ماجہ و کنز العمال)

(۷) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بنی اسرائیل کا انتظام ان کے انبیاء علیہم السلام فرماتے تھے، جب ایک نبی کی وفات ہوتی تو دوسرا اس کا جانشین ہو جاتا تھا لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا اور میرے خلفاء (امت میں سے) انتظام کریں گے اور وہ بہت ہوں گے، صحابہ نے عرض کیا کہ ہم کس طرح کریں؟ فرمایا: الاول فالاول کے بیعت کے حقوق ادا کرنا (بخاری و مسلم وغیرہ)

(۸) تورات میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس امت کا بھی ذکر خیر ہوا اور ان کے اوصاف حسنہ سے امم سابقہ کو متعارف کرایا گیا مثلاً حسب روایت داری و مصابیح یہ اوصاف مذکور ہوئے، نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی امت اللہ تعالیٰ کی ہر وقت ثنا کرے گی، ہر حال میں حمد کریگی، ہر جگہ اس کی حمد اور ہر بلندی پر خدا کی تکبیر کہے گی۔ آفتاب کے تغیرات کا انتظار کرے گی، جب نماز کا صحیح وقت آجائے گا فوراً نماز ادا کرے گی، ان کے تہبند نصف ساق تک ہوں گے، وہ اپنے ہاتھ پاؤں دھوئے گی (یعنی وضو کے لئے) ان کا مؤذن فضاء آسمان میں اعلان کرے گا، جہاد اور نماز دونوں میں ان کی صفیں یکساں ہوں گی۔ راتوں میں ان کی (تلاوت قرآن مجید، ذکر وغیرہ کی) آواز شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح (دھیمی وپست) ہوگی۔

(۹) اس امت کی عمریں کم مگر ثواب پہلی امتوں کے برابر ہوگا۔

(۱۰) قیامت کے دن امت محمدیہ دوسری تمام امتوں سے ممتاز ہوگی کہ ان کے اعضاء وضو روشن و منور ہوں گے۔

(۱۱) قیامت کے دن سب سے پہلے یہی امت پل صراط سے گزرے گی۔

(۱۲) سب سے پہلے جنت میں داخل ہوگی۔

(۱۳) جنت والوں کی ۱۲۰ صفیں ہوں گی، جن میں بہت بڑی تعداد یعنی ۸۰ صفیں اس امت محمدیہ کی ہوں گی۔

شکر نعمتہائے تو چند آنکہ نعمتہائے تو　　عذر تقصیرات ما چند آنکہ تقصیرات ما

ترمذی شریف کی ایک روایت میں حب رسول کا آسان طریقہ بھی بیان ہوا ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ سے محبت رکھو کیونکہ وہ تمہیں انواع واقسام کی نعمتوں سے سرفراز فرماتا ہے اور مجھ سے خدا کی محبت کی وجہ سے محبت کرو اور میرے اہل بیت سے میری وجہ سے محبت کرو۔

حدیث بخاری میں "حب رسول" کا نہایت ہی بیش بہا ثمرہ بھی ذکر ہوا ہے اس طرح کہ ایک شخص نے محبوب دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ قیامت کب آئے گی؟ آپ نے فرمایا کہ تم نے اس کے لئے کیا کچھ تیاری کر رکھی ہے؟ اس نے عرض کیا کہ حضرت! مجھ سے تو نہ زیادہ نمازیں پڑھی گئیں، نہ زیادہ روزوں اور صدقات کی توفیق ہوئی البتہ اتنی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے مجھے محبت ہے آپ نے فرمایا کہ تم (قیامت میں) اسی کے ساتھ ہو گے جس سے تمہیں محبت ہو گی۔

حضرت شاہ صاحب قدس سرہ العزیز کی رائے عالی پہلے درج ہو چکی ہے کہ حب رسول میں حب طبعی ہی مانتے ہیں، جس کی وجوہ گزر چکیں، دوسرے اس لئے بھی کہ حضرت شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ اصولی طور سے بھی ایسے مواقع میں اہل عرف ولغت کے متعارف وعام معنی کو ترجیح دیتے تھے حضرت رحمتہ اللہ علیہ کی رائے یہ بھی ہے کہ نبی کریم اللہ علیہ وسلم کی محبت آپ کے صرف اوصاف ہدایت اور اخلاق فاضلہ وغیرہ کے سبب نہیں، بلکہ آپ کی ذات اقدس کی وجہ سے بھی ہونی چاہئے۔

لہٰذا آپ اپنی ذات مبارکہ طیبہ کے سبب بھی محبوب ہیں اور اپنے اوصاف حسنہ ملکات فاضلہ اور اخلاق کاملہ کی وجہ سے بھی۔

صلی اللہ علیہ وسلم بعد و کل ذرة الف الف مرة.

باب حلاوة الايمان

"حلاوت ایمان کے بیان میں"

۱۵ — حدثنا محمد بن المثنى قال ثنا عبدالوهاب الثقفي قال ثنا ايوب[1] عن ابى قلابة عن انس عن النبى صلى الله عليه وسلم قال:. ثلاث من كن فيه وجدا حلاوة الايمان ' ان يكون الله ورسوله احب اليه مما سوا هما وان يحب المرء لايحبه الا لله وان يكره ان يعود فى الكفر كما يكره ان يقذف فى النار.

ترجمہ:۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص میں تین باتیں ہوں گی، وہ ایمان کی حلاوت پالے گا، خدا و رسول خدا اس کو تمام دوسری چیزوں سے زیادہ محبوب ہوں، جس سے بھی محبت کرے، خدا کے واسطے کرے، کفر و شرک اختیار کرنے سے اس قدر متنفر و بیزار ہو جس قدر آگ میں ڈالے جانے سے دور اور متنفر ہو سکتا ہے۔

تشریح:۔ علماء نے لکھا ہے کہ حلاوت ایمان سے مراد یہ ہے کہ طاعات میں لذت محسوس ہو اور خدا اور رسول کی رضامندی کے لئے بڑی سے بڑی تکالیف بھی گوارا ہوں، حدیث میں تین چیزوں کا ذکر ہے ان میں سے پہلا نمبر یہ ہے کہ اللہ و رسول کی محبت دوسری سب چیزوں کی محبت پر غالب ہو۔ اللہ تعالیٰ کی محبت تو اس لئے کہ وہ رب الارباب، اور منعم حقیقی ہے، ساری نعمتیں اسی کے فضل وکرم سے وابستہ ہیں، رسول

---

[1] کنیت ابوبکر نام ایوب بن ابی تمیمہ السختیانی، ولادت 68-66ھ وفات ۱۳۱ھ مشہور زہاد کبار تابعین سے ہیں، صحاح ستہ میں ان سے روایت ہیں، تہذیب صفحہ ۱/۳۹۷ میں مفصل تذکرہ اور مناقب جلیلہ ذکر ہیں، جامع المسانید صفحہ ۲/۳۸۳ میں لکھا کہ امام اعظمؒ نے بھی آپ کے روایت حدیث کی ہے، حافظ عینی نے عمدۃ القاری میں لکھا کہ آپ سے آٹھ سو احادیث روایت کی گئی ہیں، امام المحدثین حضرت شعبہؒ نے آپ کو سید الفقہا کہا، حماد بن زید نے اپنے سب شیوخ و معاصرین سے افضل اور زیادہ متبع سنت کہا، دار قطنی نے حفاظ اثبات میں شمار کیا۔ ابن سعد نے ثقہ، ثبت فی الحدیث، جامع، کثیر العلم، حجت و عدل لکھا، اتنے بڑے جلیل القدر محدث سے صرف ۸ سو حدیث روایت ہوئیں اور کسی نے ان کو قلت روایت کا طعنہ نہیں دیا اور امام اعظمؒ سے ہزار ہا احادیث روایت ہوئیں تب بھی ان کو قلت روایت سے مطعون کیا گیا، درحقیقت اس دور کے محدثین خصوصاً فقہا محدثین سب ہی روایت میں نہایت محتاط تھے۔

کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت اس لئے کہ روحانی انعامات وعلوم الٰہیہ کیلئے وہی واسطہ ہیں۔

دوسری چیز یہ ہے کہ ان دونوں محبوب سے جو نعمتیں حاصل ہوئیں ان میں سے سب سے زیادہ عزیز ترین دولت ایمان کی دولت ہے اور ان کی سب سے زیادہ مبغوض چیز کفر وشرک ہے لہٰذا ایمان کی دولت کسی حالت میں بھی ہاتھ سے نہیں دی جاسکتی' اور کفر وشرک کے ادنیٰ شائبہ سے بھی پوری بےزاری ونفرت ہونی ضروری ہے۔

تیسری چیز یہ ہے کہ دنیا کے مجازی محبوبوں کی محبت کا یہ حال ہے کہ ان سے ادنیٰ تعلق رکھنے والوں سے بھی محبت ہوا کرتی ہے تو پھر محبوب حقیقی سے محبت کا تقاضا یہ کیوں نہ ہوگا کہ اس سے محبت کرنے والوں سے تعلق رکھنے والوں سے محبت نہ ہو' بلکہ ایک مومن مخلص کے لئے اعلیٰ درجہ تو یہ ہے کہ جس سے بھی وہ محبت کرے یہی دیکھ کر کرے کہ وہ خدا سے بھی کچھ علاقہ ومحبت رکھتا ہے۔ ایک حدیث میں ہے "من احب للہ وابغض للہ فقد استکمل الایمان" (جس نے خدا کے لئے محبت کی اور خدا کے لئے بغض کیا اس نے اپنا ایمان مکمل کرلیا) اس تشریح سے یہ بھی معلوم ہوا کہ پہلی دو چیزیں نہایت اہم ہیں اور تیسری چیز (حب للہ) مکملات ایمان میں سے ہے۔ واللہ اعلم۔

بحث ونظر: محدث عارف ابن ابی جمرہؒ نے بہجۃ النفوس صفحہ ۲۵/۱ تا صفحہ ۲۸/۱ میں حدیث مذکور کے متعلقات پر بہت اچھی بحث کی ہے اس میں یہ بھی فرمایا کہ حلاوت ایمان کے بارے میں بحث ہوئی ہے کہ وہ امر محسوس ہے یا باطنی ومعنوی بعض حضرات نے معنوی قرار دیا۔ یعنی جس میں وہ موجود ہوگی وہ ایمان میں پختہ اور احکام اسلامی کا پورا مطیع ومنقاد ہوگا یہ فقہا کی رائے ہے' دوسرے حضرات نے اس کو محسوس چیز قرار دیا' اور یہ سادات صوفیہ کی رائے ہے' صاحب بہجہ نے لکھا ہے کہ میرے نزدیک حق وصواب بھی یہی رائے معلوم ہوتی ہے' کیونکہ اس سے حدیث کا مطلب بغیر کسی تاویل کے سمجھ میں آتا ہے لیکن یہ بات ایسی ہے کہ اس کا ادراک واحساس وہی کرسکتے ہیں۔ جو خود بھی اس مرتبہ ومقام تک پہنچے ہوں' لہٰذا ایسا دعویٰ کرنا موزوں نہیں کہ حدیث میں وہ مرتبہ ومقام مراد ہی نہیں ہے۔

واذا لم تر الهلال فسلم لاناس راوه بالا بصار

(تو نے اگر خود چاند کو نہیں دیکھا تو ان لوگوں کی بات ہی مان لے جنہوں نے اپنی آنکھوں سے اس کو دیکھ لیا ہے) دوسرے یہ کہ سادات صوفیہ کی رائے کی تائید صحابہ وسلف اور واصلین کاملین کے حالات سے بھی ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے حلاوت ایمان کو محسوس طریقہ پر حاصل کرلیا تھا۔ مثلاً

(۱) حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا واقعہ کہ ان کو ایمان سے ہٹا کر کفر کی طرف لوٹانے کے لئے قسم قسم کی تکالیف دی گئیں مگر وہ برابر احد احد کہتے رہے' تو اس کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ عذاب وتکلیف کی تلخی ایمان کی حلاوت کے ساتھ ایسی مل گئی تھی کہ حلاوت تلخی پر غالب آگئی تھی' اسی لئے جب ان کی موت بھی اسی حالت میں آگئی تو ان کے گھر کے آدمی تو واکرباہ (کیسی سخت مصیبت وبلا ہے) کہتے تھے' اور وہ خود واطرباہ (کیسی خوشی ومسرت کا مقام ہے) کہہ رہے تھے پھر فرماتے تھے ۔ **غدا القی الاحبہ محمداً وحذبه**

(کل کو میں اپنے دوستوں سے ملوں گا' محبوب دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی ساری جماعت سے جاملوں گا) گویا انہوں نے موت کی تلخی کو لقاء سرور دوعالم وصحابہ کی حلاوت کے ساتھ ملا کر اس تلخی کے احساس کو مغلوب کردیا تھا۔ اور یہی حلاوت ایمان ہے۔

(۲) ایک صحابی اپنا گھوڑا باندھ کر نماز پڑھنے لگے' ایک شخص آیا اور گھوڑا کھول کرلے گیا' انہوں نے نماز نہیں توڑی' لوگوں نے کہا کہ آپ نے یہ کیا کیا؟ فرمایا کہ میں جس امر میں مشغول تھا وہ گھوڑے سے بہت زیادہ قیمتی تھا' یہ بھی حلاوت ایمان ہی تھی۔

(۳) ایک حدیث میں ہے کہ کسی جہاد کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو شخصوں کی ڈیوٹی لگائی کہ رات کے وقت لشکر اسلام کی حفاظت کے لئے جاگ کر پہرہ دیں' انہوں نے طے کیا کہ نوبت بہ نوبت ایک سوجائے اور دوسرا جاگتا رہے اور جاگنے والا نماز کی نیت باندھ کر کھڑا

ہو گیا' دشمن کے جاسوس ادھر آ نکلے اور دیکھا کہ ایک سو رہا ہے دوسرا نماز میں مشغول ہے' پہلے نماز والے کا خاتمہ کر دیا جائے چنانچہ اپنی کمان کھینچ کر اس پر تیر برسانا شروع کر دیئے باوجود اس کے وہ صحابی نماز میں مشغول رہے اور زخموں کی کوئی پروانہ کی۔ جب سارے بدن سے گرم خون بہہ کر سونے والے صحابی تک گیا تو وہ اٹھ بیٹھے اور نماز والے صحابی نے بھی نماز توڑ کر دشمن کی طرف توجہ کی اور کہا کہ اگر لشکر اسلام کی حفاظت کا خیال نہ آتا تو میں اب بھی اپنی نماز نہ توڑتا یہ بھی حلاوت ایمان ہی نہ تھی تو اور کیا تھا۔ اور اس طرح کے واقعات سے تاریخ اسلام بھری پڑی ہے۔

شیخ ابو العباس اسکندرانی کا ارشاد

صاحب بہجہ کی طرح عارف کبیر ابو العباس تاج الدین ابن عطاء اللہ اسکندرانی نے بھی لکھا کہ اس حدیث میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ جو قلوب تندرست ہیں یعنی غفلت وخواہشات نفسانیہ وغیرہ کے امراض سے محفوظ ہیں وہ روحانی لذتوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں' جس طرح ایک صحت مند آدمی کھانوں کے صحیح ذائقوں سے لطف اندوز ہوتا ہے اور مریض کو ہر اچھی چیز کا ذائقہ بھی کڑوا یا میٹھا معلوم ہوتا ہے حتیٰ کہ صفرا کے مریض کو شہد جیسی میٹھی چیز بھی کڑوی معلوم ہوتی ہے۔

حضرت ابراہیم ادہم کا ارشاد

حضرت ابراہیم بن ادہمؒ فرمایا کرتے تھے کہ ہمیں خدا کے ذکر واطاعت میں وہ لذت حاصل ہے کہ اگر شاہان دنیا کو اس کا علم ہو جائے تو ہم پر لشکر کشی کر کے اس کو چھین لینے کی سعی کریں۔

حضرت جنید رحمہ اللہ کا ارشاد

حضرت جنید رحمۃ اللہ کا قول ہے "اهل الليل في ليلهم الذمن اهل الهوىٰ في هواهم" یعنی دنیا والوں کو کسی لہو ولعب اور بڑے سے بڑے تعیش میں وہ لذت وسرور نہیں مل سکتا جو شب خیز لوگوں کو رات کی عبادات وذکر الٰہی میں ملتا ہے۔

شیخ اسکندرانی کا بقیہ ارشاد

ابن عطا نے یہ بھی فرمایا کہ جو لوگ خدائے تعالیٰ کو رب حقیقی مان کر اس کے احکام کے پوری طرح مطیع ومنقاد ہو جاتے ہیں وہی حقیقت میں عیش کی لذت اور تفویض کی راحت محسوس کرتے ہیں اور خدا ان سے راضی ہو کر ان پر دنیا میں بھی انعامات واکرامات کی بارش فرماتا ہے ایسے لوگوں کے قلوب امراض روحانی سے محفوظ رہتے ہیں' جس کی وجہ سے ان کا ادراک صحیح اور ذوق سلیم رہتا ہے اور وہ پوری طرح ایمان کا ذائقہ اور حلاوت حاصل کر لیتے ہیں۔ (فتح الملہم من المواہب وشرحہ۔ صفحہ ۱/۲۱۷)

صاحب بہجہ النفوس وغیرہ کی مذکورہ بالا تحقیق بہت اونچی ہے' مگر جو واقعات وشواہد انہوں نے بیان فرمائے ہیں' وہ جس طرح حلاوت محسوسہ کی دلیل بن سکتے ہیں' حلاوت معنویہ کی بھی بن سکتے ہیں اور روحانی امور میں معنوی حلاوت ہی زیادہ راجح معلوم ہوتی ہے۔ واللہ اعلم۔

علامہ نووی نے شرح بخاری میں لکھا ہے کہ علماء کے نزدیک حلاوت سے مراد طاعات کو لذیذ ومحبوب سمجھنا' خدا اور رسول کے راستہ میں تکالیف ومصائب کو بخوشی برداشت کرنا' اور ان کو دنیوی مرغوبات پر ترجیح دینا ہے (شروح البخاری صفحہ ۱۳۹)

دوسری اہم بات یہ ہے کہ امام بخاریؒ نے اس حدیث کے استعارہ سے زیادہ ونقصان ایمان پر استدلال کرنا چاہا ہے (کما اشار الیہ شیخنا الانور) لیکن حلاوت کا لفظ خود بتلا رہا ہے کہ اس حدیث میں ارکان واجزاء ایمان کا بیان مقصود نہیں بلکہ مکملات ایمان کی تفصیل مقصود ہے' اسی لئے جو چیزیں اس میں بیان ہوئیں وہ سب ایک درجے کی نہیں' اور غالباً اسی طرف علامہ قسطلانی نے اشارہ کیا ہے' انہوں نے لکھا کہ:۔

ھذا (باب حلاوۃ الایمان) والمراد ان الحلاوۃ من ثمراته فھی اصل زائد ملیه" (مراد یہ ہے کہ حلاوت ایمان کے ثمرات میں سے ہے لہٰذا وہ اس کے لئے بطور اصل زائد ہے) یعنی جس طرح ایمان کو قوت واستحکام پہنچانے والے اور اس کی تکمیل کرنے والے اور بہت سے امور ہیں ان تین باتوں سے بھی ایمان میں کمال بطور استلذ از طاعات پیدا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ایمان کے زیادۃ ونقص پر ہم پہلے بہت کچھ لکھ آئے ہیں جو کافی وشافی ہے وللہ الحمد۔

علمی فائدہ

عود کا صلہ عموماً الی ہوتا ہے اس حدیث میں فی کیوں آیا ہے؟ اس کا جواب علامہ کرمانی اور حافظ ابن حجر نے یہ دیا ہے کہ عود متضمن ہے معنی استقرار کو گویا "ان یعود مستقرا فیه" کہا گیا ہے مگر امام عربیت حافظ عینی نے اس امر پر اعتراض کیا اور فرمایا کہ یہ بے ضرورت تاویل بعید ہے پھر فرمایا کہ یہاں فی بمعنی الی ہی ہے جس طرح دوسری آیت او لتعودن فی ملتنا وللہ درہ۔

اشکال وجواب

اس حدیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مما سواھما فرمایا حالانکہ ایک خطبہ پڑھنے والے پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نکیر فرمائی تھی جس نے ومن یعصھما فقد غوی کہا تھا اگر ایک کلمہ میں دونوں کو جمع کرنا ناپسند تھا تو اس کو خود کیوں اختیار فرمایا؟ اس کے کئی جواب دیئے گئے ہیں جو حافظ عینی نے نقل فرمائے ہیں۔

(۱) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے محبت میں جمع فرمایا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ دونوں کی محبت ضروری ہے ایک کی کافی نہیں اور معصیت والی صورت میں منع فرمایا کیونکہ نافرمانی صرف ایک کی بھی مضر ہے یہ جواب قاضی عیاض کا ہے۔

(۲) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے کو اس لئے منع فرمایا کہ اس سے یہ وہم ہوسکتا ہے کہ کہنے والا دونوں کو ایک مرتبہ میں سمجھتا ہے مگر خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں چونکہ ایسا وہم نہیں ہوسکتا اس لئے آپ کے جمع فرمانے میں کوئی مضائقہ نہیں پس یہ آپ کے خصائص سے ہوا۔

(۳) خطبہ کا مقام ایضاح وتفسیر کا ہوتا ہے اس لئے جمع واختصار کو ناپسند فرمایا اور احادیث میں بیان حکم کے موقع پر اختصار موزوں ہے تاکہ اس کو مختصر ہونے کی وجہ سے بسہولت یاد کرلیا جائے چنانچہ سنن ابی داؤد وغیرہ کی حدیث میں جمع کے ساتھ وارد ہے۔

من یطع اللہ ورسوله فقد رشد ومن یعصھما فلا یضر الا نفسه۔

(۴) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطیب کو افراد کا حکم اس لئے دیا کہ وہ مقام حق تعالیٰ کا ذکر مستقلاً الگ کرکے زیادہ سے زیادہ تعظیم کے اظہار کا تھا یہ جواب اصولیوں کا ہے (عمدۃ القاری صفحہ ۱/۱۷۵)

(۵) ہمارے حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو یہ جواب پسند تھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطیب کو بطور تادیب وتہذیب روکا تھا جس طرح قرآن مجید میں "لاتقولوا راعنا" ادب وتہذیب سکھانے کے لئے فرمایا گیا ہے اس جواب سے ایک زیادہ معتدل صورت بن جاتی ہے جو قرآن وسنت سے زیادہ موافق ہے۔ واللہ اعلم

باب

علامة الایمان حب الانصار"۔ (انصار کی محبت علامت ایمان ہے)

۱۶۔ حدثنا ابوالولید قال ثنا شعبة قال اخبرنی عبداللہ بن جبیر قال سمعت انس بن مالک عن النبی صلی اللہ علیه وسلم قال آیة الایمان حب الانصار وآیة نفاق بغض الانصار

ترجمہ:۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ انصار کی محبت ایمان کی علامت ہے اور انصار سے بغض نفاق کی علامت ہے۔

تشریح:۔ پہلے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے مطلق محبت کی فضیلت کا ذکر کیا تھا' جو خدا کے لئے ہر ایک کے ساتھ ہو سکتی ہے' اب ایک خاص گروہ کی محبت کا ذکر لائے اور ان میں سے بھی انصار کو منتخب کیا' جن کی محبت نظر شارع علیہ السلام میں ایمان کی علامت ہے۔ اور ابتدا سے ترتیب اس طرح ہے کہ پہلے ایمان کا ذکر ہوا' پھر اس کی حلاوت کا بیان ہوا اور اب اس کی علامت بتلا رہے ہیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی رائے

ہمارے حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کا قرآن و حدیث کو سمجھنے کا ایک خاص طرز تھا اور وہ فرمایا کرتے تھے کہ فلاں حدیث کا مضمون فلاں آیت سے مستنبط ہے یا فلاں حدیث فلاں آیت کے مضمون کی تشریح ہے وغیرہ' حضرت کا یہ طرز تحقیق نہایت گرانقدر تھا اسی لئے حضرت علامہ عثمانیؒ فرمایا کرتے تھے کہ ہماری بہت بڑی کوشش ہوگی تو ہم کتابوں کا مطالعہ کر کے مسائل کی تحقیق کر لیں گے مگر حضرت شاہ صاحبؒ کی رسائی مسائل کی ارواح تک تھی جو ہمارے بس کی بات نہیں۔ وفوق کل ذی علم علیم۔

یہ حضرت عثمانیؒ کا ارشاد تھا جو وسعت مطالعہ اور علم و فضل خداداد کے لحاظ سے اپنے زمانے کے فرد بے مثال تھے۔ متعنا اللہ بعلومہ النافعہ۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے اس حدیث الباب کے بارے میں فرمایا کہ اس کا ماخذ قرآن مجید کی آیت "والذین تبوؤا الدار والایمان" ہے یعنی حق تعالیٰ نے سورہ حشر کی ان آیات میں انصار کے فضل و شرف' کرم و جود' حب و ایثار وغیرہ اوصاف کا بیان فرمایا ہے اور یہ وصف بھی خاص طور سے بیان فرمایا کہ جنہوں نے مہاجرین کی آمد مدینہ منورہ سے پہلے مدینہ طیبہ اور ایمان کو اپنا گھر بنا لیا تھا' مدینہ طیبہ کو گھر بنانا تو ظاہر ہے مگر ایمان کو گھر بنانے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح گھر میں بیٹھ کر آدمی اس میں محفوظ ہوتا ہے اسی طرح انصار ایمان کے گھیرے اور احاطہ میں آ چکے تھے' ایمان بطور ظرف تھا اور وہ مظروف تھے' ایمان کے در و دیوار ان کے چاروں طرف تھے اور وہ ان کے بیچ میں بیٹھے ہوئے تھے' جس طرح اہل جنت کا حال مذکور ہے "ان المتقین فی جنات ونھر فی مقعد صدق عند ملیک مقتدر"۔

(متقین' جنتوں اور نہروں میں' سچائی کے گھر میں' سب سے بڑے با اقتدار بادشاہ کے قرب سے سرفراز ہوں گے) اس سے پہلے مجرمین کفار و مشرکین کے لئے فرمایا تھا کہ وہ گمراہی اور آگ کی لپٹوں میں گھرے ہوں گے' گویا جرم کفر و شرک کی سزا آخرت میں یہ ہوگی کہ ان کی دنیا کی گمراہی و طغیان و عصیان' وہاں ان کو آگ کی لپٹوں کی شکل میں مجسد ہو کر محصور کئے ہوگی اور چونکہ متقین نے سچائی اختیار کی تھی تو آخرت میں وہ ایمان و ہدایت کی سچائی مجسد ہو کر مقعد صدق بن جائے گی۔ کیونکہ یہاں جتنی چیزیں مستور ہیں مثلاً معانی و اعراض وہ سب آخرت میں مجسد و محسوس ہو جائیں گی۔

یہاں سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ مومن کا گھر ایمان و ایمانیات ہے وہ ان کے حصار میں رہ کر کفر و شرک کے حملوں سے محفوظ رہتا ہے اور اعمال صالحہ باہر سے اس گھر کی حفاظت بطور قلعہ اور اس کی خندقوں وغیرہ کے کرتے ہیں' اعمال صالحہ کے قلعہ میں محصور ہو کر ایک مومن فسق و فجور اور معاصی کی یلغار سے محفوظ رہتا ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی نکتہ رسی

خیال کیجئے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کی دوررس نظر نے کتنی اونچی بات کا کھوج لگایا۔ جس سے ایمان و کفر اور عمل صالح و معاصی کی صحیح پوزیشن واضح ہوگئی اور فی ضلال و سعر' اور تبوؤا الدار والایمان کی بہترین تفسیر بھی بغیر کسی تاویل بعید کے سمجھ میں آ گئی' اور یہاں اس

حدیث میں انصار کی محبت کو علامت ایمان فرمانے کی وجہ بھی روشن ہوگئی ایک تو یہ کہ سب سے پہلے مدینہ طیبہ سے مکہ معظمہ جا کر اسلام سے مشرف ہونے والے یہ لوگ تھے جس کی تفصیل آگے آتی ہے) پھر ان کا ایمان و اسلام بھی کامل و مکمل اور تقلیدی تھا کہ سب مسلمانوں کا ایمان اس شان کا ہونا چاہیے ان کے ایمان کی قیمت اتنی زیادہ قرار دی گئی کہ مہاجرین کو ان کی محبت کی ترغیب دی گئی۔ حالانکہ مہاجرین کے درجات خود اپنی جگہ نہایت بلند تھے ان کے مستحکم ایمان اور عظیم الشان قربانیوں کی مثال نہیں مل سکتی اور صرف ہجرت ہی بہت بڑی فضیلت ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہجرت (کی فضیلت) نہ ہوتی تو میں اپنا شمار انصار میں کراتا (بخاری) بلکہ اگر زیادہ گہری نظر سے دیکھا جائے تو انصار کی محبت وغیرہ کی ترغیب سے مقصد بھی ان کے فضائل کو نمایاں کرنا اس لئے ہے کہ ان کے فضائل حضرات مہاجرین کے فضائل و مناقب کے مقابلے نظروں سے اوجھل ہو رہے تھے دوسرے یہ کہ مہاجرین میں اکثر حضرات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل قرابت تھے ان سے محبت آپ کی قرابت کے سبب بھی ہر مسلمان کو فطری طور سے تھی لیکن انصار مدینہ بظاہر اجانب تھے ان کی محبت سے ذہن غافل ہوسکتا تھا اس لئے تنبیہ فرما دی کہ ان کی محبت بھی اس لحاظ سے فطری ہونی چاہیے کہ انہوں نے بھی اہل بیت کا مقام حاصل کر لیا تھا۔ "والذین تبوؤ االدار و الایمان یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے "ایمانی گھر" کی نسبت سے جس طرح مہاجرین آپ کے اہل بیت ہیں ایسے ہی انصار بھی ہیں۔ اس کے بعد اسی روحانی و ایمانی رشتہ سے سارے مومنین و متقین حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت ہیں اور ایک حدیث میں ایک ایسا مضمون بھی ہے کہ ہر تقی و نقی مسلمان میری آل میں داخل ہے۔

النبی اولی بالمومنین من انفسهم وازواجه امهاتهم و فی قراءة وهو اب لهم. والله اعلم و علمه اتم واحکم.

انصار مدینہ کے حالات

انصار کا اصل وطن مدینہ طیبہ نہ تھا بلکہ وہ سبا کی بستیوں میں یمن کے علاقہ میں رہتے تھے جب سبا پر تباہی آئی تو ایک کاہنہ نے اطلاع دی کہ ان بستیوں پر جلد ہی خدا کا عذاب آنے والا ہے جو اس سے بچنا چاہے یہاں سے نکل جائے چنانچہ قبیلہ سبا کے لوگ اور بنو قیلہ (انصار مدینہ کے اباؤ اجداد) ادھر ادھر منتشر ہوگئے کچھ لوگ شام چلے گئے اور بنو قیلہ کے دو قبیلے اوس و خزرج مدینہ طیبہ میں آکر مقیم ہوگئے۔

اس وقت مدینہ طیبہ میں یہود کا تسلط تھا ان میں تین قبیلے بڑے تھے بنو قینقاع بنو نضیر اور بنو قریظہ بنو قینقاع سب سے بہادر تھے لوہاری کا پیشہ کرتے تھے یہودیوں نے اوس و خزرج کو اس شرط پر اقامت مدینہ کی اجازت دی کہ جب کسی کے یہاں شادی ہوگی اسے سب سے پہلی رات میں دلہن کو ہمارے یہاں بھیجنا پڑے گا ان لوگوں نے مجبوری میں اس شرط کو قبول کر لیا مگر خدا کو ان کی حفاظت منظور تھی جس کی صورت یہ ہوئی کہ جب شادی ہوئی تو وہ شادی شدہ لڑکی منہ کھول کر سارے مجمع کے سامنے آگئی مجمع میں جو اعزہ و اقرباء موجود تھے انہوں نے اس کو بے حجابی پر عار دلائی تو اس نے کہا کہ مجھ سے پہلے تمہیں بے غیرتی کا ماتم کرنا چاہیے کہ مجھے غیر شوہر کے پاس بھیجنے پر راضی ہو۔

اس پر ان لوگوں کی غیرت و حمیت کو بھی جوش آیا اور تہیہ کر لیا کہ اس ذلت کو ہرگز گوارہ نہیں کریں گے اور ضرورت ہوئی تو یہود مدینہ سے جنگ بھی کریں گے جنگ کی تیاری کی اور خدا کے بھروسہ پر وہ لوگ یہود سے بھڑ گئے اور خدا نے ان کو یہود پر غالب کر دیا اس کے بعد یہود مدینہ اوس و خزرج سے کہا کرتے تھے کہ نبی آخر الزماں کے ظہور پر ہم تمہاری ان حرکات کا جواب دیں گے اوس و خزرج کو بھی ان کی اس بات سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی امید ہوگئی تھی پھر موسم حج پر جو لوگ مکہ معظمہ جاتے تھے ان سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کی بھی خبریں آنی شروع ہوگئیں اور ان لوگوں نے ارادہ کر لیا کہ ہم یہود سے بھی پہلے نبی آخر الزماں پر ایمان لائیں گے۔

اوس و خزرج میں سے پہلا قافلہ موسم حج پر مکہ معظمہ پہنچا اور منیٰ میں جمرہ عقبہ کے مقام پر ٹھہرا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تبلیغ اسلام کے

لئے ان کے پاس تشریف لے گئے انہوں نے کہا کہ ہمارے چند آدمی باہر گئے ہیں ہم ان سے مشورہ کرلیں گے آپ شب کو تشریف لائیں مشورہ میں طے پایا کہ یہ وہی پیغمبر آخرالزمان معلوم ہوتے ہیں جن کے ساتھ مل کر یہود ہمیں استیصال کی دھمکیاں دیا کرتے تھے اس لئے موقع غنیمت ہے ہمیں ان کی بات قبول کرلینی چاہئے پھر جب آپ رات میں تشریف لے گئے تو ان بارہ آدمیوں نے دعوت اسلام قبول کرلی اس رات کو لیلتہ العقبہ کہا جاتا ہے اور اس مقام جمرہ عقبہ پر انصار سے دو بیعتیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہیں۔ ایک یہی ہے کہ جو اسلام کی سب سے پہلی بیعت ہے دوسری بیعت انصار سے اگلے سال لی ہے جس میں ستر انصاری تھے انصار میں سے جن لوگوں نے پہلے بیعت کی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت کا عہد کیا وہ "نقباء الانصار" کہلائے گئے کیونکہ نقیب قوم کے ناظر نگراں و سردار کو کہتے ہیں۔

ایک انصاری جنتی کا واقعہ

حافظ ابن کثیرؒ اپنی تفسیر میں والذین تبوء وا الدار الایمان الایۃ کے ذیل میں ایک حدیث بروایت امام احمدؒ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیٹھے تھے آپ نے فرمایا کہ ابھی تمہارے پاس ایک شخص اہل جنت میں سے آئے گا اتنے میں ایک انصاری آئے جن کی ریش مبارک سے وضو کے قطرات گر رہے تھے اور انہوں نے اپنے دونوں چپل اپنے بائیں ہاتھ میں لٹکا رکھے تھے اگلے روز بھی آپ نے اسی طرح فرمایا اور شخص مذکور اسی شان سے حاضر مجلس ہوئے تیسرے دن بھی آپ نے اسی طرح فرمایا اور وہ اسی طرح آئے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم مجلس سے تشریف لے گئے تو حضرت عبداللہ ابن عمرو بن العاص ان انصاری کے ساتھ ہوئے اور کہا کہ میرا باپ سے کچھ جھگڑا ہو گیا اور میں نے قسم کھالی ہے کہ تین دن تک ان کے پاس نہ جاؤں گا اگر آپ مناسب سمجھیں تو اتنے وقت کے لئے مجھے اپنے پاس ٹھہرالیں۔ انصاری نے فرمایا بہت اچھا!

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضرت عبداللہ کا بیان ہے کہ وہ تین رات ان انصاری کے پاس رہے (تا کہ ان کی شب و روز کی پوری زندگی کا مطالعہ کریں) دیکھا کہ کسی رات میں بھی اٹھ کر عبادات نہیں کی بجز اس کے کہ رات کو جس وقت بھی نیند سے بیدار ہوتے تو اپنے بستر پر کروٹ بدلتے ہوئے خدا کا ذکر و تکبیر ضرور کرتے حتی کہ صبح کی نماز کے لئے اٹھ بیٹھتے تھے دوسرے یہ کہ کبھی میں نے ان کو سوائے خیر کے کوئی بات کہتے نہیں سنا جب تینوں راتیں گزر گئیں اور مجھے ان کے اعمال شبانہ روز کی کوئی وقعت محسوس نہ ہوئی تو مجھے ان سے کہنا پڑا کہ بھائی واقعہ یہ ہے کہ میرا باپ سے کوئی جھگڑا نہیں ہوا نہ میں نے ان کو چھوڑا میں نے چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تین بار سنا تھا کہ ایک جنتی شخص آرہا ہے اور تینوں دن آپ ہی آئے اس لئے ارادہ کیا کہ آپ کے پاس رہ کر دیکھوں کیا عمل کرتے ہیں تو میں نے کوئی بہت بڑا عمل آپ کا نہیں دیکھا اب آپ ہی بتلایئے کہ اس مرتبے کو کس طرح پہنچے؟ (کہ دنیا ہی میں جنتی ہونے کی بشارت مل گئی) انصاری نے فرمایا کہ عمل تو میرا اتنا ہی ہے جو آپ نے دیکھا میں یہ سن کر لوٹ پڑا تو انہوں نے بلایا اور پھر کہا کہ عمل تو اتنا ہی ہے جو آپ نے دیکھا البتہ اتنی بات اور ہے کہ میں اپنے دل میں کسی مسلمان کی طرف سے کھوٹ کی بات (کینہ عداوت وغیرہ) نہیں رکھتا اور نہ کسی کو اچھے حال میں دیکھ کر حسد کرتا ہوں حضرت عبداللہ نے فرمایا کہ بس یہی وہ بات ہے جس سے آپ اس مرتبہ پر پہنچے ہیں اور یہ وہ بات ہے جو ہر شخص کی طاقت و وسعت سے باہر ہے۔

ایں سعادت بزور بازو نیست　　　تا نہ بخشد خدائے بخشندہ!

غرض انصار مدینہ کے اسی قسم کے باطنی اخلاق اور کمال ایمان کے اوصاف تھے اور ان کی ابتداء اسلام کی بے نظیر خدمات تھیں جن کی وجہ سے ان کی محبت ایمان کی علامت قرار پائی اور ان سے بغض رکھنا نفاق کی نشانی ٹھہرائی گئی۔ اللھم اجعلنا معھم ومع من احبھم برحمتک وفضلک.

باب (۷ا) حدثنا ابوالیمان قال حدثنا شعیب عن الزهری قال اخبرنی ابوادریس عائذالله بن عبدالله عن عبادة بن الصامت وکان شهد بدرا وهو احد النقباء لیلة العقبة ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال وحوله عصابة من اصحابة بایعونی علیٰ ان لا تشرکوا بالله شیئا ولاتسرقوا ولاتزنو ولاتقتلوآ اولادکم ولاتاتو ببهتان تفترونه بین ایدیکم وارجلکم ولاتعصوانی معروف فمن وفی منکم فاجره علی الله ومن اصاب من ذلک شیئاً فعوقب فی الدنیا فهو کفارة له ومن اصاب من ذلک شیئًا ثم ستره الله فهو الی الله ان شاء عفا عنه وان شاء عاقبه فبایعناه علی ذلک.

ترجمہ: حضرت عبادہ بن صامتؓ جو بدر کی لڑائی میں شریک تھے اور لیلۃ العقبہ کے نقیبوں میں سے تھے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت جب آپ کے گرد صحابہ کی ایک جماعت موجود تھی یہ فرمایا کہ مجھ سے بیعت کرو اس بات پر کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو گے چوری نہیں کرو گے زنا نہیں کرو گے اپنی نسل کشی نہ کرو گے اور نہ عمداً کوئی بہتان باندھو گے اور کسی اچھی بات میں (خدا کی) نافرمانی نہ کرو گے جو کوئی تم میں (اس عہد کو) پورا کرے گا تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے اور جو ان (بری باتوں) میں سے کسی میں مبتلا ہو جائے اور اسے دنیا میں سزا دے دی گئی تو یہ سزا اس کے (گناہوں) لیے کفارہ ہو جائے گی۔ اور جو کوئی ان میں سے کسی بات میں مبتلا ہو گیا اور اللہ نے اس (گناہ) کو چھپالیا تو وہ (معاملہ) اللہ کے سپرد ہے اگر چاہے معاف کردے اور اگر چاہے سزا دے (عبادہؓ کہتے ہیں کہ) پھر ہم سب نے ان (سب باتوں پر) آپ سے بیعت کر لی۔

تشریح: یہاں امام بخاری نے صرف باب کا لفظ لکھا اور کوئی ترجمہ یا عنوان قائم نہیں کیا جس کی وجہ اکثر شارحین بخاری نے یہ لکھی ہے کہ اس باب کی حدیث باب سابق سے ہی متعلق ہے گویا اس کا تتمہ ہے کیونکہ اس میں انصار کی وجہ تسمیہ اور وجہ فضیلت ظاہر کی گئی ہے پہلے وہ بنو قیلہ کہلاتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو "انصار" کا لقب مرحمت فرمایا اور ان کے دینی فضائل کی وجہ سے ان کی محبت کو ایمان کی علامت فرمایا اس حدیث میں انصار کہلانے کی وجہ اور فضیلت کا بھی اظہار ہے کہ مکہ معظمہ کی زندگی میں (ایسے وقت کہ تقریباً سارے اہل مکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اسلام کے سخت مخالفت کر رہے تھے اور حضور کو اور آپ کے ساتھیوں کو طرح طرح کی ایذائیں دے رہے تھے) انصار کا پہلا قافلہ حج کے موسم میں مکہ معظمہ پہنچتا ہے اور منیٰ میں جمرہ عقبہ کے پاس جہاں حاجی ۱۰، ۱۱، ۱۲ ذی الحجہ کو رمی جمار کرتے ہیں۔ قیام کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر اسلام و نصرت اسلام کے لئے بیعت کی۔

اس حدیث کی روایت کرنے والے بھی ایک جلیل القدر صحابی انصاری حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ ہیں جو لیلۃ العقبہ کی اس پہلی بیعت میں بھی شریک تھے۔ اور اگلے سال دوسری بیعت میں بھی شریک ہوئے جس میں ستر (۷۰) انصار نے مدینہ طیبہ سے آکر اسی مقام پر بیعت کی تھی اس کے علاوہ بدر احد بیعت رضوان اور تمام غزوات میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے امام اوزاعی نے فرمایا کہ سب سے پہلے فلسطین کے قاضی بھی عبادہ ہی تھے ۷۲ سال کی عمر میں ۳۴ھ میں وفات پائی آپ سے ۱۸۱ حدیثیں مروی ہیں امام بخاری نے آپ سے ۸ یا ۹ حدیث روایت کی ہیں۔

اس حدیث کی روایت کرنے والے سب شامی ہیں اور اس ایک ہی حدیث میں تحدیث اخبار اور عنعنہ تینوں صورتیں روایت حدیث کی جمع ہیں اس میں ایک قاضی کی روایت دوسرے قاضی سے ہے ابوادریس بھی قاضی تھے۔ ایک صحابی نے دوسرے صحابی سے روایت کی ہے کیونکہ ابوادریس بھی صحابی ہیں۔

بحث و نظر: اس حدیث میں احکام اسلام پر بیعت فرما کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ جو شخص سارے احکام کی پابندی کرے وہ پورے اجر کا مستحق ہے جو معاصی کا مرتکب ہوا اور دنیا میں عقاب کی زد میں بھی آگیا تو وہ عقاب اس کے لیے معاصی کا کفارہ ہو گیا

اور جو یہاں اس سے بچ گیا تو اس کا معاملہ خدا کے سپرد ہے چاہے گا بخش دے گا' چاہے گا عقاب دے گا۔

اس وضاحت سے خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی ارجاء سنت کی حقیقت ثابت فرمادی' اور بعینہ یہی ارشاد ہے حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ اوران کے تابعین اور دوسرے سلف وخلف کا بھی' جس پر امام بخاریؒ نے خاص طور سے امام صاحب کو مطعون کیا کہ وہ تو مرجئی تھے وغیرہ' اور قرآن مجید میں تو و آخرون مرجون لا مر الله اما يعذ بهم و اما يتوب عليهم (توبہ) میں تو ارجاء کا لفظ ہی ذکر فرمادیا' اب ظاہر ہے کہ خدا کے نزدیک مرتکب معاصی تو مرجون ہیں' ان کے لیے بھی خدا کا فیصلہ بتلانے والے مرجئی ہیں۔ تو جس امر کی اجازت خود اللہ تعالیٰ دیں اور ابھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے بھی وہی بات نکلی پھر ان کے اتباع میں اگر امام صاحب وغیرہ نے بعینہ یہی بات کہی تو ان کو بطور طعن وطنز مرجئی کہنا کس طرح درست ہوسکتا ہے؟ ہاں! ارجاء بدعت ضرور بدعت ہے اور اس سے امام صاحب خود ہی بری و بیزار ہیں' اگر اس معنی سے ان کو مرجئی کہا جائے تو یہ ظلم فوق ظلم ہے۔

حدود کفارہ ہیں یا نہیں؟

اس حدیث میں جو عقوبت کو کفارۂ معاصی فرمایا گیا ہے' اس کی وجہ سے یہ بحث بھی چھڑ گئی ہے کہ حدود کفارہ ہیں یا نہیں؟ کسی معصیت پر شرعی حد لگ جانے پر اگر وہ مجرم توبہ[1] اور انابت الی اللہ بھی کرے تو اس جرم کے اثرات ظاہری و باطنی' دنیوی و اخروی سب ختم ہو جاتے ہیں' التائب من الذنب كمن لا ذنب له اس صورت میں سب کا اتفاق ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ جرم کیا مثلاً زنا' سرقہ وغیرہ اور جرم ثابت ہونے پر حد لگ گئی لیکن توبہ یا توبہ کے کچھ آثار ظاہر نہ ہوئے تو کیا صرف حد لگنے سے بھی وہ پاک صاف ہو گیا یا نہیں' اس میں اختلاف ہے امام اعظم اور دیگر ائمۂ احناف فرماتے ہیں کہ حد صرف دنیوی زجر و تنبیہ ہے' دنیاوی اعتبار سے حد کا مقصد حاصل ہو گیا کہ اس کو تنبیہ ہو گئی اور دوسروں کو اس سے عبرت ملی' اور اب اس کو دنیا والے۔ زانی یا سارق کہہ کر پکار بھی نہیں سکتے' لیکن آخرت کا مواخذہ ختم کرنے اور پوری طرح پاک صاف کرنے والی چیز توبہ ہے و من لم يتب فاولئك هم الظالمون (حجرات) غرض احناف کے نزدیک بغیر توبہ کے صرف حد کافی نہیں۔

خصوصاً جب کہ جرائم پیشہ لوگ یا عادی مجرم ہمیشہ زنا' سرقہ' شرب خمر وغیرہ کے عادی ہوتے ہیں اور ان پر حد بھی لگتی رہتی ہے' کیونکہ وہ صحیح معنی میں دل وزبان سے توبہ نہیں کرتے' اس کے برعکس شوافع کی رائے یہ ہے کہ حد سے گناہ بالکل دھل جاتا ہے' توبہ کرے یا نہ کرے' یہ حد ہی اس کے لیے توبہ کا قائم مقام ہے' امام بخاری کی رائے بھی شوافع کے ساتھ ہے چنانچہ کتاب الحدود میں ایک باب ''الحدود کفارۃ'' صفحہ ۱۰۰۳' میں آئے گا اور وہاں امام بخاری نے بھی عبادہ والی حدیث پیش کی ہے' ہم اس بحث کو مکمل طور پر انشاء اللہ تعالیٰ اسی مقام پر لکھیں گے اور بتلائیں گے کہ قرآن حدیث اور علم وعقل کی روشنی میں ائمۂ حنفیہ کا مسلک نہایت قوی ہے' یہاں مختصراً حضرت شاہ صاحب کی تحقیق عرض ہے کہ قرآن مجید میں کہیں بھی حدود کو کفارہ نہیں کہا گیا' بلکہ آیت السارق و السارقة فاقطعوا ايديهما الآیۃ میں تو تفصیل کے ساتھ فرمایا گیا کہ قطع ید بطور سزا ہے اس کے بعد اگر وہ توبہ کرے گا اور اپنی حالت کی اصلاح کرلے گا (جو توبہ ہی کا جزو ہے) تو اللہ تعالیٰ معاف فرمادیں گے۔ عموماً چونکہ حدود کے ضمن میں توبہ ہوتی ہے' خصوصاً صحابۂ کرام کے حالات سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے' اس لیے بعض احادیث میں حدود کا مطلقاً کفارہ ہونا بیان ہوا ہے۔

حضرت ماعز[2] رضی اللہ عنہ اور امرأۃ غامدیہ کا بار بار اپنے جرم کا اقرار اور حد رجم کو بخوشی قبول کرنا' ان کی سچی توبہ کو ظاہر کرتا ہے حضرت شاہ

---

[1] حقیقت میں توبہ تین چیزوں کا مجموعہ ہے۔ اندم (کہ اپنے گناہوں پر نادم ہوجائے اور سمجھے کہ مجھ سے خدا کی نافرمانی ہوئی) اقلاع (کہ اس گناہ کو ترک کر دے) عزم علی الترک (کہ آئندہ اس معصیت کو ترک کرنے کا عزم اور پختہ ارادہ کرے)

[2] حضرت ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ نے خود حاضر ہو کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مجھ سے زنا کا جرم ہو گیا ہے آپ نے بار بار ان کو ٹالا کوئی شک وشبہ کی بات نہ دے' مگر وہ برابر اقرار کرتے رہے' تب ان کو رجم کیا گیا' اس کے بعد کچھ لوگوں نے کہا کہ ماعز برباد ہوئے' کتنی بڑی معصیت کی ہے؟ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

صاحبؒ یہ بھی فرماتے تھے کہ یہاں نظری اختلاف ہے مسئلہ کا اختلاف نہیں ہے اور نظر حنفیہ کی اصوب ہے۔

حدیث عبادہ مذکور کے مقابلہ میں دوسری حدیث حضرت ابو ہریرہؓ کی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میں نہیں جانتا کہ حدود کفارہ ہیں یا نہیں"، اس کو حاکم نے مستدرک میں بہ سند صحیح روایت کیا' ان دونوں حدیثوں پر محدثانہ بحث حافظ عینی وحافظ ابن حجر نے کی ہے' جو

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) دوسروں نے کہا نہیں' ان کی توبہ سے بڑی کس کی توبہ ہو سکتی ہے؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کے مجمع میں تشریف لائے اور فرمایا کہ ماعز کے لیے خدا سے مغفرت طلب کرو' انہوں نے دعاء مغفرت کی' پھر فرمایا کہ ماعز نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر ایک امت پر تقسیم کی جائے تو اس کو بھی کافی ہو سکتی ہے (مسلم باب حد الزنا)

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صرف رجم کفارہ نہیں' چنانچہ آپ نے دعا مغفرت کرائی' حالانکہ خود اپنے اقرار سے رجم کئے گئے تھے جس سے ندامت وغیرہ توبہ کے ارکان کی موجودگی ظاہر ہوتی ہے' دوسرے یہ کہ اکثر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی نماز جنازہ نہیں پڑھی' جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ماعز کی توبہ میں کوئی کمی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے محسوس فرمائی ہوگی اور شاید اسی لیے دعائے مغفرت کرائی' بخلاف غامدیہ صحابیہ کے وہاں اکثر روایات سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ان کی نماز جنازہ پڑھنا ثابت ہوتا ہے اور ان کے واقعہ میں حضور کا ان کے لیے دعاء مغفرت کرانا بھی ثابت نہیں' دونوں کے واقعات میں وجہ فرق یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ صحابیہ نسبتاً ماعز سے زیادہ مستقل مزاج اور خدا کی حد پر صبر کرنے والی تھیں' جس کی وجوہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) حضرت ماعز نے اقرار جرم کیا' حضور نے سوچنے سمجھنے کا موقعہ دیا' حضرت ماعز کچھ دور جا کر واپس ہوئے پھر اقرار کیا' اور اس طرح چار بار اقرار کیا' تھوڑے وقت میں خیال بدلنے کا احتمال کم ہوتا ہے' بخلاف صحابیہ مذکورہ کے کہ انہوں نے اقرار کیا' حضور نے واپس کر دیا' انہوں نے پھر حاضر ہو کر اقرار کیا اور یہ بھی عرض کیا کہ حضور! آپ شاید مجھے ماعز کی طرح لوٹا رہے ہیں خدا کی قسم مجھے تو حمل بھی زنا سے ہی ہے (یعنی مجھ پر رجم کی سزا خود ہی جاری ہونی چاہیے۔ ٹلنی نہیں چاہیے) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' اچھا ایسا ہے تو ولادت کے بعد حد لگے گی۔ صحابیہ چلی گئیں' ولادت کے بعد خبر بھیجی یا بچہ کو لے کر خود حاضر ہوئیں (دونوں روایت ہیں) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بچہ کو دودھ پلاؤ پھر آنا' اس کے بعد وہ بچے کو دودھ پلاتی رہیں حتیٰ کہ وہ روٹی کا ٹکڑا منہ میں لینے لگا (یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں دستور یہی تھا کہ دودھ پلانے کے بعد جب تک بچہ روٹی کا ٹکڑا منہ میں نہ لینے لگے' وہ رضاعت ہی میں رہتا ہے' جس سے مدت رضاعت امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ کے مذہب کے موافق دو سال سے زیادہ اڑھائی سال کے اندر ثابت ہوتی ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ (چوتھی بار) صحابیہ مذکورہ بچہ کو اسی شان سے لے کر حاضر ہوئیں کہ اس کے ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا تھا' انہوں نے عرض کیا کہ اب تو ساری شرطیں پوری ہو گئیں' یا رسول اللہ! اب تو مجھ پر خدا کی حد جاری کر دیجئے! اس پر آپ نے اس کا بچہ کسی صحابی کے سپرد کر دیا اور رجم کا حکم دیا۔

(۲) حدیث میں آتا ہے کہ حضرت ماعز کو رجم کیا گیا تو وہ بھاگنے لگے تھے (یہ محض ایک فطری و بشری کمزوری تھی معاذ اللہ رجم سے بھاگنا نہیں تھا) مگر صحابیہ مذکورہ نے اس بشری کمزوری کا بھی اظہار نہیں کیا تھا' بلکہ یہ بھی بعض روایات میں ملتا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ میں ماعز کی طرح نہیں بھاگوں گی' اللہ اکبر! حضرات صحابہ وصحابیات کے ایمان کتنے قوی تھے کہ پہاڑ ہل جائیں مگر ان کے ایمان اپنی جگہ سے نہ ہل سکتے تھے۔

(۳) حضرت ماعز پر اسلام میں سب سے پہلی بار رجم ہوا اور ان کے رجم کے ہولناک حالات تمام صحابہ وصحابیات کو معلوم ہو چکے تھے' پھر بھی صحابیہ مذکورہ نے اس قدر استقلال و پامردی کا ثبوت دیا' اور کہیں ذرا سی بھی جھجک خدا کی حد کے قائم کرانے میں نہ ہوئی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی توبہ انابت الی اللہ بھی نہایت کامل مکمل تھی' اس لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی نماز جنازہ میں شرکت فرمائی اور فرمایا کہ اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ ایسی توبہ اگر "صاحب مکس" بھی کرتا تو اس کے گناہ بخش دیے جاتے "صاحب مکس" وہ ہے جو لوگوں سے بطور ظلم و جبر کے ٹیکس وصول کرتا ہے' جیسے ایام جاہلیت میں بازاروں میں چیزیں فروخت کرنے والوں سے ٹیکس لیا جاتا تھا یا صدقہ وصول کرنے والے رقوم صدقات کے علاوہ رقوم وصول کرتے تھے (گویا دوسروں کا مال بغیر حق لینا اور وہ بھی جبر و ظلم سے یہ مکس ہے۔

امام نوویؒ شارح مسلم نے لکھا ہے کہ اس سے معلوم ہوا مکس تمام معاصی اور برباد کر دینے والے گناہوں سے زیادہ قبیح ہے۔ کیونکہ لوگوں کے بہ کثرت مطالبات و حقوق اس سے متعلق ہوتے ہیں' اور وہ برابر یہی کام کرتا رہتا ہے (مثلاً روزانہ' ماہانہ یا سال بہ سال)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ تھی کہ جب کوئی جنازہ آتا دریافت فرماتے کہ اس مرنے والے پر کوئی دین وقرض تو نہیں ہے؟ اگر نہ ہوتا تو خود نماز میت پڑھاتے' ورنہ فرمادیتے کہ تم لوگ نماز پڑھ لو یہ معاملہ قرض والے کے ساتھ تھا' حالانکہ اکثر قرضہ ضرورت میں لیا جاتا ہے' اور کوشش بھی ادائیگی کی ہوتی ہے پھر صحابہؓ کی ورع واحتیاط کا تو کہنا ہی کیا؟! مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابیہؓ مذکورہ کی توبہ کو اس کے اعلیٰ درجہ کے اخلاص وخشیۃ خداوندی کے سبب کہ اس قدر گھبرا دینے والی موت بشکل رجم سے بھی نہ ڈری' وہ مرتبہ دیا کہ بڑے بڑے گناہ والے کو بھی ایسی توبہ سے مستحق مغفرت قرار دیا اور شاید ایسے شخص کی ایسی توبہ کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کے جنازہ کی نماز بھی پڑھا دیتے جس طرح صحابیہ مذکورہ کی پڑھائی وجہ یہ کہ عام اصول تو یہی ہے کہ حقوق العباد بغیر بندوں سے معاف کرائے معاف نہیں ہو سکتے' مگر اللہ تعالیٰ جس بندے کی گلو خلاصی کرانا چاہیں' اس کے لیے اپنے خصوصی فضل وانعام کی شان سے ان اصحاب حقوق کو راضی کر کے معاف کرا سکتے ہیں۔ اللھم اغفرلنا وارحمنا و اکرم علینا بفضلک الخاص و جودک العام التام انک علی کل شیء قدیر و بالا جابة جدیر۔

بہت اہم ہے' اس کو بھی ہم کتاب الحدود میں ذکر کریں گے (انشاء اللہ تعالیٰ) اس کے علاوہ یہ کہ ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ ان دونوں میں تطبیق کی بھی صورت نکالتے تھے' پوری بحث سے معلوم ہوگا کہ امام صاحب اور ائمہ حنفیہ کا مرتبہ بمقابلہ امام شافعی وامام بخاری وغیرہ نہ صرف فقہ و علم قیاس میں بہت بڑھا ہوا تھا' بلکہ حدیث دانی و علم معانی حدیث میں بھی وہ نہایت اونچے مقام پر تھے' مگر چونکہ اس امر کا پروپیگنڈہ نہیں کیا گیا' بلکہ مخالفوں نے اس کے خلاف پروپیگنڈہ کیا اس لیے عام ذہنوں میں غلط تصور قائم ہوتا رہا' انوار الباری میں ہم انشاء اللہ تعالیٰ پوری دیانت کے ساتھ صحیح پوزیشن واضح کریں گے' اور جہاں کوئی کمزوری اپنے یہاں ہوگی' اس کو بھی بے تامل ظاہر کریں گے' یہی طریقہ ہمارے اکابر اور حضرت شاہ صاحبؒ کا تھا' کتاب کا اکثر حصہ سامنے آنے پر فیصلہ بخوبی ہو سکے گا کہ ہمارا مقصد خدمت علوم نبوت ہے کسی مسلک کی تائید اس لیے نہیں کرنی ہے کہ اس سے ہم وابستہ ہیں' نہ کسی مسلک کی تردید اس لیے ہوگی کہ ہم اس کے پیرو نہیں۔ واللہ الموفق۔

بیعت اور ان کی اقسام

چونکہ اس حدیث میں بیعت کا ذکر ہے' اس لیے اس کی تعریف اور اقسام ذکر کی جاتی ہیں بیعت کے شرعی معنی کسی متبع شریعت الٰہیہ کے ہاتھ پر کسی امر دینی کو...... سرانجام دینے کا عہد و میثاق کرنے کے ہیں' چونکہ بیعت کا مقصد خدا کے کسی حکم کی بجا آوری کا عہد و میثاق رسول یا نائب رسول کی وساطت سے پورا ہوتا ہے' اس لئے حق تعالیٰ نے اس طریقہ کو نہایت پسند فرمایا اور یہاں تک رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد فرمایا کہ جو لوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں وہ بلاشک وشبہ خدا سے بیعت کر رہے ہیں۔ ان کے ہاتھوں پر خدا کا ہاتھ ہے پھر جو کوئی (اس بیعت کو) توڑے گا تو اس کے توڑنے سے اپنا ہی نقصان کرے گا' اور جو اپنے عہد کو پورا کرے گا اس کو اللہ تعالیٰ اجر عظیم عطا فرمائیں گے' حضرت علامہ عثمانیؒ نے اس آیت کے فوائد میں تحریر فرمایا لوگ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر بیعت کرتے تھے' اس کو فرمایا کہ نبی کے ہاتھ پر بیعت کرنا گویا خدا سے بیعت کرنا ہے۔ کیونکہ حقیقت میں نبی خدا ہی کی طرف سے بیعت لیتا ہے اور اسی کے احکام کی تعمیل و تاکید بیعت کے ذریعے کراتا ہے' جب بیعت نبوی کی حقیقت یہ ہوئی تو یقیناً خدا تعالیٰ کا دست شفقت وحمایت ان کے ہاتھوں کے اوپر ہوگا۔ (تنبیہ) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ سے کبھی اسلام پر' کبھی جہاد پر' کبھی کسی دوسرے امر خیر پر بیعت لیتے تھے' صحیح مسلم میں "وعلی الخیر" لفظ آیا ہے' مشائخ طریقت کی بیعت' اگر بطریق مشروع ہو تو اسی لفظ کے تحت میں مندرج ہوگی' حدیبیہ میں اس امر پر بیعت لی گئی تھی کہ مرتے دم تک میدان جہاد سے نہیں بھاگیں گے۔

غرض بہ کثرت احادیث سے ثابت ہے کہ لوگ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کرتے تھے' کبھی ہجرت پر' کبھی جہاد پر' کبھی ارکان اسلام کو قائم رکھنے پر' کبھی میدان جہاد میں ڈٹے رہنے پر' کبھی ترک خواہشات ومنکرات پر (جیسا کہ حدیث میں ہے کبھی تمسک بالسنۃ' اجتناب عن البدعۃ اور حرص علی الطاعات پر (جیسا کہ انصاری عورتوں سے بیعت لی تھی) ایک دفعہ فقراء مہاجرین سے اس امر پر بیعت لی کہ کبھی کسی سے کوئی سوال نہیں کریں گے جس کی وجہ سے انہوں نے اتنی سختی سے اپنے اس عہد بیعت کو پورا کیا کہ اگر گھوڑے پر سوار جا رہے ہیں اور کوڑا ہاتھ سے گر گیا تو راہ چلتے سے کوڑا اٹھا کر دینے کو نہ کہتے تھے' بلکہ خود اتر کر اٹھاتے تھے۔ (ابن ماجہ)

صحیح بخاری میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جریر صحابی سے ہر مسلمان کی خیر خواہی کرنے پر بیعت لی اور کچھ انصار صحابہ سے اس امر پر بیعت لی کہ خدا لگتی بات کہنے میں کسی کی ملامت کی پرواہ نہ کریں گے اور ہر موقعہ پر حق بات ہی کہیں گے جس کی وجہ سے ان میں سے ایک آدمی بڑے سے بڑے امیر اور بادشاہ تک کو بھی بری بات پر ٹوک دیتا تھا۔ اسی طرح دوسرے امور خیر پر بھی بیعت لینا ثابت ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ بیعت کا طریقہ مسنون ہے اور مشائخ وصوفیہ کا طریقہ بھی اس میں داخل ہے کیونکہ وہ تمام احکام اسلام کی پابندی کے عہد

بیعت پر مشتمل ہے اور اسی کے ساتھ ذکر و مراقبہ وغیرہ کے ذریعہ بھی انابت الی اللہ و تقرب الی اللہ کے وسائل اختیار کراتے ہیں، جو وسائل معین انابت و تقرب ہوں ان کو بدعت نہیں کہا جا سکتا، البتہ بیعت لینے والے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ صحیح معنی میں نائب رسول ہو ورنہ جادۂ شریعت سے انحراف کا خطرہ رہے گا۔ جس سے بجائے نفع کے نقصان کا اندیشہ ہے۔ علماء کرام نے بیعت لینے والے کے چند اوصاف لکھے ہیں ان پر توجہ ضروری ہے۔

(۱) عالم کتاب و سنت ہو، تاکہ بیعت کے اہم مقاصد حاصل ہوں مثلاً امر معروف، نہی منکر، سکینت باطنی و اطمینان قلبی حاصل کرانے کے شرعی طریقے بتلانا، ازالہ رذائل و اکتساب فضائل قرآن و حدیث کے خلاف طریقوں سے نہ کرانا وغیرہ۔

(۲) عدالت، تقویٰ، صدق و ضبط وغیرہ اوصاف سے متصف ہو لہٰذا کبائر معاصی سے قطعاً مجتنب اور صغائر پر مصر نہ ہو۔

(۳) دنیا سے بے رغبت اور آخرت کی طرف پوری طرح راغب ہو، طاعات مؤکدہ اور اذکار ماثورہ مسنونہ کا پابند ہو۔

(۴) علماء کی خدمت میں کافی زمانہ گزار کر ان سے علم ظاہر، نور باطن، سکینت و تعلق مع اللہ کی کیفیات حاصل کی ہوں وغیرہ۔

شیخ طریقت سے ظہور کرامات و خوارق عادات ضروری نہیں، کیونکہ وہ مجاہدات و ریاضات کا ثمرہ ہیں، شرط کمال نہیں ہیں، اسی طرح شیخ کے لئے ترک اکتساب بھی ضروری نہیں بلکہ خلاف شریعت ہے (مغلوب الحال بزرگوں کے حالات سے اس بارے میں سند لینا درست نہیں) نیز قلیل پر قناعت اور مشتبہ اموال سے اجتناب مشائخ کے لئے ضروری ہے۔

معلوم ہوا کہ جو مشائخ حب جاہ و مال میں مبتلا ہیں، وہ ہرگز مشیخت کے لائق نہیں، دوسرے یہ کہ شیخ ایسے شخص کو بنانا چاہئے۔ جو علم و عمل کے لحاظ سے بھی زیادہ سے زیادہ مکمل ہو، ہر کہہ و مہ کے ہاتھ میں ہاتھ دے دینا مناسب ہے نہ مفید و نافع، اس لئے محض رسمی بیعت کی کوئی شرعی اہمیت نہیں ہے۔

نیز معلوم ہوا کہ بیعت لینا یا کسی کے ہاتھ پر بیعت کرنا دونوں نہایت اہم ذمہ داریوں کو مقتضی ہیں، اور کسی شیخ کا اپنے کسی مرید کو خلیفہ یا قائم مقام بنانا نہایت درجہ ذمہ داری کا منصب ہے اس میں تساہل برتنا اس منصب رفیع کو بے وقعت بنانا ہے۔ جس سے بے شمار دینی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔

اذا وسد الامر الی غیر اہلہ فانتظر الساعۃ کیونکہ ایسی باتوں سے دین میں کمزوری آ جاتی ہے جو قرب قیامت کے ساتھ بڑھتی جائیگی۔

اس سلسلہ میں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ حضرات مشائخ طریقت نے اپنے اپنے سلسلہائے طریقت کی حفاظت بھی سلسلہائے نسب کی طرح کی ہے، اس لئے ان کی رخنہ اندازیوں سے اجتناب ضروری ہے مثلاً۔

(۱) جس شیخ اور پیر مرشد سے کسی کو اجازت بیعت یا خلافت ملی ہو اسی سے اپنا سلسلہ بیعت جاری کرنا چاہئے، قطع سلسلہ مناسب نہیں (۲) اگر کسی شیخ نے خود خلافت نہیں دی ہے تو اس کی موجودگی میں یا اس کے بعد دوسرے خلفاء شیخ مذکور کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی کو اس شیخ کی طرف سے خلافت دیدیں البتہ اپنی طرف سے دے سکتے ہیں، اور اس مجاز کو بھی شیخ مذکور کی بجائے ان مجیزین کے واسطے سے سلسلہ کو متصل کرنا چاہئے۔

(۳) کسی شیخ کی موجودگی میں یا اس کے بعد کسی ایک یا چند خلفاء شیخ مذکور کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی مجاز شیخ مذکور کی خلافت سلب کر دیں۔ ہاں! اگر مجاز مذکور میں خود ہی کسی وجہ سے اہلیت بیعت باقی نہ رہے گی تو وہ عند اللہ اس خلافت سے محروم ہو جائے گا۔

طرق سلوک اور علوم طریقت کی پوری معرفت کے لئے حضرت امام ربانی مجدد صاحب الف ثانی قدس سرہ کے مکتوبات شریفہ وغیرہ، حضرت شاہ ولی اللہ کے رسائل تصوف، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی قصد السبیل اور التکشف عن مہمات التصوف وغیرہ دیکھی جائیں۔

باب:۔ من الدین الفرار من الفتن (فتنوں سے دور بھاگنا بھی دین میں داخل ہے)

۱۸۔ حدثنا عبداللہ بن مسلمۃ عن مالک عن عبدالرحمن بن عبداللہ بن ابی صعصعۃ عن ابیہ عن ابی سعید الخدری انہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: یوشک ان یکون خیر مال المسلم غنم یتبع بہا شعف الجبال و مواقع القطر یفر بدینہ من الفتن۔

ترجمہ:۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔ وہ زمانہ قریب ہے کہ مسلمان کا سب سے بہتر مال وہ بکریاں ہوں گی' جنہیں لیکر وہ پہاڑوں کی چوٹیوں یا ان کی وادیوں میں گزر اوقات کرے گا' تا کہ اپنے دین کو اس زمانہ کے فتنوں سے محفوظ رکھ سکے۔

تشریح:۔ دین کے عمومی منافع وفوائد کے لحاظ سے اجتماعی زندگی اسلام میں زیادہ پسندیدہ ہے اور اسوہ انبیاء علیہم السلام بھی یہی ہے کہ معاشرہ میں رہ کر اپنی اور معاشرہ کی اصلاح پر توجہ دی جائے' اسی لئے اسلام میں رہبانیت کو پسند نہیں کیا گیا کہ سب سے الگ تھلگ ہو کر صرف اپنی دینی زندگی کو سنوارا جائے اور دوسروں کے احوال سے صرف نظر کر لی جائے مگر قرب قیامت کے ساتھ طرح طرح کے فتنے بھی زیادہ ہوتے جائیں گے حتیٰ کہ وہ وقت بھی آ جائے گا کہ بڑی بستیوں اور شہروں میں زندگی گزارنے والوں کو اپنے دین پر قائم رہنا دشوار ہو جائے گا' بجائے اس کے کہ معاشرے میں رہ کر اپنی اور دوسروں کی اصلاح حال ہو' ان میں رہ کر اپنا دین وایمان بھی خطرہ میں پڑ جائے تو ایسے مجبور کن حالات میں شارع اسلام کی طرف سے اجازت ہے کہ بستیوں اور معاشروں کو چھوڑ کر پہاڑوں اور وادیوں میں سر چھپا کر' معمولی گزران کی صورتیں اختیار کر کے اپنے دین وایمان کی حفاظت کریں۔

مقصد یہ ہے کہ دین وایمان کی حفاظت دوسری انسانی ضرورتوں پر مقدم ہے' ایک حدیث ترمذی وابوداؤد میں ہے کہ ایک زمانہ ایسا آ جائے گا کہ اس میں صبر واستقلال سے زندگی گزارنا آگ کے انگاروں کو ہاتھ میں پکڑنے کی طرح دشوار ہوگا اسی لئے اس وقت جو دین کے مقتضیات پر عمل کرے گا اس کو تمہارے پچاس آدمیوں کے عمل کے برابر ثواب ملے گا۔ (یعنی صحابہ کرام کے) دوسری حدیث ترمذی وابوداؤد میں ہے کہ قرب قیامت میں بہ کثرت فتنے اندھیری رات کے تاریک حصوں کی طرح چھا جائیں گے' ان میں ایک شخص صبح کو مومن ہوگا اور شام تک ایمان باقی نہ رہ سکے گا' یا شام کے وقت مومن ہوگا تو ایمان کے ساتھ صبح پکڑنی مشکل ہوگی۔ ان فتنوں کے وقت ایک جگہ پر بیٹھنے والا ادھر ادھر جانے والے سے بہتر ہوگا اور آہستہ چلنے والا تیز رفتار سے بہتر ہوگا۔ صحابہ نے عرض کیا کہ اس وقت کیا کرنا چاہئے؟ آپ نے فرمایا کہ اپنے اپنے گھروں میں جمے بیٹھے رہنا اسی طرح اور بہت سی احادیث فتن واشراط ساعت کے بارے میں ماثور ہیں' جن سے معلوم ہوتا ہے کہ تدریجی طور سے اور فتنوں کی نوعیت کے فرق سے دین وایمان کی حفاظت کے طریقے بھی مختلف ہوں گے' ایک وقت میں شہروں میں رہتے ہوئے ہی گھروں میں جم کر بیٹھ جانا' اور باہر کی مسموم ہوا سے دین کو محفوظ کر لینا کافی ہوگا' کبھی بڑے شہروں کو چھوڑ کر چھوٹے قصبات ودیہات کی زندگی میں سکون ملے گا اور بالکل آخر میں وہ نوبت بھی آ جائے گی' جس کا ذکر حدیث الباب میں ہے' حدیث میں "دین" کا لفظ ہے' جس کا اطلاق ہم بتلا چکے ہیں کہ مجموعہ ایمان واسلام پر ہوتا ہے' لہٰذا اس حدیث سے اعمال کا جزو ایمان ہونے پر استدلال نہیں ہو سکتا۔ البتہ ایمان کے ساتھ اعمال کی اہمیت پر استدلال درست ہے' جن کے منکر مرجئہ اہل بدعت ہیں۔ واللہ اعلم۔

باب:۔ قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم انا اعلمکم باللہ وان المعرفۃ فعل القلب لقول اللہ تعالیٰ:۔ ولکن یؤاخذ کم بما کسبت قلوبکم"

(رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی تفصیل کہ میں تم سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کو جانتا ہوں' اور یہ کہ معرفت دل کا فعل ہے' کیونکہ خدا کا ارشاد ہے "لیکن اللہ تعالیٰ ان امور کی بابت تم سے مواخذہ کرے گا' جو تمہارے قلوب سے صادر ہوئے ہیں"۔)

(۱۹) حدثنا محمد بن سلام البیکندی قال اخبر نا عبدۃ عن ھشام عن عائشۃ قالت کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذاامر ھم امرھم من الا عمال بما یطیقون قالو ا انا لسنا کھیئتک یا رسول اللہ ان اللہ قد غفر لک ما تقدم من ذنبک و ما تا خر فیغضب حتی یعرف الغضب فی وجھہ ثم یقول ان اتقاکم و اعلمکم باللہ انا.

ترجمہ:۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب صحابہؓ کو کوئی حکم فرماتے تو اس امر کی رعایت فرماتے تھے کہ وہ عمل کی طاقت و استطاعت سے باہر نہ ہو' صحابہؓ عرض کرتے یا رسول اللہ! ہم آپ جیسے نہیں ہیں' آپ کی تو پہلی بعد کی سب لغزشیں اللہ تعالیٰ نے معاف فرمادی ہیں' (یعنی ہمیں تو زیادہ سخت اعمال کا حکم ملنا چاہئے) اس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ مبارک پر غصہ و ملال کے آثار ظاہر ہوتے تھے' اور فرماتے تھے کہ میں تم سے زیادہ خدا کو جاننے والا اور اس سے ڈرنے والا ہوں' (اس لحاظ سے مجھے تم سب سے زیادہ اعمال کی ضرورت ہے۔

تشریح:۔ صحابہ کرام کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ اور سخت سے سخت اعمال انجام دے کر خدا کی خوشنودی حاصل کریں' حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نظر کرتے' تو دیکھتے کہ بظاہر آپ کے سارے اوقات عبادت میں مشغول نہیں' دوسری دنیوی حاجات میں بھی وقت لگ جاتا ہے' تو وہ اس سے یہ سمجھتے تھے کہ آپ کو زیادہ اعمال کی ضرورت اس لئے نہیں کہ حق تعالیٰ نے آپ کی سب اگلی پچھلی لغزشیں معاف فرمادی ہیں' پھر جب آپ صحابہ کو ان کی وسعت و استطاعت کا خیال کر کے زیادہ دشوار احکام نہ دیتے' تو اور بھی خیال ہوتا کہ ہمارا حصہ دین میں بہت کم ہے' جو شاید نجات اخروی کے لیے بھی کافی نہ ہو۔

چنانچہ دوسری ایک حدیث میں زیادہ تفصیل آتی ہے کہ صحابہ کرام نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سوال کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رات دن کے اعمال کیا ہیں؟ آپ نے بتلائے تو صحابہ نے ان کو کم سمجھا اور سوچا کہ آپ کو اعمال کی ضرورت ہی کیا ہے' آپ مغفور و معصوم ہیں' لیکن ہم تو ایسے نہیں ہیں' اس لیے ہمیں زیادہ اور سخت اعمال کی ضرورت ہے' پھر کسی نے کہا میں ہمیشہ جہاد کروں گا' کسی نے کہا کہ میں ہمیشہ کے لیے بیوی سے الگ رہوں گا' کسی نے کہا میں ہمیشہ روزے رکھوں گا' حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ساری بات معلوم ہوئی تو یہی فرمایا کہ میں تو تم سب سے زیادہ اعلم و اتقی ہوں' مقصد یہ ہے کہ اگر عبادت کی اتنی زیادتی کہ سارے دنیا کے کام معطل ہو جائیں محمود ہوتی اور خدا اس کو پسند فرماتا تو مجھے تو اپنا کوئی وقت بھی عبادت سے خالی نہ کرنا چاہئے تھا' کیونکہ تمہیں اگر آخرت کی فکر ہے تو مجھے تم سب سے زیادہ ہے' کیونکہ میرا علم' خدا کی معرفت اور تقویٰ تم سب سے زیادہ ہے' پھر بھی تم دیکھتے ہو کہ میں عبادت کے علاوہ' کھانا' پینا' سونا' اور گھر و باہر کے دوسرے کام بھی کرتا ہوں'

یہ تو ایک جواب ہوا' دوسرے یہ کہ اور احادیث سے ثابت ہے کہ خدا کو سب سے زیادہ وہ عمل پسند ہے جو ہمیشہ کیا جائے خواہ وہ کم ہو تیسرے یہ کہ فرائض و طاعات کی ادائیگی کے بعد جتنا وقت جائز طریقہ پر دوسرے کاموں میں صرف ہوتا ہے وہ سب بھی عبادات ہی کے حکم میں اور موجب اجر و ثواب ہے' صرف اتنی ضرورت ہے کہ ہم اپنی نیت صحیح کرلیں وہ اس طرح کہ یہ سوچ کر وہ سب کام کریں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی طاعات کے ساتھ ان سب دنیوی کاموں کی بھی اجازت دی ہے اور ہم جتنے کام کر رہے ہیں' وہ سب خدا اور رسول کی اطاعت ہی کا ایک جزو ہیں' مثلاً کسب معاش کے تمام جائز ذرائع اختیار کرنا' دولت زیادہ سے زیادہ کمانا بشرطیکہ اس دولت کے شرعی حقوق ادا ہوں اور طاعات و عبادات پر اس کا کوئی برا اثر نہ پڑے' دنیوی علوم و صنائع کی تحصیل بشرطیکہ ان سے عقائد حقہ و اعمال شرعیہ پر اثر نہ پڑے' گھر باہر کے کام کاج میں وقت صرف کرنا' غرض تمام امور مباح میں وقت صرف کرنا اگر یہ سمجھ کر ہو کہ شریعت نے بشرط عدم ضرر دینی ان کی اجازت دی ہے اور جن کاموں سے کوئی دین یا دنیا کا فائدہ دوسروں کو پہنچ سکتا ہو وہ تو مزید اجر و ثواب کا باعث ہیں' اسی طرح اپنے کنبہ قبیلہ' اعزہ اقرباء اور عام مسلمانوں بلکہ عام انسانوں کی مالی و غیر مالی سرپرستی و امداد تو دین اسلام ہی کا ایک جزو ہے اور علوم نبوت کی تحصیل و اشتغال بالعلم' تبلیغ دین' امر معروف نہی منکر' جہاد فی سبیل اللہ' وغیرہ تو دین کے بڑے ستون ہیں' اس طرح اگر سوچ سمجھ کر اور نیت کی تصحیح کے ساتھ ہم پوری زندگی گزاریں تو اس کا ہر لمحہ عبادت ہے' لہٰذا اس کو کم سمجھنا مناسب نہیں۔ وفقنا اللہ ایانا و المسلمین جمیعاً لما یحب و یرضی۔

بحث و نظر: (۱) امام بخاریؒ نے یہاں ارشاد نبوی انا اعلمکم باللہ پر باب باندھا جو بظاہر کتاب العلم کے مناسب تھا' یہاں کتاب

الایمان میں اس کو کیوں لائے؟ ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ وجہ بیان فرمائی کہ علم و معرفت و یقین کا اطلاق احوال پر بھی ہوتا ہے اور علوم نبوت جس وقت انسان کے تمام جوارح پر چھا جاتے ہیں تو وہی بعینہ ایمان کی شان ہے جس کو حدیث میں بھی فرمایا گیا ہے **من مات و هو یعلم ان لا اله الا الله** الخ یہاں **و هو یومن باللہ** نہیں فرمایا' حالانکہ مراد وہی ہے' اسی طرح آیت **انما یخشی الله من عباده العلماء** میں بھی علما سے مراد وہ حضرات ہیں جن کے قلوب میں علوم نبوت راسخ ہو جاتے ہیں۔ اور ان علوم کی بشاشت سے ایک قسم کا نور' حلاوت وانبساط ان کو حاصل ہو جاتا ہے اور وہی ایمان کا نور ہے جس کی زیادتی ایمان کی زیادتی اور کمی ایمان کی کمی ہے۔

دوسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ امام بخاری کا استدلال بطور "الحاق نظیر بالنظیر" یعنی جس طرح علم میں مراتب ہیں اسی طرح ایمان میں بھی ہیں کیونکہ علم سبب ایمان ہے۔ پس جب کہ سبب میں تشکیک ثابت ہے' مسبب یعنی ایمان میں بھی ثابت ہوئی۔

دوسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اس سے امام بخاری کا مقصد معتزلہ کی تردید ہے' جو کہتے ہیں کہ خدا کی معرفت اول واجبات ہے اس کے بعد ایمان ہے' امام بخاری نے بتلایا کہ معرفت فعل قلب ہے لہٰذا وہی ایمان ہے اور وہی واجب اول بھی ہے پس معرفت کوئی دوسری چیز علاوہ ایمان کے نہیں ہے' جس کو واجب اول اور اس کے بعد ایمان کو دوسرا واجب قرار دیں۔

(۲) عنوان باب کا دوسرا جزو یہ ہے کہ معرفت فعل قلب ہے' حضرت شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہاں معرفت سے اضطراری معرفت تو ہو نہیں سکتی جیسی **یعرفونه کما یعرفون ابناء هم** میں ہے اول تو اس پر لغوی اعتبار سے فعل کا اطلاق ہو بھی نہیں سکتا کیونکہ فعل کا اطلاق صرف اختیاری امر پر ہوتا ہے' دوسرے اس کا ایمان سے تعلق بھی نہیں لہٰذا معرفت سے مراد وہی اختیاری معرفت ہوگی جو دل میں جاگزیں اور جوارح پر مسلط ہو جاتی ہے' وہ کسبی ہے اور یقیناً فعل قلب بھی ہے اور وہ عین ایمان بھی ہے' امام بخاری کی یہ مراد اور بھی واضح ہو جاتی ہے اگر وہ معرفت کی جگہ یہاں ایمان کو فعل قلب کہتے' مگر وہ عبارتی تفنن کے عادی ہیں اس لیے اس طرح ادا کیا۔

امام اعظمؒ سے تعصب

حضرت شاہ صاحبؒ نے اس موقعہ پر فرمایا کہ حضرت امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ سے بھی احیاء العلوم وغیرہ میں نقل ہوا ہے کہ ایمان معرفت ہے' اور امام صاحب کی مراد یہی معرفت ہے جس کی ہم نے اوپر شرح کی۔ اور امام بخاری کی مراد بتلائی اور امام احمد سے بھی یہی تعبیر منقول ہے' مگر عجیب بات ہے کہ جب یہی بات امام احمد سے نقل ہوئی تو کسی نے ان پر اعتراض نہیں کیا' اور امام صاحب سے نقل ہوئی تو انکار و اعتراض کا رخ اختیار کیا گیا بقول عربی شاعر۔

اصم عن الشیء الذی لا اریده　　　واسمع خلق الله حین ارید

جس بات کو میں سننا نہیں چاہتا اس کو سننے سے سب سے زیادہ بہرا ہو جاتا ہوں۔ اور جس کو سننا چاہتا ہوں اس کو ساری مخلوق سے زیادہ سننے والا ہو جاتا ہوں۔

(۳) امام بخاریؒ نے یہاں معرفت کے فعل قلب ہونے پر آیت **ولکن یؤاخذکم بما کسبت قلوبکم** سے استشہاد کیا' اس پر کسی نے اعتراض کیا کہ آیت مذکورہ تو یمین و حلف کے بارے میں ہے نہ کہ ایمان کے بارے میں' لیکن ایسا اعتراض امام بخاریؒ کے استدلال طریقوں سے ناواقفیت کے باعث ہوسکتا ہے' امام نے محض اس امر سے استدلال کر لیا کہ جس طرح کسب فعل قلب ہے' معرفت بھی قلب کا فعل اور اس کا مکسوب ہے۔

(۴) "**امر هم بما یطیقون**" پر حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہی طریقہ تمام انبیاء علیہم السلام کا رہا ہے کہ اپنی جانوں پر تو سختی جھیلتے ہیں' اعمال شاقہ اختیار کرتے ہیں اور دوسروں کے لئے سہولتوں آسانیوں کے راستے نکالتے ہیں۔ **عزیز علیه ماعنتم حریص**

علیکم بالمومنین رؤف رحیم ارشاد باری ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر تمہارا کسی مشقت میں پڑنا نہایت ہی شاق ہے، وہ تمہاری فلاح و بہبود پر نہایت حریص ہیں اور مومنوں کے لئے تو بہت ہی شفیق اور رحمت مجسم ہیں۔

(۵) ''یارسول اللہ''! پر حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے خطاب کے موقعہ پر صلوٰۃ وسلام کے الفاظ ادا کرنے کا ثبوت نہیں ملا، اس لئے...... اس کی قرأت میں بھی ان کا اتباع مناسب ہے۔

(۶) ''**وقد غفرلک اللہ ماتقدم**'' یہ اشارہ ہے آیت قرآنی ''**لیغفرلک اللہ ماتقدم من ذنبک وماتاخر**'' کی طرف جس میں فرمایا گیا کہ ہم نے آپ کو فتح مبین دی تا کہ آپ کی سب اگلی پچھلی لغزشیں معاف کر دیں، کیونکہ فتح سے قبل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلاء کلمتہ اللہ کے لئے بڑے بڑے مصائب و آلام برداشت کئے اور بہت سے معرکہ ہائے جہاد میں عظیم خطرات ومہالک سے دوچار ہوئے تھے، اس کے بعد یہ بحث ہوئی کہ لیغفر میں لام کیسا ہے۔ اشاعرہ کا مذہب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے افعال معلل بالاغراض نہیں ہوتے، لہٰذا یہ لام عاقبت ہے صاحب روح المعانی نے علامہ ابن قیم سے نقل کیا کہ ''سلف ان کو معلل بالاغراض مانتے تھے اور حق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے افعال مصالح وحکم کے ساتھ معلل ہیں، یہ بات ظاہر ہے اور نصوص اس پر شاہد ہیں، تاہم اس کو اتنا عام سمجھنا کہ کوئی فعل بھی اس کے افعال میں سے غرض سے خالی نہ ہو محل بحث ہے۔

اصفہانی نے شرح الطوالع میں لکھا کہ اس مسئلہ میں معتزلہ اور اکثر فقہا کا اختلاف ہے اور میں اسی کا قائل ہوں جو سلف کا مسلک ہے کیونکہ دس ہزار سے زیادہ آیات واحادیث میں تعلیل کی صورت موجود ہے اور سب میں تاویل کرتے جانا انصاف سے بعید ہے۔ (روح المعانی صفحہ ۲/۶۸۹)

دوسری بحث یہ ہے کہ انبیاء سے گناہ سرزد ہوسکتے ہیں یا نہیں؟ یہ بحث نہایت اہم ہے اور پہلے سے ہمارا ارادہ تھا کہ اس کو مکمل طریقہ پر بخاری کی ''کتاب الانبیاء'' میں لکھیں گے اور وہی اس کے لئے زیادہ بہتر موقعہ ہے، مگر دیکھا کہ بعض شائع شدہ تقاریر درس بخاری میں اسی حدیث مذکور کے تحت یہ بحث آ گئی ہے اس لئے خیال بدل گیا اور یہاں بھی کچھ ضروری اجزاء پیش کرنے کا ارادہ ہو گیا۔ **واللہ المیسر و علیہ التکلان۔**

عصمت انبیاء علیہم السلام

خدا کی مخلوق میں سے خدا کے بعد سب سے بڑا مرتبہ انبیاء ومرسلین علیہم السلام کا ہے وہ دنیا کے لئے خدا کے نائب وخلیفہ ہیں وہ **تخلقوا باخلاق اللہ** کے سب سے بڑے نمونے، اس کی اطاعت وعبودیت کے سب سے اونچے پیکر مجسم، علوم ومعرفت الٰہیہ کے سب سے زیادہ عالم وعارف، خدا کی ذات وصفات کے ہمہ وقتی مشاہدہ واستحضار سے مستفید ومستنیر، غرض جتنی خوبیاں، جتنے اوصاف کمال خدا کی ذات والاصفات جل مجدہ کے سوا کسی مخلوق میں جمع ہوسکتے ہیں وہ انبیاء ومرسلین میں جمع ہوتے ہیں۔ اسی لئے کسی ایک نبی کے مرتبہ کمال علمی وعملی کو بھی خواہ وہ کسی درجہ کا بھی ہو۔ بڑے سے بڑا ملک مقرب بھی نہیں پہنچ سکتا۔ اور اپنے اپنے دور کے ہر نبی کو...... بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر کا مصداق کہا جاسکتا ہے اس کے بعد ان انبیاء میں بھی باہم فرق مراتب ہے، خداوند تعالیٰ کی لانہایہ بارگاہ کے مراتب قرب بھی بے نہایت ہیں۔

اے برادر بے نہایت در گہیست　　　ہرچہ بروے می رسی بروے مہیست

انبیاء مرسلین کی مثال چاند، سورج کی ہے کہ لاکھوں چاند اور سورجوں کے کہکشاں [1]!

[1] کہکشاں سے مراد ''علم فلکیات جدید'' میں ثوابت ستاروں کا عدسہ کی شکل کا نظام ہوتا ہے جو زمین کے مرکز سے بہت دور واقع ہے، یہ ہمارا کہکشاں ہے جس کا ایک جزو ہمارا نظام شمسی ہے، اور اس کی موٹائی یا بلندی ۲۷ ہزار نوری سال ہے (یعنی ۳۲ ہزار کھرب میل) اور چوڑائی تین لاکھ نوری سال ہے۔ پھر ہمارے اس کہکشاں کے علاوہ بھی اور بہت سے کہکشاں ہیں، جن میں سے بعض تک اب یورپ وامریکہ کی نو

ایجاد عظیم دوربینوں کے ذریعہ رسائی ہورہی ہے' مثلاً کہکشاں سیدیم اینڈ رومیدہ' جو ہم سے آٹھ لاکھ ۵۰ ہزار نوری سال دور ہے (روشنی کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ ہے' اس رفتار سے روشنی ایک سال یعنی ۳۶۵ دن میں جو فاصلہ طے کرتی ہے اسے نوری سال کہتے ہیں (LIGHTYEAR) نظام شمسی ہمارے کہکشاں کا نہایت حقیر جزو ہے اور اس نظام شمسی میں ہمارے سورج جیسے تقریباً ایک کھرب ثوابت و سیارے ہیں' جبکہ ہمارے سورج کا قطر ۸ لاکھ ۶۶ ہزار میل کا ہے اور اس میں روشنی اس قدر ہے جس قدر ۵۵۶۳ موم بتیاں ایک مربع فٹ میں جلانے سے حاصل ہوسکتی ہے' ستاروں میں سے ہمارا آفتاب سب سے چھوٹا ستارہ ہے اور وہ زمین سے تقریباً نو کروڑ ۲۹ لاکھ میل دور ہے' ہماری زمین نظام شمسی کا ایک نہایت حقیر جزو ہے' کیونکہ زمین کا قطر خط استوا پر صرف ۷۹۲۷ میل کا ہے' سورج سے ہماری زمین تک روشنی ۸ منٹ میں پہنچتی ہے جبکہ بعض ستارے ایسے بھی خدا کی مخلوق ہیں' جن کی روشنی زمین تک دو ہزار برس میں پہنچتی ہے یعنی جو روشنی آج سے دو ہزار سال قبل چلی تھی وہ ہمیں اس وقت نظر آرہی ہے اس سے خدا کی خدائی کی وسعت اس کی مخلوقات کی کثرت وعظمت' اور خلاق عوالم کی بے نہایت جبروت و بڑائی کا کچھ اندازہ ہوسکتا ہے یورپ وامریکہ کے سائنس دانوں نے یہاں تک تحقیق کی ہے کہ بعض ستارے ایسے بھی ہیں کہ جن کی روشنی زمین تک کئی کروڑ برس میں پہنچتی ہے' اور ایک ستارے کی دریافت حال میں ہوئی ہے' جس کا فاصلہ زمین سے آٹھ سومہاسنگ میل دور ہے' ایسی باتوں سے ہمارے بہت سے مسلمانوں کو حیرت ہوگی اور بہت سے محض ان کو خیال آرائی سمجھیں گے مگر سوچنے کی بات ہے کہ قرآن مجید میں چاند' سورج' ستاروں اور ملکوت السموٰت والارض' اور کم از کم زمین کے خطوں میں ہی گھوم پھر کر اس کے عجائب وغرائب میں فکر ونظر دوڑا کر رب العالمین کے وجود وحدانیت کا یقین حاصل کرنے کا حکم بار بار کس کو ملا تھا قرآن مجید ماننے والوں کو یا نہ ماننے والوں کو؟ اکبرالہ آبادی مرحوم نے کہا تھا۔

نئی میں اور پرانی روشنی میں فرق اتنا ہے　　　انہیں ساحل نہیں ملتا' انہیں کشتی نہیں ملتی

اکبر مرحوم کا دور یورپ وامریکہ کے لوگوں کے لئے بحرانی دور تھا' جس میں وہ اسلام اور مسلمانوں سے تعصب رکھتے تھے اور حقائق عالم سے حقیقۃ الحقائق تک رسائی ان کے لئے دشوار ہوگئی تھی' مگر خدا کا شکر ہے کہ وہ دور جاہلیت ختم ہوا اور اب اس دور کا یو[illegible] وامریکہ بہت کچھ اسلام سے قریب ہو چکا ہے' ہزاروں سعید روحیں اسلام کے حلقہ بگوش ہو چکی ہیں' اور بڑے پیمانہ پر بھی وہاں اسلام کی روشنی پھیل سکتی ہے کیونکہ سائنس کی جتنی ترقی آگے ہورہی ہے ان لوگوں کے دلوں میں حقیقۃ الحقائق کی جستجو بھی بڑھ رہی ہے' چنانچہ ایک جدید فلاسفر سائنسدان ''ایف آر مولٹن'' نے کہا:۔

''کائنات کا حجم یا لامحدودیت انسان کے لئے اتنی زیادہ اہم نہیں' بلکہ جس چیز سے انسان ششدر وحیران رہ جاتا ہے وہ کائنات کی مکمل باضابطگی ہے کہ کوئی گڑ بڑ نہیں' کوئی چیز خلاف توقع نہیں ہے''۔

یہ مکمل باضابطگی کو قائم رکھنے والی کون سی ذات ہے بس علوم نبوت کی ذرا سی بھی ر[illegible] مل جائے تو اس کی معرفت ہی تو ساحل مراد تک رسائی ہے اس کے سوا اور کیا ہے؟ دوسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ تل اوٹ پہاڑ ہے' ساحل کے قریب کھڑے ہیں مگر ابر وغبار کی وجہ سے اس کو دیکھ نہیں سکتے۔ یہ پردہ سامنے سے ہٹ جائے یا آنکھوں کی روشنی بڑھ جائے تو ساحل نے روشناسی حاصل ہو۔

افسوس کہ دوسرے لوگ دنیوی علوم کی ترقی کے راستہ سے علی وجہ البصیرت ساحل مراد کے قریب آرہے ہیں اور ہم میں سے لاکھوں کروڑوں مسلمان ایسے ہوں گے جو اپنے گھر کی دولت علوم نبوت کے ذریعہ بھی صحیح معنی میں خدا کے وجود وحدانیت سے ناآشنا ملیں گے۔

ظاہر ہے کہ حقیقی اسلام کے بغیر رسمی واسمی اسلام کی دعویداری کی کیا حیثیت ہے؟ ایسے ہی حالات سے متاثر ہو کر حالی مرحوم نے کہا تھا۔

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے　　　گر کر جو ہمارا نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد　　　دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے

ہمارے گردفضاء محیط میں موجود ہیں' ہر دور کے ہر خطہ کے نبی کی مثال اس وقت کے چاند یا سورج کی ہے' جس کے انوار و برکات روحانی ومعنوی سے ساری دنیا کو روشنی ملی' اور وہ تمام چاند وسورج اب بھی اپنی اسی آب وتاب کے ساتھ روشن ہیں' مگر ہماری ارواح کو ان مادی اجسام میں مقید ہونے کی وجہ سے ان کا ادراک نہیں ہوسکتا' حضرت نبی الانبیاء خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی دنیا میں شب معراج بہت سے انبیاء ومرسلین علیہم السلام سے ملاقات کی اور مسجد اقصےٰ میں سب نے آپ کے پیچھے مقتدی بن کر نماز جماعت ادا فرمائی۔

وہ سارے انبیاء شموس ہدایت تھے' اور سرور انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ان کے شمس اعظم تھے۔ آپ تمام علوم وکمالات انبیاء علیہم السلام کے جامع تھے' حق تعالیٰ جل ذکرہ کی بارگاہ میں جو قرب ومنزلت آپ کو حاصل ہوئی وہ کسی اور کو حاصل نہیں ہوئی۔

اے ختم رسل مرتبہات معلوم شد دیر آمدہ زراہ دور آمدہ!

انبیاء علیہم السلام کے خصائص وفضائل بے شمار ہیں مگر نبی الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص وخصائل کی شان سب سے بلند ہے آپ کے خصائص پر مستقل کتابیں لکھی گئیں' جن میں سے امام سیوطی کی ''خصائص کبریٰ'' بہت مشہور ومستوعب ہے۔

افسوس ہے کہ اردو میں خصائص پر بہت کم مواد ملتا ہے' حالانکہ ان سے نبی ورسول کی عظمت کا سکہ دلوں پر نقش ہوتا ہے کتاب الانبیاء میں ہم بھی خصائص نبوت اور بالخصوص خصائص نبی الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری تشریح وتفصیل کریں گے انشاء اللہ تعالیٰ۔

ہم یہاں صرف ایک خصوصیت کا ذکر کریں گے جس کے باعث نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دوسرے سب انبیاء علیہم السلام سے ممتاز ہیں اور وہ آپ کی سب اگلی پچھلی لغزشوں کی مغفرت کا اعلان ہے' کیونکہ یوں لغزشیں تو تمام ہی انبیاء کی حق تعالیٰ کے فضل وکرم سے بخش دی جاتی ہیں مگر اس طرح کھول کر اعلان صرف آپ ہی کے لئے ہوا ہے جس کی بڑی حکمت میدان حشر میں ظاہر ہوگی' سارے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام امتوں کی شفاعت سے عذر کریں گے اور اپنی لغزشوں کو یاد کریں گے' پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور درخواست شفاعت کریں گے تو آپ کسی لغزش کا ذکر نہیں کریں گے' بلکہ انا لھا انا لھا فرمائیں گے' یعنی میں تم سب کے لئے بارگاہ رب العزت میں شفاعت کرنے کے لئے تیار ہوں' جس ذات اقدس کی ساری عمر امت کی خیر خواہی وغم خواری میں گزری تھی' وہ میدان حشر میں اپنی اور اپنے سب بھائیوں کی امتوں کی اس ہولناک دن کی پریشانیوں پر خود ہی کس قدر بے چین ہوگا اور جوں ہی ان سب کی خدمت کا ایک اور زریں موقع وہاں ہاتھ آیا' کیسی جی داری سے ان کی سب کی دلداری انا لھا انا لھا کی تکرار سے فرمائیں گے' گویا وما ارسلناک الا رحمتہ للعالمین کا دنیوی زندگی کے ثبوت کے بعد دوسرا ثبوت آخرت میں اس شان کے ساتھ ہوگا

یارب تو کریمی و رسول تو کریم صد شکر کہ ہستیم میان دو کریم

انبیاء کی سیرت' صفات' ملکات

عصمت انبیاء علیہم السلام کے بیان سے پہلے مناسب ہے کہ ان کے چند اہم خصوصی ملکات واحوال کا ذکر کر دیا جائے' تا کہ ان کا تعارف زیادہ بہتر طریقہ پر ہو کر ان کے ساتھ تعلق عظمت ومحبت میں بھی اضافہ ہو اور وجوہ عصمت بھی زیادہ خوبی سے ذہن نشین ہوں۔

(۱) انبیاء علیہم السلام کی تربیت وتعلیم کا اہتمام اول سے آخر تک براہ راست اللہ تعالیٰ کی شان ربوبیت کے تحت ہوتا ہے اس لیے ان کے تمام احوال زندگی دوسرے لوگوں کے احوال سے مختلف ہوتے ہیں' ان کی طفولیت' شباب' کہولت' شیخوخت کے اطوار بھی سب سے جدا ہوتے ہیں' ان کے ملکات بھی دوسروں سے ممتاز ہوتے ہیں' اللہ یجتبی الیہ من یشاء و یھدی الیہ من ینیب' (حق تعالیٰ اپنے بندوں میں سے مجتبیٰ ومصطفےٰ تو ان کو کرتے ہیں جن کو چاہیں' اور اپنی ہدایت کا راستہ ہر اس شخص کو دکھلا دیتے ہیں جو اس کی طرف رجوع وانابت

کرے) معلوم ہوا کہ پیغمبرانہ شان عطا ہونے کی شرط اور ہے اور ہدایت کی شرط الگ اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ (خدا ہی خوب جانتا ہے کہ رسالت کے لیے کون سا ظرف موزوں ہے' معلوم ہوا کہ عطا نبوت خاص ملکات موہوبہ پر موقوف ہے۔

(۲) بار نبوت اٹھانے سے قبل ہی ان کے قلوب اس قدر مزکی ومصفیٰ ہو جاتے ہیں کہ ان کے خواب و بیداری کے حالات یکساں ہو جاتے ہیں' وہ اپنے نور باطن سے سامنے اور پیچھے کی چیزوں کو یکساں دیکھتے ہیں' پست و بلند آواز کو یکساں سننے لگتے ہیں' وہ ساری خلق کو خدا کا کنبہ سمجھتے' اور دوست و دشمن' بدخواہ و خیرخواہ کے ساتھ یکساں سلوک کرتے ہیں' ان کی معصومانہ فطرت و فرشتگی پر فرشتوں کو رشک ہوتا ہے' خلاصہ یہ کہ وہ بشر صورت مگر فرشتہ سیرت ہوتے ہیں۔

(۳) خلعت نبوت سے سرفراز ہو کر انبیاء علیہم السلام اپنی امتوں کے لیے اسوہ حسنہ اور تمثالی نمونہ ہوتے ہیں ان کا ہر قول و فعل دعوت اتباع ہے' کیونکہ ان کی تمام حرکات و سکنات مرضیات الٰہیہ کی آئینہ دار ہیں۔

وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ ولکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ"

(۴) انبیاء علیہم السلام کے نفوس پیدائشی و خلقی طور پر مطمئنہ ہوتے ہیں' دوسرے انسانوں کی طرح نفوس امارہ نہیں ہوتے یعنی ان کے نفوس فطرۃً ہر معصیت و برائی سے متنفر ہوتے ہیں' اسی طرح دوسرا اور بیرونی دشمن انسان کا شیطان ہے' وہ بھی انبیاء علیہم السلام کے اعلیٰ تقدس و تقویٰ کے سامنے اپنے ہتھیار ڈال دیتا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ شیطان میرا مطیع و منقاد ہو گیا ہے۔ اور فرمایا کہ شیطان میری صورت اختیار نہیں کر سکتا اس لیے جس نے مجھے دیکھا' اس نے مجھے ہی دیکھا۔ بلکہ خیر الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقہ میں خیر الامم کے بھی بہت سے افراد کو اس قسم کے مناقب عالیہ عطا ہو گئے ہیں' چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ شیطان تم سے ڈرتا ہے' ایک دفعہ فرمایا کہ اے عمر! جس راستہ پر تم چلتے ہو' اس پر شیطان نہیں چل سکتا' ایک بار فرمایا کہ میں نے دیکھا جن و انس کے شیاطین سب ہی عمر سے ڈر کر دور بھاگ گئے ہیں۔ (جمع الفوائد صفحہ ۲۰۷ ج ۲)

(۵) انبیاء علیہم السلام کی بے نظیر قوت علم و عمل کے پورے پورے اثرات ان کے شرف صحبت سے مستفیدین پر پڑتے ہیں' اور وہ سب اپنے وقت کے نبی مرسل کے تمثالی نمونے بن جاتے ہیں' چنانچہ نبی الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی شان' ان کے حالات و مناقب' سب کو معلوم ہے' خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے اصحاب کی مثال ستاروں کی سی ہے' جس سے بھی تم چاہو گے' ہدایت حاصل کر لو گے' وہ سب عدول تھے' اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک نہایت ہی ممتاز خصوصیت یہ بھی ہے کہ آپ نے اتنی بڑی تعداد میں' جو ایک لاکھ چوبیس ہزار تک منقول ہے' اپنے صحیح جانشین چھوڑے اور وہ سب ہی حق و ہدایت کے مینار تھے' بعض حضرات نے چند صحابہ کے کبار معاصی میں مبتلا ہونے کی وجہ سے یہ رائے قائم کی کہ "صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین معیار حق نہیں ہیں" یہ رائے ہمارے نزدیک حق صواب سے ہٹی ہوئی ہے' اگر بلحاظ حدیث صحیح صحابہ کرام مثل نجوم' اور سب کے سب عدول تھے' تو پھر ان کو معیار حق نہ سمجھنا' کہاں تک درست ہو سکتا ہے؟ ہاں! یہ تعبیر درست ہو سکتی ہے کہ معیار حق کا اولین درجہ قرآن و حدیث ہے اس کے بعد صحابہ کرام بھی ضروری و بدیہی طور پر معیار حق ہیں۔

ہم نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ آثار صحابہ کی حجیت سے قطع نظر کا معاملہ تیسری صدی سے شروع ہوا' اور یہی بات ترقی کر کے اس حد پر پہنچ گئی کہ اس زمانے کے بعض لوگوں نے برملا کہنا شروع کر دیا کہ صحابہ معیار حق ہی نہیں ہیں' علاوہ اس کے کہ یہ بات خلاف تحقیق ہے' اس کے مضر اثرات نہایت دوررس ہوں گے۔

خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی فیض کے بے مثال گہرے اثرات کا انکار کون کر سکتا ہے' ان کے حالات پڑھ کر اسی طرح ایمان تازہ ہوتا ہے' جس طرح انبیاء علیہم السلام کے حالات پڑھ کر ہوتا ہے' ہمارے اکابر اساتذہ دیو بند تو فرمایا کرتے تھے کہ مشاجرات صحابہ کے صحیح حالات پڑھنے سے بھی ایمان تازہ ہوتا ہے' کیونکہ ہر معاملہ میں ان کی نیک نیتی' بے نفسی و خدمت دین ہی کا جذبہ کار فرما نظر آتا ہے۔ جن چند صحابہ سے بہ تقاضائے بشریت کسی معصیت کا صدور ہوا ہے' ان کی بے مثال ندامت و توبہ کی صورت حال کا کچھ ذکر پہلے ہو چکا ہے کہ ایک شخص کی توبہ پوری ایک امت پر تقسیم ہو سکتی ہے' ہمارے نزدیک تو ایسے صحابی یا صحابیہ کی زندگی بھی معیار حق و صداقت بن سکتی ہے' پھر دوسرے اکابر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا تو کہنا ہی کیا؟

کچھ اسی طرح کی تفریط ائمہ مجتہدین متبوعین اور حضرات مجددین امت رحمہم اللہ تعالیٰ کے بارے میں بھی ہوئی ہے' کہ ان کے کچھ نقائص واقعی یا غیر واقعی پر نظر کر کے' ان کے مراتب عالیہ کو گھٹا کر دکھایا گیا' اس قسم کی تحقیقات پر تنقیدی نظر ہم کچھ مقدمہ انوار الباری میں کر چکے ہیں اور کسی آئندہ فرصت میں بھی کریں گے' انشاء اللہ تعالیٰ۔

انبیاء علیہم السلام کے جلیل القدر ملکات و اوصاف کی طرف چند اشارات پیش کرنے کے بعد مناسب ہے کہ وجوہ عصمت پر کچھ روشنی ڈالی جائے' پہلے مسئلہ عصمت کے بارے میں اکابر امت کے نظریات معلوم کر لیجئے۔

عصمت انبیاء کے متعلق مختلف نظریات اور حقیقت عصمت

عقیدۂ سفارینی میں حافظ امین الدین عراقی سے نقل ہے کہ نبی بعد النبوۃ عمداً گناہ کرنے سے بالاجماع معصوم ہوتا ہے' اور بطور سہو وقوع صغیرہ میں اختلاف ہے' استاذ ابو اسحاق اسفرائنی اور قاضی عیاض مانعین جواز میں ہیں' شیخ تقی الدین سبکی کا شمار مجوزین میں ہے اور حافظ عراقی کا رجحان بھی اسی طرف ہے۔

علامہ تفتازانی نے لکھا کہ انبیاء علیہم السلام کے تمام ذنوب سے معصوم ہونے کے مسئلہ میں تفصیل ہے' کفر و شرک سے تو بالاجماع معصوم ہیں' قبل نبوت بھی اور بعد نبوت بھی' اور حشویہ کو چھوڑ کر جمہور امت کے نزدیک اسی طرح قبل و بعد نبوت تعمد کبائر سے بھی معصوم ہیں' البتہ سہواً کو اکثر نے جائز رکھا ہے' صغائر کا صدور عمداً جمہور کے نزدیک اور سہواً بالاتفاق جائز ہے' بجز ان باتوں کے جو اخلاقی گراوٹ سے تعلق رکھتی ہیں (کیونکہ نبی کا وصف خلق عظیم ہے)

اس کے علاوہ عام اشاعرہ کا مسلک جواز وقوع صغائر سہواً و عمداً قبل نبوت و بعد نبوت ہے' اور عام ماتریدیہ اس کی بالکلیہ نفی کرتے ہیں' ہمارے فقہاء حنفیہ بھی انبیاء علیہم السلام کی عصمت مطلقہ کے قائل ہیں۔

امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ عصمت حق تعالیٰ کا وہ خصوصی فضل و انعام ہے' جس سے انبیاء علیہم السلام ہر آن و ہر لحہ حق تعالیٰ کی فرمانبرداری کے لئے مستعد رہتے ہیں اور کسی وقت بھی ادنی نافرمانی کا دھیان و خیال تک نہیں لاتے' اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان سے معصیت کا اختیار فرشتوں کی طرح سلب کر لیا جاتا ہے' بلکہ اختیار و قدرت بدستور اور انسانوں کی طرح باقی ہوتے ہوئے بھی نافرمانی کا ہر داعیہ ان کے دواعی خیر کے تحت ایسا دبا مٹا ہوا ہو جاتا ہے کہ اس کے ابھرنے کا امکان وقوع باقی نہیں رہتا' واللہ اعلم۔

حضرت مولانا اسماعیل شہیدؒ نے "منصب امامت" میں عصمت کی تشریح اس طرح فرمائی:۔

انبیاء علیہم السلام کی عصمت یہ ہے کہ "حق تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے ان کے اقوال' افعال' عبادات' عادات' معاملات' مقامات' اخلاق و احوال کو نفس امارہ اور شیطان رجیم کی دخل اندازی اور خطاء و نسیان سے محفوظ کر دیتا ہے' اور نگرانی و حفاظت کرنے والے فرشتے ان پر مسلط فرما

دیتا ہے تا کہ بشریت کا غبار بھی ان کے دامن پاک تک نہ پہنچ سکے''۔اس کے بعد وجوہ واسباب عصمت نمبروار لکھے جاتے ہیں۔

وجوہ واسباب عصمت

(۱) عصمت کے ظاہری اسباب چار ہیں اور چونکہ یہ سب انبیاء علیہم السلام میں بکل معنی الکلمہ موجود ہوتے ہیں اس لیے ان کی عصمت بھی یقینی ہے (۱) شر کے عواقب ونتائج کا ذاتی علم جو انبیاء کو اپنی عقل کامل کے ذریعہ ہوتا ہے (۲) وحی الٰہی سے اس علم ویقین میں مزید اضافہ (۳) تعلق مع اللہ اور تقرب خاص کے سبب نسیان وترک اولیٰ پر بھی ''اندیشہ مواخذہ'' (۴) عدالت وثقاہت جو برائیوں سے بچاتی ہے۔

(۲) دیگر صفات کے علاوہ انبیاء علیہم السلام کی ایک بڑی صفت دائمی حضور مع اللہ کی ہے جو عصمت کے لیے بہت بڑا سبب ووسیلہ بن جاتی ہے۔

(۳) انبیاء علیہم السلام کو اپنی عصمت کا خود بھی پورا یقین ہوتا ہے اور کسی حکم رسول کی بجا آوری میں اگر امتی کی طرف سے کوئی تساہل پایا گیا ہے تو اس پر خدا اور رسول کی طرف سے تنبیہ کی گئی ہے' مثلاً ایک تو اسی حدیث زیر بحث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے غضب وغصہ کا اظہار معلوم ہو چکا ہے' اور اسی نوع کی دوسری حدیث کا بھی ذکر ہم کر چکے ہیں' تیسری حدیث بخاری کی باب الا عتصام بالسنۃ میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی عمل میں رخصت کا پہلو اختیار فرمایا' جس پر عمل کرنے کو بعض لوگوں نے پسند نہ کیا' حضور کو اطلاع ہوئی تو آپ نے حمد وثناء کے بعد فرمایا۔

لوگوں کا عجیب حال ہے کہ جس عمل کو میں نے اختیار کیا اس سے احتراز کرتے ہیں' واللہ! میں ان سے زیادہ خدا کا علم رکھنا والا اور سب سے زیادہ اس سے ڈرنے والا ہوں۔

چوتھی حدیث بھی بخاری میں ہے کہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے ایک دوسرے صحابی کا جھگڑا باغ میں آبپاشی پر ہو گیا۔حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک نوبت پہنچی تو آپ نے حالات سن کر فیصلہ فرمایا کہ پہلے زبیر آبپاشی کر لیں' پھر اپنے انصاری پڑوسی مذکور کے باغ میں پانی جانے دیں۔انصاری نے کہا کہ آپ نے ایسا فیصلہ اس لیے کیا کہ زبیر آپ کے پھوپھی زاد بھائی ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات سے رنج وملال ہوا۔کیونکہ آپ کا فیصلہ حق کا فیصلہ تھا' اس کو قبول نہ کرنا یا رسول کے فیصلہ کو دنیوی مصالح وتعلقات پر محمول کرنا اسلامی شان کے خلاف ہے' حضرت زبیر کا بیان ہے کہ اسی معاملہ میں یہ آیت نازل ہوئی' **فلا وربک لا یومنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم الایۃ** (پس نہیں اور قسم ہے تیرے رب کی نہیں مومن ہوں گے وہ لوگ تا آنکہ اپنے تمام نزاعی امور میں آپ کو حتمی طور پر حکم نہ مانیں اور وہ بھی اس شان سے کہ آپ کے فیصلہ سے اپنے دلوں میں بھی کسی قسم کی تنگی وگرانی محسوس نہ کریں اور اس پوری پوری طرح تسلیم کرلیں)

درحقیقت یہی ایمان والوں کی شان ہے کہ وہ نبی کے مرتبہ کو صحیح طور سے سمجھتے ہیں' اس کی پوری زندگی اور ہر قول وفعل کو اپنے لیے اسوہ اور عملی نمونہ جانتے ہیں' جن چیزوں کا بھی حکم بارگاہ رسالت سے ملتا ہے اس پر بے چون وچرا عمل کرتے ہیں' اور جن چیزوں سے روک دیا اس کے پاس نہیں پھٹکتے' اسی لیے سنت رسول کا اتباع اور امور بدعت سے قطعی اجتناب ایک مومن کی زندگی کا اہم ترین نصب العین ہے۔

جس حدیث کی اس وقت ہم نے تفصیل کی' اس میں حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور ایک انصاری کے جھگڑے کا ذکر ہے' جو بدری صحابی تھے کوئی معمولی صحابی بھی نہیں' مگر نزول قرآن مجید کا دور تھا' رفتہ رفتہ دین مکمل ہو رہا تھا' اس لیے بڑے بڑے صحابہ سے بھی لغزشیں ہوئی تھیں اور خدا اور رسول خدا ان کی اصلاح فرماتے تھے' اور ان سب احوال وواقعات سے ہمیشہ کے لیے امت محمدیہ کو روشنی ملتی رہے گی' اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قرآن مجید کے مکمل نزول اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی سامنے آجانے کے بعد صحابہ کرام کی علمی وعملی زندگی مکمل ہو گئی تھی' اور جس

طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے آئینہ زندگی میں مرضیات الٰہیہ اور تخلق باخلاق اللہ کا کامل ومکمل مرقع پیش ہوگیا تھا اس مرقع کا فوٹو آفسٹ ہو کر ہر ہر صحابی رسول کی لوح قلب پر اس کی کاپی چھپ گئی تھی' فوٹو آفسٹ کی مثال ہم نے وضاحت کے لیے اور اس خیال سے دی ہے کہ فوٹو میں غلطی کا امکان نہیں رہتا' اور شاید اسی لیے پورے وثوق کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا' **اصحابی کا لنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم**' کیونکہ ان پر آپ کے اعمال زندگی کی چھاپ پوری اور صحیح طور سے پڑھ چکی تھی' صحابہ کے بعد کے دور میں نقل وروایت شروع ہوئی' جس میں غلطی کا احتمال ہوتا ہے اسی لیے تابعین ومن بعدہم کے لیے کوئی ایسی توثیق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے صادر نہیں ہوئی' البتہ اتنا فرمایا: "**خیر القرون قرنی ثم الذین یلونھم' ثم الذین یلونھم**"۔ اور یہ توثیق صرف خیریت کی ہے۔ کما لا یخفی۔

صحابہؓ معیار حق ہیں

اس سے یہ بھی واضح ہوا کہ اگر ہم صحابہ کرام کو بھی معیار حق نہیں مانیں گے تو دین اسلام کے ایک نہایت شاندار دور کو تاریک سمجھ لیں گے اور جو کمزوری تابعین اور ان کے بعد آئی' اس کو بہت پہلے سے مان کر دین کے بیشتر اجزاء کو جو صحابہ کے فتاوی وآثار وغیرہ پر موقوف ہیں' کمزور کردیں گے' غالباً اتنی صراحت کافی ہے لیکن ضرورت ہوئی تو ہم اس سے زیادہ کھل کر بھی کچھ عرض کریں گے' انشاء اللہ تعالیٰ وھو المستعان۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

یہاں ایک شبہ یہ ہوسکتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے بعض لغزشیں ہوئی ہیں' جن کا ذکر قرآن مجید میں ہے اور ان کا اعتراف خود انبیاء علیہم السلام سے بھی ثابت ہے اور احادیث شفاعت میں بھی حشر کے روز ہر نبی کا اپنی کسی لغزش وغیرہ کے سبب شفاعت سے اعتذار ثابت ہے اس کے چند جوابات ہیں وہ بھی ذہن نشین کرلیجئے۔

(۱) انبیاء علیہم السلام کی جن لغزشوں کا ذکر قرآن مجید میں کیا گیا ہے وہ ان کی پوری زندگی کے ہزارہا نیک اعمال میں سے صرف ایک دو عمل ہیں جن کی عدم اہمیت ظاہر ہے۔

(۲) وہ لغزشیں بھی کفر وشرک یا گناہ کبیرہ کی قسم سے نہیں ہیں۔

(۳) اکثر لغزشوں کا تعلق خطا ونسیان سے ہے جن کا مواخذہ امت سے بھی نہ ہوگا۔

(۴) انبیاء علیہم السلام پر عتاب ہے اس لئے ہوا کہ "**حسنات الابرار سیئات المقربین**" پھر جن کے رتبے ہیں سوا اس کے سوا مشکل ہے۔

نیز اس لئے کہ امت کے کان اچھی طرح کھول دیئے جائیں کہ خدا کی بارگاہ جلیل میں رعایت' بڑے سے بڑے کی بھی نہیں کہ رسولوں سے اوپر تو کسی کا مرتبہ ہو ہی نہیں سکتا' مگر وہ بھی خدا کی مخلوق اور بندے ہیں' باوجود مراتب عالیہ اور اعلیٰ ترین تقرب بارگاہ رب العزت کے ان کی لغزشوں پر بھی گرفت ہوسکتی ہے اور یہ بھی نہیں کہ اگر ان کی لاکھ دس لاکھ نیکیاں ہیں تو ایک دو لغزشوں پر نظر نہ ہو' یوں شان رحمت سے جب غیر نوازے جائیں گے تو اپنے کیسے محروم ہوسکتے ہیں۔

غرض ان لغزشوں کا ذکر اور بعض جگہ زیادہ تند وتیز لہجہ میں بھی صرف اپنی شان جلال وجبروت کا اظہار ہے اسی لئے ایک ایک ہی لغزش کو کہیں سخت گرفت میں لیا ہے اور دوسری جگہ اس کو شان رحمت کے انداز سے دکھلایا ہے اس کی مثال حضرت آدم علیہ السلام کی لغزش میں ملتی ہے' ایک جگہ "**فعصی ادم ربہ فغوی**" سے ادا فرمایا اور دوسری جگہ **فنسی ولم نجد لہ عزماً** فرمایا' اور بات صرف اتنی تھی کہ آدم وذریت آدم کو اپنے علم تقدیری کے اعتبار سے جنت میں ہمیشہ کے لئے اس وقت رکھا ہی نہیں گیا تھا' بلکہ دنیا میں بھیج کر ایک معین مدت تک کے لئے آباد کرنا اور اعمال (اوامر ونواہی) کا مکلف کرنا تھا' پھر سب کو آخرت میں اپنے اپنے اعمال کے موافق صحیح طور سے مستحق جنت وجہنم

بنانا تھا' غرض ایک عبوری دور کے لئے حضرت آدم علیہ السلام کو داخل جنت کیا اور بطور نہی شفقت ایک خاص درخت کے پھل کھانے سے روک دیا' شیطان نے اسی کے کھانے پر طرح طرح سے آمادہ کیا اور خدائے برتر کی قسمیں تک کھائیں کہ اس درخت کے پھل کھا کر تم فرشتے بن جاؤ گے (جس سے خدا کا تقرب اور بڑھ جائے گا' یا تم ہمیشہ جنت میں رہو گے (نکالے نہ جاؤ گے) سنتے سنتے آدم علیہ السلام کا اشتیاق ادھر بڑھا اور سوچا کہ نہی تشریع تو ہے نہیں' نہی شفقت ہے' کچھ زیادہ نقصان اور وہ بھی شرعی ضرر تو ہوگا نہیں اور ممکن ہے وہ مبینہ فوائد حاصل ہو جائیں' شیطان کی باتوں سے دھوکہ کھا گئے اپنے منصب رفیع کو بھول گئے کہ نبی کو خدا کے معمولی سے احکام کی بھی زیادہ سے زیادہ رعایت کرنی چاہئے اور اس کے کسی امر و نہی کے مقابلہ میں کسی عقلی مصلحت و فائدہ پر دھیان نہ دینا چاہئے تاہم یہ صرف ایک بھول تھی اور اس کے ساتھ عزم بھی نہ تھا کہ خدا کے حکم کو جان بوجھ کر' سوچ سمجھ کر نظر انداز کیا ہو جو نہی تشریعی کی صورت میں ہوسکتا تھا' نہی شفقت میں صرف اتنا ہوتا ہے کہ اس کے خلاف سے اپنا ذاتی کوئی ضرر ہوسکتا ہے۔ آدم علیہ السلام نے اس کے مقابلہ میں نفع کثیر کا خیال باندھ لیا' یہ کیا خبر تھی کہ اس نہی شفقت پر عمل نہ کرنے کے اثرات اتنے زیادہ اور دیرپا ہوں گے کہ ذریت آدم کو جنت کی نعمتوں سے محروم ہو کر ہزاروں ہزار سال بطور ابتلائی دور کے گزارنے پڑیں گے اس لغزش پر حضرت آدم علیہ السلام کو جس قدر ندامت ہوئی۔

اور برسہا برس تک اس سے توبہ واستغفار فرماتے رہے وہ ان کی پیغمبرانہ علوشان کا مظاہرہ تھا' جو احکم الحاکمین کی اعلیٰ وارفع ذات کی نہی شفقت کی عدم رعایت کا لازمی نتیجہ تھا ورنہ فی نفسہ اس کی حیثیت ایک لغزش یا نسیان سے زیادہ نہ تھی' اس لئے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے جد بزرگوار حضرت آدم علیہ السلام کو الزام دینا چاہا کہ آپ کی لغزش کے باعث آپ کی ساری ذریت ایک طول طویل ابتلا کی دلدل میں پھنس گئی تو دادا جان (ارواحنا فداہ) نے کیسا کھرا جواب دیا کہ تم مجھے ایسی بات پر ملامت کرنے لگے ہو' جو تقدیر الٰہی میں میری پیدائش سے بھی ہزاروں سال پہلے لکھی ہوئی تھی' سرور دو عالم محبوب رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث بیان فرما کر ارشاد فرمایا کہ دادا جان علیہ السلام کی حجت بھائی موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں قوی تھی' اس لئے وہ غالب رہے اور بھائی جان کو لاجواب ہونا پڑا۔

شرک فی التسمیہ والی لغزش بے بنیاد ہے

اس لغزش کے علاوہ جو بات شرک فی التسمیہ والی حضرت آدم علیہ السلام کی طرف منسوب کی گئی' وہ قطعاً غلط ہے اور جو حدیث ترمذی میں روایت کی گئی وہ حسب تصریح حافظ ابن کثیر وشیخ التفسیر علامہ آلوسی صاحب روح المعانی وغیرہ اسرائیلیات سے ہے اور اسرائیلیات میں سے بلکہ دوسری اخبار آحاد سے بھی ہم وہی چیز لے سکتے ہیں جو قطعیات اسلام کے خلاف نہ ہو' ظاہر ہے کہ نبی کا ہر شائبہ شرک سے بری ہونا قطعی و اجماعی مسئلہ ہے۔

لہٰذا آیت جعلالہ شرکاء میں حضرت آدم علیہ السلام وحواء مراد نہیں بلکہ جس طرح محققین اہل تفسیر کی رائے ہے وہی اصوب واسلم ہے کہ حضرت آدم وحواء کا ذکر بطور تمہید تھا پھر ذکر ان کی اولاد کا شروع ہوا کہ ہر ماں باپ اچھی اولاد کی تمنا و دعا تو خدا سے کرتے ہیں اور وہی عطا بھی کرتا ہے مگر بدعقیدہ ماں باپ شرک کی صورتیں اختیار کر لیتے ہیں۔ کوئی اپنے بیٹے کا نام عبدالعزیٰ کوئی عبد مناف' کوئی عبدالشمس' کوئی عبدالدار رکھ دیتا ہے' یہ لوگ ان بتوں کو خدا کا شریک سمجھتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ جو خود ہی مخلوق ہیں وہ کس طرح خدا یا خالق کے شریک بن سکتے ہیں' پھر ایسے نام رکھنا بڑا شرک نہ بھی ہو تو شرک فی التسمیہ تو ضروری ہے' جس سے بچنا چاہئے۔

اس کے علاوہ یہ کہ جس نبی سے کوئی لغزش دنیا میں ہوئی ہے اس کا ذکر احادیث شفاعت میں آیا ہے اور کسی حدیث میں مذکور نہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام قیامت کے روز اس لغزش کا ذکر کریں گے کہ مجھ سے شرک فی التسمیہ ہو گیا تھا اس لئے شفاعت نہیں کر سکتا' البتہ اکل

شجرہ والی لغزش کا ذکر ضرور ملتا ہے۔ اگر مذکورہ بات صحیح ہوتی تو یہ بہت بڑا عذر بن سکتا تھا جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو اس امر کو بھی بطور عذر پیش کر دیں گے کہ مجھے لوگوں نے ابن اللہ کہا تھا' یا خدائی کا شریک بنالیا تھا' حالانکہ اس بات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کسی ادنیٰ اشارے کو بھی دخل نہیں' اسی لئے نہ ان سے اس پر مواخذہ ہوا اور نہ ہوگا۔

شک فی الاحیاء والی لغزش بے بنیاد ہے

اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قول رب ارنی کیف تحیی الموتی کو کسی درجہ میں بھی شک فی الاحیاء وغیرہ میں بھی شک فی الاحیاء وغیرہ پر محمول کرنا غلط ہے' اول تو آگے قال اولم تومن الآیہ سے یہ بات خود صاف ہوگئی کہ کسی شک وشبہ کی بات تھی ہی نہیں جو ایمان کے خلاف پڑتی' دوسرے یہ کہ حدیث شفاعت میں بھی اس کا ذکر نہیں' ورنہ جس طرح دینی مصلحت کے لئے تین مرتبہ توریہ کے کلمات کہہ دینے کو عذر بنائیں گے' اس بات کو بھی پیش کر کے ڈبل عذر کر سکتے تھے۔

اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قول ھذا ربی کی بھی توجیہ ہے کہ وہ بطور ذہنی انتقالات کے یا مقابل کفار ومشرکین کے فاسد مزعومات پر فرمارہے ہیں کہ یہ رب ہے! پھر غروب ہونے پر جتلایا کہ کیا رب کی یہ شان ہوتی ہے؟ اور آخر میں رب حقیقی کا تعارف کرادیا اور واقعی کوئی لغزش ہوتی تو اس کو بھی وہ شفاعت کے وقت سند عذر بناتے'

اسی طرح دوسرے انبیاء علیہم السلام کی لغزشوں کا حال ہے جس کی تفصیل حسب موقع پیش ہوگی' یہاں اتنی بات صاف ہوگئی کہ انبیاء سب معصوم تھے اور وہ خود بھی اپنے کو معصوم ہی سمجھتے تھے یہ اور بات ہے کہ خدائے تعالیٰ کی مبرا ومنزہ ذات گرامی صفات کا شعور جس قدر قوی ہوتا ہے اسی قدر بشری کمزوریوں کا احساس بھی قوی تر ہوجاتا ہے اور اس مقام رفیع میں بڑے بڑوں کو اپنی حسنات بھی سیئات معلوم ہوتی ہیں' لغزشیں تو پھر لغزشیں ہیں۔

یہاں اس امر پر بھی تنبیہ ضروری ہے کہ جن آیات میں انبیاء علیہم السلام کو خطاب کر کے بعض معاصی ورذائل اور کفر وشرک سے اجتناب کرنے کی ہدایت کی گئی ہے ان سے مقصود تو غیر ہی ہیں' صرف نوازش خطاب سے انبیاء کو نوازا گیا ہے۔

چشم سوئے فلک و روئے سخن سوئے تو بود

اس طرز خطاب کے بہت فائدے ہیں' ایک حکمت یہ بھی ہے ان امور کی اہمیت کا زیادہ سے زیادہ احساس کرانا وغیرہ' ایسے ہی انبیاء علیہم السلام کی کثرت توبہ واستغفار بھی ان کی شان عصمت کے خلاف نہیں' کیونکہ توبہ کے معنی رجوع وانابت الی اللہ کے ہیں اس کی ضرورت جس طرح ایک عاصی وخطا کار کو ہے بڑے سے بڑا نبی وولی بھی اس کا محتاج ہے اس لئے اس نسخہ کیمیا کی سب ہی کو ضرورت ہے اور استغفار جس طرح گناہوں سے ہوتی ہے معمولی لغزشوں اور ذرا ذرا سی غفلتوں پر بھی ہوتی ہے چنانچہ نبی امی فداہ ابی وامی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میرے دل پر کبھی غبار آتا ہے' جس کی وجہ سے میں ستر بار استغفار کرتا ہوں' انبیاء علیہم السلام حضور دوام کی دولت سے مشرف ہوتے ہیں کہ ہمہ وقتی خدا کا مشاہدہ اور دھیان ان کو حاصل رہتا ہے' پھر نبی الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تو سب سے زیادہ اعلیٰ وارفع ہے' فرمایا کہ میری آنکھیں سوتی مگر دل جاگتا رہتا ہے' یہی قلب منور جو ہر وقت خدا کے ذکر وتصور میں مستغرق رہتا ہے اگر کبھی اتفاق سے اس پر کوئی لمحہ غفلت کا گزر گیا تو اسی کو غین وغبار سے تعبیر فرمایا' اور اپنے مرتبہ ومقام کے لحاظ سے اس کو ستر مرتبہ استغفار فرما کر پھر سے صاف وشفاف فرمالیا' یہ تھی نبوت کی شان رفیع کہ ذرا سا لمحہ بھی غفلت کا گوارا نہیں' جبکہ غفلت کا لفظ لکھتے ہوئے بھی دل ڈر رہا ہے کہ اس کا مصداق شاید ہزاروں لاکھواں جز بھی وہاں نہ ہوگا۔

سرور دوعالم اروا حنا فداہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں آپ کی امت کے لئے بڑا سبق ہے آج کتنے ہیں جو اپنے آئینہ قلب کو صاف رکھنے کی فکر کرتے ہیں' کیا صادق ومصدوق صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث ان کے سامنے نہیں کہ ایک گناہ کرنے سے دل پر سیاہ نقطہ لگ

جاتا ہے اور توبہ واستغفار سے اگر اس کو صاف نہ کرلیا جائے تو اسی طرح دوسرے اور تیسرے گناہ سے اس پر سیاہ نقطوں کا اضافہ ہوتا رہتا ہے جو معاذ اللہ غفلت میں پڑے رہنے سے کبھی کبھی پورا کا پورا بھی سیاہ ہوجاتا ہے۔

خدا سے ڈرنا چاہئے ارتکاب معاصی وترک واجبات وفرائض سے سخت پرہیز کرنا چاہئے اور اگر کبھی غفلت ہوجائے تو اس کا تدارک فوراً کرنا چاہئے جس کا نہایت آسان نسخہ توبہ واستغفار ہے یہ خدائے تعالیٰ کا امت محمدیہ کے لئے بہت ہی بڑا فضل وانعام ہے کہ مومن کے لئے توبہ واستغفار کا دروازہ ہر وقت کھلا رکھا ہے اگر ایمان کی چنگاری بڑے سے بڑے اور زیادہ سے زیادہ گناہوں کی راکھ میں بھی مستور ہوگئی ہے تو وہ ساری راکھ کا ڈھیر توبہ واستغفار کی پھونک سے دور ہوسکتا ہے اور ایمان کی چنگاری پھر سے پوری آب وتاب سے روشن ہوجاتی ہے التائب من الذنب کمن لاذنب لہ. واللہ الموفق۔

اب ہم بقیہ وجوہ واسباب عصمت انبیاء علیہم السلام کا ذکر کرتے ہیں۔

۴- اللہ تعالیٰ اپنے خاص محافظ دستے فرشتوں کے انبیاء علیہم السلام کی عصمت کے لئے مقرر فرماتے ہیں تاکہ اگر کسی وقت کسی نبی کے لئے حالات ماحول اور نزاکت وقت سے ایسی صورت پیش آجائے کہ بشریت کے تقاضوں کو روک تھام دشوار تر ہوجائے تو اس وقت بھی نبی کا قدم ڈگمگا نہ سکے کیونکہ نبی کی ذراسی لغزش سے امت پر اس کا بہت برا اثر پڑتا ہے حدیث میں آتا ہے کہ آدم علیہ السلام بھول گئے تھے تو ان کی ساری ذریت کو بھول کی بیماری نے پکڑ لیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی لغزش نبی سے ہوجائے تو اسی قسم کی لغزش کا شکار اس کی ساری امت ہوسکتی ہے اس لئے انبیاء کا دامن تمام گناہوں سے پاک وصاف ہی رکھا جاتا ہے اور اس کے لئے قسم قسم کے اسباب حفاظت کے مقرر کردیئے گئے ہیں اس بات کو پوری طرح سمجھنے کے لئے حضرت یوسف علیہ السلام کا پورا واقعہ اپنے سامنے لے آیئے کہ بچپن میں کس طرح گھر کے بہترین ماحول (خاندان نبوت) سے نکلے (جہاں نہایت اعلیٰ تربیت خود اپنے والد بزرگوار سے حاصل ہوسکتی تھی جو بڑے جلیل القدر پیغمبر تھے) عزیز مصر کے گھر پہنچایا اور بغیر ظاہری اسباب کے صرف اپنے الطاف غیبیہ وشان ربوبیت خاصہ سے آپ کی تربیت فرمائی بظاہر زندگی شہزادوں کی طرح عزیز مصر کے محل میں گزر رہی ہے عزیز مصر اور اس کی بیوی زلیخا انتہائی پیار وشفقت سے آپ کو پال رہے ہیں عزیز مصر کی زلیخا کو بڑی تاکید ہے کہ اس بچہ کا نہایت خیال رکھا جائے یہ ظاہری بدن کی تربیت کا سامان ہے اور دل ودماغ کی تربیت خود رب العلمین فرمارہے ہیں اب حضرت یوسف علیہ السلام (جو حسن وجمال میں یکتائے زمانہ تھے) جوں جوں بڑے ہورہے ہیں زلیخا کے دل میں ان کی محبت کی پینگ بڑھ رہی ہے

یزیدک وجہہ حسنا اذا ما زدتہ نظرا

(حسین وجمیل چہرہ پر جتنی زیادہ نظر کی جاتی ہے اتنی ہی اس کے حسن وجمال کی کشش بڑھا کرتی ہے)

اسی لئے حدیث میں آنکھیں سینکنے کی ممانعت ہے اور حسن وجمال کی فتنہ سامانیوں سے بچنے کا واحد اور کیمیا اثر نسخہ یہ بتلادیا گیا ہے کہ ایک نگاہ دفعتہً پڑجائے تو خیر دوسری تیسری نگاہ ڈالنا غضب ہے چہ جائیکہ مستقل سنکائی کی عادت اختیار کرلی جائے تو اس سے بڑا اور برا تو دوسرا مرض ہی نہیں اور سب سے بڑی ایک خرابی یہ ہے کہ ہر کام سے آدمی تھک جاتا ہے ہر چیز سے دل بھر جاتا ہے مگر صرف آنکھ ایسی چیز ہے کہ وہ دیکھنے سے نہیں تھکتی اور نہ کبھی سیر ہوتی ہے غرض اس بیماری کا کوئی علاج نہیں عربی کے مشہور شاعر متنبی نے کہا تھا کہ "خدا میرے محسن ومکرم بادشاہ کو آنکھوں کی فسوں کاریوں سے محفوظ رکھے" کیونکہ ان کا مقابلہ نہ وہ اپنی فوج فراسے کرسکتا ہے نہ جود وسخاوت سے کرسکتا ہے۔ فارسی شاعر نے کہا۔

زنا توانی خود ایں قدر خبر دارم کہ از رخش نتوانم کہ دیدہ بردارم

اکبر الہ آبادی مرحوم بہت مایوس ہیں کہ اس زمانہ میں کم از کم اس حکم شرعی پر عمل بہت کم ہے کیونکہ شریعت نے دونوں طرف بند لگائے تھے جب ایک بند ٹوٹ چکا ہے تو صرف ایک بند سے کام کیسے چلے گا؟ وہ کہتے ہیں۔

نئے طریقوں پہ مقصد شرع کارفرما نہ ہو سکے گا ادھر جو پردہ نہ ہو سکے گا ادھر بھی تقویٰ نہ ہو سکے گا

مگر شریعت کا قانون ہے کہ جتنے زیادہ نامساعد حالات و ماحول میں شرعی حکم پر عمل کیا جائے گا' اتنا ہی اس کا اجر و ثواب بھی بڑھ جائے گا' اس لئے شکست ہمت کا اسلام میں کوئی درجہ نہیں' یہ مردان خدا کا دین ہے یہاں پست ہمتی و کم حوصلگی جرم عظیم ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت یوسف علیہ السلام سے زیادہ آزمائش کس کی ہو سکتی ہے؟

ایک ملکہ حسن و جمال' یکتائے روزگار شاہزادہ حسن و جمال پر بری طرح فریفتہ ہو جاتی ہے' دونوں کی زندگی ایک ہی گھر میں گزر رہی ہے۔ زلیخا بقول غالب ۔

دیدار بادہ حوصلہ ساقی نگاہ مست بزم خیال میکدہ بے خروش ہے

اس ماحول سے فائدہ اٹھانا چاہتی ہے کوئی شرعی و عقلی پابندی اس پر نہیں ہے اکبر مرحوم دیکھتے کہ ایک طرف کا بند پوری طرح شکست ہے' وہ حسن رہ گزر سے ہی ڈر گئے' یہاں حضرت یوسف علیہ السلام کی سرگذشت پڑھتے کہ ایسے نازک ترین موقع پر انہوں نے کس جی داری سے شریعت کو تھاما' کیا ان کی ایمانی' عملی' فکری' عصمت پر ذرہ کے برابر بھی کوئی داغ آسکا؟

ان کے دل و دماغ فکر و نظر کی حفاظت خود رب العالمین فرمار ہے تھے اور اس کے فرشتے پہرہ پر لگے ہوئے تھے خدائی احکام کا پورا تسلط حضرت یوسف علیہ السلام کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا ایسے حالات میں خلاف عصمت کوئی بات کس طرح ہو سکتی تھی' دوسروں کے لئے یہ بات بہت دشوار تھی مگر خدا کے مطیع بندوں اور خصوصیت سے انبیاء علیہم السلام کے لئے ایسے دشوار گزار مرحلے آسان ہو جاتے ہیں وہ ایسے مواقع میں حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو کر اس کی استعانت چاہتے ہیں' زلیخا نے پوری تیاریاں کر کے حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے دام میں پھانسنے کی آخری کوشش کر ڈالی مگر آپ بڑے اطمینان کے ساتھ "معاذ اللہ" کہہ کر خدائی حصار میں داخل ہو گئے' جہاں دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت و تدبیر بیکار محض ہو جاتی ہے۔

آگے کیا ہوتا ہے' اسے بھی سن لیجئے! پہلے ہر دو طرف سے صرف زبانی بات چیت تھی' زلیخا نے پورے اطمینان سے اپنی تدابیر پر بھروسہ کر کے کہا تھا کہ ادھر آیئے! اور حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمادیا کہ یہ بات ممکن نہیں! اس پر بھی زلیخا باز نہ آئی اور پورے عزم و حوصلہ سے عملی قدم اٹھانے کی تدابیر کر ڈالیں' تو دوسری طرف حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کے جال سے نکلنے کی پوری عملی تدابیر اختیار فرمائیں' آگے حق تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ واقعی اس قدر نازک موقع تھا کہ اس کے توڑ میں پیغمبرانہ اولوالعزمی کے ساتھ بشری تدابیر کمزور پڑ سکتی تھیں' چنانچہ اس کمزوری کا احساس حضرت یوسف علیہ السلام کے قول "والا تصرف عنی کیدھن اصب الیھن" سے بھی ظاہر ہوتا ہے) اس لئے ہم نے بھی اپنے طریقہ پر اپنی برہان و حجت دکھلا کر ان کی مدد کی' اس کے بغیر ممکن تھا کہ وہ اس قدر ثابت قدمی نہ دکھا سکتے' اس اگر مگر والی بات سے ہو سکتا ہے کہ آپ اس قسم کا خیال دل میں لائیں کہ پیغمبرانہ عصمت میں بھی رخنہ پڑنے کا امکان ضرور ہے' مگر یہاں ہمیں دکھلانا بھی یہی ہے کہ اگر ایسی سنگین صورت حال بھی پیش آجائے جیسی حضرت یوسف علیہ السلام کو پیش آئی تو نبی کی عصمت کی نگرانی خدا کی بالواسطہ یا بلاواسطہ حفاظت سے بھی ہوتی ہے اور اس قسم کی گارنٹی غیر انبیاء علیہم السلام کے لئے نہیں ہے۔ لہٰذا انبیاء کی عصمت ہر صورت میں بے داغ' بے شک ولاریب ہے۔ وھوالمراد۔

(۵) انبیاء علیہم السلام کو پیدائشی طور پر بہت سے خواص اہل جنت کے دنیا میں بھی حاصل ہوتے ہیں' مثلاً دائمی حیات' دائمی عبادت (کہ قبور میں بھی مشغول عبادت رہتے ہیں' کثرت ازواج :۔ وفات پر اجساد مبارکہ کا عدم تغیر' وغیرہ' لہٰذا اہل جنت ہی کی طرح ان کے لئے دنیا میں عصمت بھی ثابت ہے' واضح ہو کہ جنت و اہل جنت کے بہت سے نمونے دنیا میں دکھائے گئے ہیں بلکہ بعض چیزیں جنت کی دنیا میں اتاردی گئی ہیں' مثلاً مقام ابراہیم' حجر اسود وغیرہ اور حضرت شاہ صاحب قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ دنیا کی کچھ چیزیں جنت میں جائیں گی' مثلاً بیت اللہ' مسجد حرام اور دوسری تمام مساجد جنت کے علاقہ سے تعلق رکھتی ہیں اور سب اسی طرح جنت کی طرف اٹھالی جائیں گی۔ واللہ اعلم۔

عصمت انبیاء کے متعلق حضرت نانوتویؒ کی تحقیق

عصمت انبیاء علیہم السلام کے بارے میں ایک نہایت مکمل و مدلل تحقیق حضرت حجۃ الاسلام مولانا نانوتوی قدس سرہ کے مکتوبات گرامی میں ملتی ہے' اس کا بھی کچھ خلاصہ ملاحظہ کیجئے! آپ کے نزدیک انبیاء کرام علیہم السلام تمام صغائر و کبائر سے قبل نبوت و بعد نبوت ہر زمانے میں معصوم ہوتے ہیں' مندرجہ ذیل ہر دو دلیل آپ کے مکتوب گرامی سے ماخوذ ہیں۔

(۶) قرآن مجید میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت مطلقہ کا امر کیا گیا ہے' جب ہر معاملہ میں آپ کی اتباع ضروری ہوئی تو آپ کی عصمت ضروری ٹھہری' ورنہ معصیت میں بھی اتباع ماننی پڑے گی' جو خدا کا حکم نہیں ہوسکتا۔

حق تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے جن وانس کو صرف عبادت کے لئے پیدا کیا ہے اور ظاہر ہے کہ معصیت عبادت وطاعت کی ضد ہے اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ کے اندر مادہ شیطانی نہیں ہے۔ جس سے معصیتوں کا صدور ہوتا ہے عام انسانوں میں چونکہ مادہ ملکی اور مادہ شیطانی دونوں ہوتے ہیں اس لئے ان سے دونوں کے لوازم وآثار یعنی اچھے و برے اعمال بھی صادر ہوتے ہیں' ملائکہ میں چونکہ صرف نیکی کا مادہ ودیعت کیا گیا ہے' وہ صرف نیک اعمال کرتے ہیں گناہ نہیں کر سکتے' اس کے برعکس شیاطین میں صرف مادہ معصیت وکفر رکھا گیا ہے ان سے کفر و معصیت ہی کا صدور ہوتا ہے' ایمان واعمال صالحہ کا نہیں ہوسکتا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر چونکہ صرف مادہ ملکی ودیعت کیا گیا ہے اس لئے ان سے بھی ملائکہ کی طرح صرف نیکیاں صادر ہوں گی' اس لئے وہ معصوم ہیں' اوران کی کامل اتباع کا حکم دیا گیا ہے اور چونکہ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ انبیاء سابقین کے طریقوں کی پیروی کیجئے' اس سے معلوم ہوا کہ وہ سب بھی معصوم تھے ورنہ یہاں حضور کو ان کی مطلق اتباع واقتدار کا حکم نہ ہوتا۔

حضرت نانوتویؒ نے یہاں اس امر کی بھی وضاحت فرمادی ہے کہ اگرچہ انبیاء علیہم السلام کی ذات میں وہ قوت نہیں ہوتی جو صدور عصیان کا اقتضاء کرتی ہے مگر کسی خارجی وعارضی سبب سے صدور عصیان کا امکان ضرور باقی رہتا ہے اسی لئے قدرت ان کی نگہبان رہتی ہے اور اس قسم کی نافرمانی سے بھی بچالیتی ہے' چنانچہ ارشاد ہوا۔ **"کذلک لنصرف عنه السوء والفحشاء انه من عبادنا المخلصين"** (سورۃ یوسف)

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا کہ اس آیت سے چند فوائد معلوم ہوئے۔

(۱) جو نوع سوء اور فحشاء کی تعریف میں نہ آتی ہو' اس کا صدور کسی عارضی وجہ سے مستثنیٰ ہوسکتا ہے۔

(۲) سوء وفحشاء کا تحقق خارجی اسباب سے یہاں بھی ہوسکتا ہے۔

(۳) اس امکان مذکور کے باوجود قدرت ان کے صدور سے بھی نگہبان رہتی ہے پھر لکھا معصومیت بایں معنیٰ کہ ذات معصوم میں صدور معاصی کا منشا بھی نہ ہو' صرف انبیاء علیہم السلام کا خاصہ ہے اولیاء اللہ کی بھی یہ شان نہیں البتہ بعض آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی بھی حفاظت فرماتے ہیں' تو ان کا درجہ محفوظیت کا ہے' جو معصومیت سے کم تر ہے۔

(۷) قرآن مجید میں ہے **"عالم الغيب ' فلايظهر على غيبه احداً الامن ارتضىٰ من رسول فانه يسلك من بين يديه و من خلفه رصدا** (جن) وہ عالم الغیب ہے' اپنی غیب کی خبریں بجز اپنی پسندیدہ مخلوق رسولوں کے اور کسی کو نہیں دیتا' اوران کی وحی کے آگے پیچھے فرشتوں کے پہرے اور چوکیاں رکھی جاتی ہیں (تاکہ کسی طرف سے شیطان اس میں دخل نہ دے سکیں) معلوم ہوا کہ پیغمبروں کے۔ علوم واخبار میں غلطی کا کوئی امکان نہیں اس کے علاوہ انبیاء کا اپنے تمام اعمال زندگی میں معصوم ہونا وہ بھی اسی آیت سے ثابت ہے' جس کے لئے حضرت نانوتویؒ کا طریق استدلال یوں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام رسولوں کو اپنا برگزیدہ وپسندیدہ فرمایا اور یہاں کوئی قید وشرط بھی نہیں کہ فلاں عمل کے باعث وہ

مرتضٰی ہوئے۔لہٰذا ثابت ہوا کہ وہ اپنی پوری زندگی کے اعمال کی رو سے برگزیدہ وپسندیدہ ہیں اور یہی شان عصمت ہے۔

عظمت وعصمت انبیاء علیہم السلام کی بحث چونکہ نہایت اہم ہے اور مذاہب حقہ کی عظمت وفضیلت وحقیت کا مدار بھی بڑی حد تک اس پر ہے'اس لئے ہم نے یہاں کسی قدر تفصیلی بحث کی' باقی انبیاء علیہم السلام کے مکمل حالات ومناقب وفضائل کے لئے حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہارویؒ کی کتاب ''قصص القرآن'' کا مطالعہ کیا جائے جو چار ضخیم جلدوں میں ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہو چکی ہے اردو زبان میں وہ نہایت بیش قیمت نادر علمی ذخیرہ ہے جو بحمد اللہ کافی احتیاط سے مرتب ہوا ہے۔اس کے بعد گزارش ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے بیان حالات میں ادنیٰ درجہ کی بے احتیاطی یا محض واعظانہ رنگ کی نکتہ آفرینیاں مناسب نہیں' انبیاء علیہم السلام کے بارے میں کوئی بات بھی لکھنی ہو۔ خصوصاً نئی قسم کی تو اس کے لئے نہایت وسیع مطالعہ' کثیر معلومات اور مکمل احتیاط کی ضرورت ہے کہ اکابر سلف کی تحقیقات بھی نظر انداز نہ ہو سکیں' کیونکہ جمہور سلف اور ائمہ محدثین ومفسرین کو چھوڑ کر ایک دو عالموں کی رائے پر کوئی جدید نظریہ قائم کر لینا اور اس کو شرعی دعویٰ کی صورت میں پیش کر دینا بہت سی دینی مضرتوں کا سبب بن سکتا ہے۔

علی الخصوص حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور خاتمہ الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں تو انتہائی احتیاط کی ضرورت ہے' معلوم ہے کہ یہود نصاریٰ نے کس قدر غلط باتیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب کر دی تھیں' جن کا ازالہ قرآن وحدیث میں کیا گیا ہے۔ پھر امت محمدیہ میں بھی کچھ غیر محتاط قلموں سے ایسے مضامین نکل گئے' جن سے فرق باطلہ کو قوت ملی' اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بھی افراط وتفریط ہوئی ہے' جس کے مضر نتائج سب کو آشکار ہیں ہمارے اکابر حضرات دیوبند کی یہ شان تھی کہ ان کی تحریر وتقریر نہایت محتاط ہوتی تھی' حتیٰ کہ مواعظ میں بھی اتنی احتیاط برت گئے جو ہمارے اس دور کے اکثر علماء سے دشوار نظر آ رہی ہے' حضرت تھانویؒ کے مواعظ شائع شدہ ہیں' حضرت علامہ کشمیریؒ اور حضرت عثمانیؒ کے مواعظ بھی اکثر سننے کا شرف حاصل ہوا' مگر آج کل جو سیرت کے جلسوں میں بیان ہوتے ہیں' ان کا رنگ بالکل دوسرا دیکھنے میں نظر آ رہا ہے' جس کا مقصد عوام کو خوش کرنا اور ان کی داد حاصل کرنا معلوم ہوتا ہے۔ آخر اس عوام پسندی کے رجحان سے ہمارا کوئی شعبہ زندگی بھی محفوظ رہ سکے گا یا نہیں؟ ہر وعظ اور تقریر سیرت پر اس کی اجرت اور نذرانے وصول کئے جاتے ہیں اور ایک سے ایک بڑھ کر وصول کرنے کی فکر میں رہتا ہے' کیا یہی ہمارے اکابر واسلاف کی شان تھی' اور کیا ایسے مواعظ وتقاریر سیرت سے عام مسلمانوں پر اچھے اثرات پڑ سکتے ہیں؟ مدارس سے بڑی بڑی تنخواہیں لیتے ہیں' پھر بھی عوام سے گرانقدر نذرانوں کے متمنی رہتے ہیں'

اہل بدعت کی جن باتوں کو ہمارے اکابر نے خلاف تحقیق واحتیاط بتلایا تھا' آج ہم خود اپنی تقاریر وتصانیف میں' ان سے احتیاط کو غیر ضروری سمجھنے لگے ہیں۔

ہمارے حضرت شاہ صاحب قدس سرہ اپنے مواعظ میں یہ جملہ بھی فرمادیا کرتے تھے کہ ''بھائی! عمل تو ہمارے پاس بھی نہیں ہے مگر خدا کا شکر ہے کہ علم صحیح ہے' اس لئے جو بات بتائیں گے وہ دین کی صحیح ترجمانی یعنی ٹکسالی ومعیاری ہوگی۔ کاش! ہم اپنے اس مرکز سے دور نہ ہوں۔ واللہ الموفق والمیسر:۔

بقیہ فوائد متعلقہ حدیث باب

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ حدیث میں ذنب کا ذکر ہے' جو سب سے کم درجہ ہے۔ جس نے معنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات معظم اور شان رفیع کے لحاظ سے غیر مناسب امر کے ہیں' اس سے زیادہ درجہ خطا کا ہے' جو نادرست وناصواب فعل کو کہتے ہیں' اور ان سب کے اوپر معصیت کا درجہ ہے' جو عدول حکمی نافرمانی ہے' اور صغائر وکبائر کی تقسیم بھی اسی میں جاری ہوتی ہے' ذنب وخطا میں نہیں۔

اشکال وجواب

جب انبیاء علیہم السلام سب ہی مغفور ہیں تو پھر زیر بحث آیت وحدیث میں صرف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مغفرت ذنوب کا ذکر کیوں ہوا؟ جواب یہ ہے کہ یہاں تخصیص اعلان مغفرت کے لئے ہے، کیونکہ آپ کے لیے شفاعت کبریٰ اور مقام محمود مقدر ہو چکی ہے لہٰذا دنیا میں اعلان مناسب ہوا، تا کہ قیامت کے ہولناک دن میں آپ کے قلب مبارک کو ڈھارس اور سکون حاصل ہو اور بے تامل شفاعت کبریٰ فرما سکیں، اگر دنیا میں آپ کی مغفرت کا اعلان نہ ہوا ہوتا تو ممکن تھا آپ بھی اپنے ذنوب کو اسی طرح یاد فرما کر عذر فرما دیتے جیسے دوسرے انبیاء علیہم السلام کریں گے۔ چنانچہ اس روز عذر کے ساتھ انبیاء علیہم السلام یہ بھی فرمائیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ! کہ ان کے تمام گذشتہ ذنوب بخشے جا چکے ہیں۔

دوسرا اشکال وجواب

جو ذنوب بعد کو ہونے والے ہیں ان کی مغفرت پہلے سے ہو جانا کیوں کر ہے؟ اس کے کئی جواب ہیں:۔

(۱) اگر چہ مغفرت کا عام مفہوم یہی ہے کہ وجود ذنب کے بعد اس کا وجود ہو، مگر اس طرح بھی ہو سکتا ہے کہ اگر تم سے کوئی ذنب ہو تو ہم اس پر مواخذہ نہیں کریں گے، پس مغفرت بمعنی عدم مواخذہ ہوئی۔

(۲) علم خداوندی میں سب اگلے پچھلے موجود ہیں، کیونکہ اس میں تقدم و تاخر نہیں ہے، پس سب کی مغفرت بھی دفعۃً درست ہے۔

(۳) مغفرت احکام آخرت سے ہے، جہاں سب ذنوب ماضی سے متعلق ہو چکیں گے۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کا ارشاد

کہ وعدۂ مغفرت کا مقتضیٰ عمل واحتیاط ہے، نہ کہ عدم عمل وترک احتیاط اسی لیے حسور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم باوجود مغفرت ذنوب کے بہت زیادہ عبادت فرماتے تھے۔ حتیٰ کہ راتوں کو نوافل میں کھڑے کھڑے پاؤں متورم ہو جاتے تھے صحابہ کرام عرض کرتے کہ آپ کو اس قدر زیادہ عبادت کی کیا ضرورت ہے؟ تو فرماتے، کیا میں خدا کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟!

عتاب نبوی کا سبب

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ زیر بحث حدیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عتاب وغضب کی وجہ یہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں اپنے لیے اعمال شاقہ کے احکام کی درخواست، صحابہ کرام کے لیے ان کے مرتبہ رفیع کے لحاظ سے موزوں نہ تھی، کیونکہ ایسی درخواست فطرت سلیمہ کے خلاف تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ تھی کہ جب صحابہ میں سے کسی سے کوئی غلطی اجتہادی خطا کے درجے کی ہوتی تو کچھ نہ فرماتے، نہ غصہ ہوتے، لیکن کوئی بات خلاف فطرت سلیہ۔ ہو جاتی تو ناگواری اور غصہ کا اظہار فرماتے تھے، اس قسم کی مثالیں آئندہ ذکر ہوں گی۔ انشاء اللہ تعالےٰ اور یہاں صحابہ کرام کی درخواست مذکور کا بے محل اور غیر موزوں ہونا اوپر کی تفصیلات سے واضح ہو چکا ہے۔

''ان اعلمکم'' حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہ جملہ اس طرف اشارہ ہے کہ جس کا علم ومعرفت خداوندی زیادہ ہوتی ہے اس کی عبادت خدا کو زیادہ پسند ہوتی ہے، کیونکہ عبادت نام ہی مطاع کی مرضی کے موافق طاعت کرنے کا ہے۔ حق تعالےٰ کس عبادت سے اور کس وقت، اور کس موقع ومحل میں زیادہ خوش ہوتے ہیں، جتنا علم ان امور کا زیادہ ہوگا تقرب خداوندی بھی ان کے مطابق ادا کرنے سے زیادہ ہوگا، اعمال کی مشقت رضا خداوندی یا تقرب کا معیار نہیں ہے۔

نماز جیسی مقبول وپسندیدہ عبادت بھی غیر وقت مثلاً طلوع وغروب آفتاب کے وقت، خدا کے یہاں قابل رد، ناپسند ہوتی ہے، غرض ان لوگوں کو

اس سے تنبیہ کی گئی جو مشقتوں کے تحمل میں زیادہ فضیلت تلاش کیا کرتے ہیں اور اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ اولیاء اللہ اگرچہ مقدار کے اعتبار سے طاعات وعبادات میں بڑھے ہوئے ہیں مگر کیفیت کے لحاظ سے انبیاء علیہم السلام کے کم اعمال کا پاسنگ بھی نہیں ہوسکتے' مثلاً ترمذی شریف میں حضرت عمیر بن ہانی کے متعلق ماثور ہے کہ وہ ہر دن میں ایک ہزار سجدے کرتے تھے اور ایک لاکھ مرتبہ تسبیح کرتے تھے (باب ماجاء اذا انتبه من الليل)

حضرت امام ابو یوسفؒ کے بارے میں منقول ہے کہ اپنے زمانہ قضا میں ہر روز دوسو رکعت پڑھ لیا کرتے تھے' اسی طرح اولیاء اللہ کی بڑی بڑی عبادات وریاضات کے حالات منقول ہوئے ہیں۔

وفقنا الله لما يحب و يرضىٰ

باب من كره ان يعود في الكفر كما يكره ان يقذف في النار من الايمان.

(جو کفر طرف لوٹنے کو ایسا ہی برا سمجھے' جیسا آگ میں ڈالے جانے کو تو یہ بھی ایمان کی علامت ہے)

۲۰ - حدثنا سليمان بن حرب قال حدثنا شعبة عن قتادة عن انس عن النبي صلى الله عليه وسلم قال ثلاث من كن فيه وجد حلاوة الايمان من كان الله و رسوله احب اليه مما سواهما و من احب عبدا لايحبه الا لله و من يكره ان يعود في الكفر بعد اذا نقذه الله كما يكره ان يلقىٰ في النار

ترجمہ:۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص میں تین خصلتیں ہوں گی وہ ایمان کی حلاوت ولذت پالے گا جس شخص کو اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم ساری کائنات عالم سے زیادہ محبوب ہوں اور جس شخص کو کسی سے محبت ہو تو وہ صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہو اور جس کو کفر کی طرف لوٹنا ایسا ہی برا معلوم ہو جیسا آگ میں ڈالا جاتا۔

تشریح:۔ یہ حدیث اور اس کی تشریح وغیرہ پہلے گزر چکی' کفر کی طرف لوٹنے کا یہ مطلب نہیں کہ اس سے مقصود صرف نیا اسلام لانے والا ہی ہو بلکہ وہ بھی اس میں داخل ہے جو پہلے ہی سے مسلمان تھا کیونکہ جب اسلام لانے والا کفر کی طرف لوٹنے سے اس قدر متنفر و بےزار ہوگا تو جو شخص اباً عن جد مسلمان چلا آرہا ہے اس کو تو کفر و شرک سے اور بھی زیادہ بیزار ہونا چاہئے اور اس کو ایمان کی حلاوت بھی زیادہ حاصل ہونی چاہئے۔

افسوس ہے کہ آج کل مسلمانوں کو دین وعلم دین سے ناواقفیت ولاپروائی کے باعث ایمان واعمال صالحہ سے بےتعلقی عام ہوتی جارہی ہے اور اس لئے وہ ایمان واعمال کی قدر وقیمت بھی نہیں پہچانتے' اور بعض نومسلموں کو دیکھا جاتا ہے کہ وہ چونکہ پورے علم وبصیرت کے ساتھ ایمان و اسلام قبول کرتے ہیں' وہ ایمان واعمال کے زیادہ گرویدہ نظر آتے ہیں' حقیقت یہ ہے کہ بغیر علم ومعرفت کے کوئی ترقی صحیح وپائیدار نہیں ہوسکتی۔

باب تفاضل اهل الايمان في الاعمال (اعمال کی وجہ سے اہل ایمان کا ایک دوسرے سے بڑھ جانا)

۲۱. حدثنا اسمٰعيل قال حدثني مالك عن عمر و بن يحي المازني عن ابيه عن ابي سعيد ن الخدري عن النبي صلى الله عليه وسلم قال يدخل اهل الجنة الجنة و اهل النار النار ثم يقول الله اخرجو من كان في قلبه مثقال حبة من خردل منْ ايمان فيخرجون منها قد اسودو افيلقون في نحر الحيا او الحياة شك مالك فينبتون كماتنبت الحبة في جانب السيل الم ترالها تخرج صفر آء ملتوية قال وهيب حدثنا عمر و الحياة وقال خردل من خير

ترجمہ:۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا اہل جنت' جنت میں اہل دوزخ دوزخ میں داخل ہوجائیں گے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرمائیں گے جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر (بھی) ایمان ہے اس کو (دوزخ سے) نکال لو۔ تب (ایسے لوگ) دوزخ سے نکال لئے جائیں گے' وہ جل کر کوئلے کی طرح سیاہ ہوں گے' پھر وہ زندگی کی نہر میں ڈالے جائیں گے' یا بارش کے پانی میں (یہاں راوی کو شک ہوگیا کہ اوپر کے راوی نے کون سا لفظ استعمال کیا) اس وقت وہ دانے کی اگ آئیں گے (یعنی تر وتازہ وشاداب ہو

جائیں گے) جس طرح سیلاب کے کنارے دانہ اگ آتا ہے' کیا تم نے نہیں دیکھا کہ وہ دانہ زردی مائل پیچ در پیچ نکلتا ہے۔

وہیب نے کہا' ہم سے عمرو نے (حیا کی بجائے) حیاۃ اور (خردل من ایمان کی بجائے) خردل من خیر (کالفظ) بیان کیا۔

تشریح:۔ حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ یہاں حدیث ابی سعید خدری رضی اللہ عنہ میں تفاضل کا لفظ ہے' جو اشخاص سے متعلق ہوتا ہے چنانچہ قرآن مجید میں اس کا استعمال انبیاء علیہم السلام کے بارے میں ہوا ہے کیونکہ ان میں کمی ونقص نہیں ہے اور آئندہ حدیث انس رضی اللہ عنہ میں (جو ۱۴۲ پر آ رہی ہے) باب زیادۃ الایمان و نقصانہ" ذکر کیا ہے کیونکہ زیادتی وکمی معانی میں ہوتی ہے' اشخاص میں نہیں۔ پس یہاں عاملین پر نظر کر کے تفاضل کا لائے اور وہاں نفس ایمان پر نظر کر کے زیادہ ونقص لائیں گے' دوسری بات یہ ہے کہ یہاں اعمال کے لحاظ سے تفاضل بتلایا ہے اگرچہ ایمان میں برابر ہوں اور وہاں ایمان میں کمی وزیادتی بتلانی ہوگی' پھر خواہ اعمال میں بھی متفاضل ہوں یا نہ ہوں۔

یہ خطاب اللہ تعالیٰ کس سے فرمائیں گے کہ دوزخ سے نکال لو' علامہ قسطلانیؒ نے تصریح کی ہے کہ مراد ملائکہ ہیں' چنانچہ ایک روایت میں للملائکۃ کا لفظ بھی موجود ہے کہاں سے نکال لو اس کو بھی علامہ موصوف نے لکھا کہ مراد دوزخ سے نکالنا ہے جیسا کہ اصیلی کی روایت میں من النار کا لفظ زائد روایت ہوا ہے' پھر یہ نکالنے کا حکم ان لوگوں کے لئے ہوگا جنہوں نے توحید کے ساتھ کوئی قلبی نیکی (حسن نیت وغیرہ) کی ہوگی کیونکہ ایک روایت میں یہ زیادتی موجود ہے اخرجوا من قال لا الٰہ الا اللہ و عمل من الخیر مایزن کذا (نووی قسطلانی فی شروح البخاری صفحہ ۱/۱۵۷)

یہی حدیث ابی سعید خدریؓ مسلم شریف میں زیادہ تفصیل سے مروی ہے' جس سے معلوم ہوا کہ اہل جنت جنت میں پہنچ کر حق تعالیٰ کی جناب میں عرض کریں گے کہ اے رب! ہمارے بہت سے ساتھی تھے' جنہوں نے دنیا میں ہمارے ساتھ نمازیں پڑھی تھیں۔ روزے رکھے تھے' حج کیا تھا' اور آج وہ ہمارے ساتھ جنت میں نہیں آئے' حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ تم ان کو دوزخ سے نکال لاؤ۔

جا کر پہچان لو وہ ان لوگوں کو حق تعالیٰ کی اجازت سے نکال لائیں گے' اور عرض کریں گے کہ جتنے ظاہری اعمال کے اعتبار سے ہم پہچان کر نکال کر لا سکتے تھے' نکال لائے' اور اب کوئی ایسا نہیں رہا ہے۔ یہ غالباً وہ لوگ ہوں گے جن کے ظاہری اعمال بکثرت ہوں گے' مگر معاصی کے باعث دوزخ میں ڈال دیے گئے ہوں گے' اس کے بعد حق تعالیٰ ہی کے فرمانے سے وہ اہل جنت دوسری بار ان کو بھی نکال لائیں گے' جن کے بہت تھوڑے نیک عمل ہوں گے یا صرف اکا دکا عمل ہوگا' جو پہلی بار میں نظرانداز ہو گیا ہوگا۔ تیسری بار میں حق تعالےٰ فرمائیں گے کہ اچھا! اب تم پھر جاؤ اور ان لوگوں کو بھی نکال لاؤ جن کے ظاہری اعمال کچھ نہیں تھے' مگر ان کے قلبی اعمال (کوئی اچھی نیت' اچھے ارادے وغیرہ ہوں گے' علامہ نووی نے یہ بھی لکھا کہ حق تعالیٰ ان کو قلبی اعمال کی معرفت کے لیے علامت بھی بتلادیں گے' اور وہ ایسے لوگوں کو بھی نکال لائیں گے' چوتھے اور آخری مرتبہ میں وہ لوگ نکالے جائیں گے' جن کے پاس نہ ظاہری اعمال کم یا زیادہ ہوں گے' نہ اعمال قلب ہوں گے' صرف اقرار توحید یا ایمان کا کچھ حصہ ان کے پاس ہوگا' حدیث میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حق تعالےٰ سے درخواست کریں گے کہ بارالہا! مجھے اجازت دیجئے کہ ان لوگوں کو نکال لاؤں حق تعالےٰ جواب دیں گے کہ یہ کام آپ کے لیے نہیں ہے' پھر حق تعالیٰ اپنی ارحم الراحمینی کا اظہار فرمائیں گے اور ایسے لوگوں کو خود ہی نکالیں گے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں. فیقبض اللہ قبضۃ من النار فیخرج منھا قوما لم یعملوا خیر اقط (حق تعالیٰ اپنا مٹھ بھر کر دوزخ سے ایسے لوگوں کو نکال لیں گے' جنہوں نے کسی قسم کی بھی کوئی نیکی نہ کی ہوگی' یعنی علاوہ ایمان یا کلمۂ توحید کے) کیونکہ بغیر ایمان کے تو کوئی صورت نجات کی ہوگی ہی نہیں' یہ طے شدہ اور یقینی وحتمی بات ہے۔

جہنم سے نکلے ہوئے لوگ چونکہ جھلس کر کالے سیاہ ہو گئے ہوں گے' اس لیے جنت کے دروازہ پر جو نہر حیات جاری ہوگی اس میں ان کو غسل دیا جائے گا' جس سے جہنم کے تمام اثرات زائل ہو جائیں گے' اور وہ لوگ اس آب حیات کے اثر سے فوراً ہی ایک نئی سرسبز وشاداب زندگی سے بہرہ مند ہو جائیں گے۔

بحث ونظر: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ تراجم بخاری میں سے یہ ترجمہ وعنوان باب مشکل ترین تراجم میں سے ہے جس کی چار وجہ ہیں۔

(۱) یہ حدیث اور حدیث انسؓ (صفحہ نمبر ۴۲) دونوں کا مضمون ایک ہی ہے (اگرچہ اصطلاح محدثین میں دو اس لیے ہوگئیں کہ ہر ایک کا راوی الگ صحابی ہے اور اسی اصطلاح کے تحت مسند احمد کی احادیث کا شمار تیس ہزار کہا گیا ہے۔

پھر باوجود مضمون واحد ہونے کے ترجمے الگ الگ کیوں قائم کئے گئے؟

(۲) امام بخاریؒ نے جو یہاں حضرت ابوسعیدؓ کی حدیث ذکر کی ہے اس میں عمل کا کوئی ذکر نہیں' بلکہ صرف ایمان کا ذکر ہے' اور حدیث انسؓ میں خیر یعنی عمل کا ذکر ہے' پس یہاں کا ترجمہ وہاں اور وہاں کا یہاں ہونا چاہئے تھا؟

(۳) امام بخاریؒ نے یہاں اصل میں ایمان کا لفظ رکھا اور خیر کا لفظ بطور متابع لائے' اور حدیث انسؓ میں برعکس کیا' حالانکہ ترجمہ کی مناسبت سے برعکس صورت ہونی چاہئے تھی؟

(۴) زیادۃ ونقص ایمان کی بحث پہلے گزر چکی ہے' پھر یہاں اس کا اعادہ کیوں کیا گیا؟

حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ بھی فرمایا کہ اس موقع پر شارحین بخاری نے جیسی ضرورت تھی پر مغز کلام نہیں کیا' حافظ ابن تیمیہؒ نے اپنی کتاب میں مسئلہ ایمان پر خوب تفصیل سے لکھا ہے لیکن اشکالات مذکورہ پر کچھ نہیں لکھا' کیونکہ انہوں نے حل تراجم ابواب بخاری سے کوئی تعرض نہیں کیا ہے' وہ اس طرف توجہ کرتے تو اچھا لکھ سکتے تھے' اس کے بعد حافظ ابن حجرؒ کے جوابات لکھے جاتے ہیں۔ پھر حضرت شاہ صاحبؒ کے جوابات ذکر ہوں گے۔

اشکال اول وثانی کا جواب حافظ نے یہ دیا کہ دونوں حدیث میں زیادۃ ونقص ایمان وتفاضل اعمال کے لیے دلیل ملتی ہے اس لیے امام بخاری نے ہر احتمال پر ترجمہ قائم کردیا۔

پھر حدیث ابی سعیدؓ کو تفاضل اعمال کے ترجمہ سے خاص کردیا' کیونکہ اس کے اندر تفاوت مراتب ایمان کا ذکر نہیں تھا اس کے لیے زیادۃ ونقصان والا ترجمہ مناسب نہیں تھا' البتہ یہ ترجمہ حدیث انسؓ کے لیے موزوں تھا' کہ اس میں تفاوت اختلاف وزن شعیرہ' برہ' ذرہ کے لحاظ سے تھا' چوتھے اشکال کا جواب حافظ نے یہ دیا ہے کہ پہلے ایمان میں زیادتی ونقصان کا ذکر تھا اور یہاں نفس تصدیق میں زیادتی ونقصان کا ذکر کر رہے ہیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ امام بخاریؒ نے کسی جگہ بھی نفس تصدیق کے لحاظ سے ایمان میں زیادتی کا ذکر نہیں کیا ہے' ان کا مختار مسلک تو ایمان کو مرکب مان کر زیادتی کا قول ہے خواہ اجزاء کے لحاظ سے ہو یا اسباب کے اعتبار سے' اسی لیے انہوں نے کہیں تصدیق و اعمال میں تقابل نہیں کیا غرض حدیث انسؓ میں امام بخاریؒ کے نزدیک زیادتی ونقصان باعتبار مجموعہ کے ہے' باعتبار نفس تصدیق کے نہیں' لہذا حافظ کی توجیہ مذکور قائل کی منشا کے خلاف ہے' اسی طرح حافظ کا جواب اشکال اول وثانی سے بھی چلنے والا نہیں ہے' کیونکہ تفاوت موزونات اور ذکر مراتب حدیث ابی سعید میں بھی حسب روایت مسلم موجود ہے' اگر کہا جائے کہ تفاوت مذکور روایت بخاری میں تو نہیں ہے تو ہم کہیں گے کہ روایت بخاری میں تو اعمال کا بھی ذکر نہیں ہے' پھر اس پر امام بخاری کا ترجمہ تفاضل اعمال کا قائم کرنا کیسے درست ہوگا؟

حضرت شاہ صاحب کے بقیہ جوابات

اس کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ کے جوابات ملاحظہ فرمائے۔

(۱) امام بخاریؒ نے حدیث ابی سعیدؓ کو تفاضل اعمال کے ساتھ دو وجہ سے خاص کیا' اول اس لیے کہ انہوں نے دونوں مفصل روایتوں پر نظر رکھی' اور چونکہ مسلم کی روایت ابی سعید میں اعمال کا بھی ذکر موجود ہے' اس لیے ترجمہ تفاضل اعمال کا قائم کیا' اور حدیث انس کے کسی طریقہ میں بھی ذکر اعمال نہیں ہے' اس لیے وہاں ایمان کا بھی ذکر موجود ہے' اس لیے ترجمہ تفاضل اعمال کا قائم کیا' اور حدیث انس کے کسی

طریقہ میں بھی ذکر اعمال نہیں ہے' اس لیے وہاں ایمان کی زیادتی ونقصان کا ترجمہ مناسب ہے' دوسرے یہ کہ امام بخاری نے حدیث ابی سعید میں لفظ ایمان ذکر کیا۔ اور اس کے بعد اس کی مراد متابعت بالخیر کے ذریعہ عمل متعین کی' گویا اس امر پر متنبہ کیا کہ مراد امراتب ایمان سے مراتب اعمال ہیں' پس لفظ ایمان مفسر اور لفظ خیر اس کا مفسر ہوا' امام بخاری کے یہاں ایمان کا اطلاق خیر پر جائز ودرست ہے اور حدیث انس میں برعکس کیا کہ لفظ خیر کو اصالتاً ذکر کیا' اور اس کی مراد متابعت لفظ ایمان سے متعین کی' یہ جواب اول وثانی سے ہوا۔

(۲) تیسرے اشکال کا جواب یہ ہے کہ امام بخاریؒ اپنے علم ووجدان کے مطابق طریقے اختیار کرتے ہیں' ہر مقام پر متعین صحیح وجہ نہیں معلوم ہوسکتی اور یہاں بھی ہم اس کا تعین نہیں کرسکے۔

(۳) چوتھے اشکال کا جواب سہل ہے کہ پہلے ایمان کی زیادۃ ونقص پر قصداً کوئی ترجمہ نہیں لائے تھے' استطراداً بیان ہوا تھا' اسی لئے کوئی حدیث اس کے لئے ذکر نہیں کی تھی' یہاں قصداً لائے اور اپنے طریقہ پر استدلال کے لئے حدیث بھی روایت کی پھر فرمایا کہ میرے نزدیک دونوں حدیث میں خیر ایمان سے زائد چیز ہے لیکن حدیث الباب میں وہ اعمال قلب سے ہے اور حدیث انس میں متعلقات ایمان سے ہے جو نور ایمان اور انشراح وانبساط کی کیفیت ہے' نہ کہ عمل قلبی' حسن نیت وغیرہ دوسرے شارحین بخاری نے دونوں میں ایک ہی طریقہ پر سمجھا ہے۔ نیز یہ کہ دونوں حدیث کے درمیانی مراتب تو ایک دوسرے کے ساتھ آگے پیچھے بے ترتیب باہم جڑتے ہیں' مگر آخری مرتبہ دونوں میں مشترک ہے' یعنی حدیث ابی سعید میں جن لوگوں کے سب سے آخر میں جہنم سے نکالے جانے کا ذکر ہے' بعینہ ان ہی لوگوں کا ذکر حدیث انس میں بھی ہے (جن کے پاس نہ کوئی عمل اعمال جوارح سے ہوگا نہ کوئی نیکی اعمال قلب سے ہوگی' نہ ثمرات ایمان میں سے کچھ ان کے ساتھ ہوگا' اور ارحم الرحمین ان کو محض اپنے فضل وشان انعام خصوصی سے بلا عمل وخیر کے جنت میں داخل فرمادیں گے۔

شیخ اکبرؒ کی رائے

جن لوگوں کو بلا عمل کے سب سے آخر میں جہنم سے نکالا جائے گا' ان کے بارے میں' چونکہ صرف کلمہ طیبہ کا قائل ہونا ذکر ہوا ہے' اس لیے شیخ اکبر نے یہ رائے قائم کی کہ وہ لوگ اہل فترت ہیں جن کو کسی رسول ونبی کا زمانہ نہیں ملا۔ لہذا ان کے لیے ایمان بالرسول کی شرط نہ رہی' صرف توحید ہی نجات کے لیے کافی ہوگی۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ شیخ اکبرؒ کی رائے مذکور اس موقع پر درست نہیں ہے' کیونکہ وہ لوگ اہل توحید ورسالت ہی ہوں گے' صرف کلمہ کا ذکر اس لیے ہوا ہے کہ کلمہ طیبہ یا کلمہ اخلاص اسلام کا شعار وعنوان بن چکا ہے' پس کلمہ کا ذکر شہادت رسالت کی تصریح سے مستغنی کردیتا ہے' اور فرمایا کہ حدیث قوی اس بارے میں وارد ہے کہ اہل فترت کا محشر میں امتحان لیا جائے گا' اس طرح کہ ان کو حکم ملے گا اپنے آپ کو دوزخ میں ڈال دیں' جو شخص فرمانبرداری کرے گا وہ نجات پائے گا اور جو انکار کرے گا وہ ہلاک ہوجائے گا۔

اسی طرح جن لوگوں نے اس حدیث سے یہ سمجھا ہے کہ وہ لوگ صرف قائل بالکلمہ ہوں گے' تصدیق باطن ان کے پاس نہ ہوگی انہوں نے بھی غلطی کی ہے' کیونکہ صرف قول بلا تصدیق قلبی کا شرعاً کوئی اعتبار نہیں ہے۔

لہٰذا مراد وہی لوگ ہیں جن کے پاس ایمان اور تصدیق بالشہادتین تو ضرور ہوگی' مگر کوئی عمل نہ ہوگا اور وہ صرف کلمہ توحید کی برکت سے جہنم سے آزاد ہوکر دخول جنت کا شرف حاصل لیں گے۔

امام بخاریؒ کے استدلال پر ایک نظر

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اس امر پر سب شارحین کا اتفاق ہے کہ خیر سے مراد دونوں حدیث میں نفس ایمان پر زائد چیز ہے' کیونکہ قرآن مجید میں ''او کسبت فی ایمانھا خیرا'' وارد ہے' جو اس امر کی واضح دلیل ہے کہ خیر سے مراد عمل زائد علی الایمان ہے' ایسے

ہی فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ و من یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ بھی اس کی دلیل ہے لیکن اکثر شراح نے خیر سے مراد وہ عمل لیا ہے جو جوارح قلب کسی سے بھی صادر ہو۔ اور ہم کہتے ہیں کہ خیر سے مراد اعمال قلبیہ یا آثار ایمان میں اعمال جوارح نہیں ہیں کیونکہ اعمال جوارح والوں کو تو پہلے ہی نکال لیا جائے گا اس کے بعد حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ اب ان کو بھی نکال لو جن کے قلب میں کوئی حصہ بھی خیر کا ہو۔

تاہم یہ بات ثابت ہوگئی کہ یہاں خیر سے مراد سب کے نزدیک امر زائد علی الایمان ہے تو یہاں سے زیادۃ ونقصان ثابت کرنا بھی نفس ایمان میں زیادۃ ونقصان کو ثابت نہ کرے گا بلکہ خیر میں کرے گا جو نور ایمان ہے اور زائد علی الایمان شاید امام بخاری اس نور ایمان کو بھی ایمان ہی کا ایک جز سمجھتے ہیں جس طرح اعمال وغیرہ کو مگر یہاں تو اس ایمان سے بحث ہو رہی ہے جو مدار نجات ہے۔ اور جب جہنم سے وہ لوگ بھی نکال لیے جائیں گے جن کے پاس کوئی عمل یا خیر بھی نہ ہوگی تو صاف طور سے واضح ہوا کہ مدار نجات یہی کلمہ اخلاص ہے اور وہی ایمان بھی ہے جس میں زیادتی ونقصان نہیں ہوتا جو ائمہ حنفیہ اور دوسرے محققین کی رائے ہے۔ (تفصیل پہلے گزر چکی ہے)

نکتہ بدیعہ

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ ان لوگوں کے بارے میں صرف توحید کا ذکر اور شہادت رسالت کا بیان نہ فرمانا اور ارحم الراحمین جل ذکرہ کا ان کے اخراج کے لیے اختصاص وانفراد اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ صرف اس امت یا کسی دوسری ایک امت کے افراد نہ ہوں گے بلکہ تمام امتوں میں سے ہوں گے لہٰذا ان کی صرف جہت عبودیت کی رعایت کی گئی امتیت کا لحاظ نہیں کیا گیا جو رسولوں کے اعتبار سے ہوتی ہے پس مقررہ اصطلاحی کلمہ ذکر کیا گیا یعنی کلمہ توحید کلمہ متبدلہ بابتہ شہادت رسالت حذف کر دیا گیا۔

یہ ایسا ہی ہے جیسے قول باری تعالیٰ و ما ارسلنا من قبلک من رسول الا نوحی الیہ انہ لا الہ الا انا فاعبدون میں صرف توحید کا ذکر ہوا حالانکہ وہ سب رسول اپنی اپنی رسالت کا اقرار بھی کرایا کرتے تھے کیونکہ ایسا کوئی کلمہ مقررہ متعینہ نہیں تھا جس سے ہر نبی کی رسالت کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا۔

پھر یہ اس لیے بھی منقول ہے کہ محشر میں جب انبیاء ملائکہ وصالحین کی شفاعتوں سے نامعلوم تعداد جہنم سے نکالی جا چکے گی تو حق تعالیٰ کی رحمت عامہ کے بعد رحمت خاصہ کا ظہور بھی ہونا چاہئے جس کا درجہ سب کی شفاعتوں سے اوپر اور وراء الوراء ہے کہ وہ الرحم الرحمین' ابر البارین ' اکرم الاکرمین ' واجود الجوادین ہے اسی لیے وہ اپنے فضل خاص سے ایسے لوگوں کو جہنم سے نکال کر داخل جنت فرمائے گا جن کا کوئی عمل خیر نہ ہوگا جس کی وجہ سے کسی کو شفاعت کا موقع مل سکے چنانچہ پہلے اشارہ بھی ہوا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صرف توحید والوں کے لیے شفاعت کرنے کا اجازت طلب بھی کریں گے تو حق تعالیٰ شانہ فرمادیں گے کہ یہ آپ کا حق نہیں غرض اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو نکالیں گے جن کے لیے شافعین کی شفاعت بھی نہیں چل سکتی اور ایسے لوگوں کا نام بھی الگ ہی ہوگا یعنی عتقاء اللہ (خدا کے آزاد کیے ہوئے) کیونکہ وہ محض اس کی ذات منبع الصفات کے اسم مبارک کی وجہ سے آزاد ہوں گے۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ یہاں اس نکتہ انوریہ کے ذکر کی برکت سے یہ بات سانح ہوئی کہ جیسے پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ حق تعالیٰ ان لوگوں کو خود ہی ایک مٹھ بھر کر نکالیں گے تو گو مقدار تو شفاعۃ الشافعین کے ذریعہ نکلنے والوں کی بھی کہیں ذکر نہیں ہوئی وہ خدا ہی کے علم محیط میں ہے مگر سمجھ میں یہ بات آرہی ہے کہ مقدار ان ''عتقاء اللہ'' کی بھی بہت بڑی ہوگی۔ خدا کی مٹھ کا اندازہ کون کر سکتا ہے؟ مگر لفظ بہت بڑا ہے جس کی نسبت سب بڑوں کے بڑے کی طرف ہو رہی ہے اس لیے کیا عجب ہے کہ یہ تعداد پہلے نکالے جانے والوں سے بھی بڑھ جائے لہٰذا ''و رحمتی وسعت کل شیء''۔ اور سبقت رحمتی علی غضبی'' سے فائدہ اٹھانے والے بھی قسمت کے بہت بیٹے

نہیں رہیں گے۔ و کلنا نو جور حمتک یا ربنا و نخشی عذابک۔ ان عذابک بالکفار ملحق۔

حضرت شاہ صاحبؒ علاوہ وجہ مذکور کے تین وجوہ اور بھی حدیث میں ذکر کلمہ اخلاص وحذف شہادت رسالت کے متعلق بیان فرماتے تھے ان کو بھی بتکمیل فائدہ کے لیے درج کیا جاتا ہے۔

(۲) فرمایا کلمہ اخلاص (لا الا اللہ) شرک فی الذات کی نفی کے لیے نہیں بلکہ شرک فی العبادۃ کے استیصال کے لیے ہے جس پر تمام انبیاء علیہم السلام کی دعوت وتبلیغ مبنی ہے کیونکہ منکرین ربوبیت یا مشرکین فی الذات ہر زمانہ میں بہت ہی کم تعداد میں رہے ہیں لہٰذا اس کلمہ سے مقصود شرک فی العبادۃ ہی کا رد تھا' حق تعالیٰ نے ان مشرکین کا قول نقل فرمایا "ما نعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفیٰ" یعنی خدا کو تو واحد مانتے تھے مگر ساتھ ہی یہ سمجھتے تھے کہ معبودان باطل کی عبادت سے خدا کا تقرب حاصل ہوگا۔ نیز فرمایا "فاذا رکبوا فی الفلک دعوا اللہ مخلصین لہ الدین" اور فرمایا "و اذا قیل لھم لا الہ الا اللہ یستکبرون" معلوم ہوا کہ استکبار تھا جحود نہیں تھا یعنی اس کلمہ کا سرے سے انکار نہ تھا' کیونکہ استکبار علم کے بعد ہوتا ہے۔

ایمان وکفر امم سابقہ میں

دوسری اہم بات یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی امت سے قبل کی امتوں میں صرف ایمان تھا' کفر بالکل نہ تھا' اور آپ سب سے پہلے کفر کے مقابلہ پر مبعوث ہوئے ہیں پھر حضرت ابرہیم علیہ السلام قوم نمرود کے لیے بھیجے گئے۔ وہ لوگ شرک فی العبادۃ میں مبتلا تھے۔ حضرت عیسیٰ موسیٰ علیہما السلام مقابلہ کفر کے لیے مبعوث نہیں ہوئے بلکہ بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے جو اپنی قوم کے اعتبار سے مسلمان تھے کیونکہ وہ سب حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد میں تھے' پھر سب کے بعد حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے جب کہ انبیاء سابقین علیہم السلام کے دینی و علمی آثار محو ہو چکے تھے' کلمہ اخلاص کی اصل وحقیقت بھی لوگوں کے دلوں سے نکل چکی تھی۔ اور اس کو جاننے پہچاننے والے بھی باقی نہ رہے تھے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات وخدمات

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر سے اس کلمہ طیبہ کا احیاء کیا' لوگوں کے دلوں میں اس کی صحیح معرفت ڈالی اور رب حقیقی کا مکمل تعارف کرایا' کفر وشرک کی ایک ایک جڑ وشاخ کی نشان دہی فرما کر ان کو بیخ وبن سے اکھاڑا' غرض احیاء واعلاء کلمۃ اللہ کی ایسی نمایاں خدمات انجام دیں کہ اولیں وآخرین میں ان کی نظیر نہیں مل سکتی' اور اب جن لوگوں نے بھی اس کلمہ اخلاص کو جانا پہچانا' اور اس کے قائل ہوئے وہ سب حضور اکرم کی بدولت اور آپ ہی کی تقلید واقتداء میں ہے۔ اسی لیے اس کلمہ کا قائل ہونا شہادت رسالت کو بھی مستلزم ہے اور اسی پر مسلم شریف کی مشہور حدیث بھی محمول ہے "من قال لا الہ الا اللہ دخل الجنۃ" کیونکہ بدوں شہادت رسالت کے اس کا کوئی معنی نہیں' بلکہ مقصد یہی ہے کہ جو شخص حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تقلید واقتداء میں کلمہ کا قائل ہوگا وہ جنت میں داخل ہوگا' جب یہ کلمہ مذکورہ اس تقریب وتعارف سے کہا تو اقرار وشہادت رسالت خود ہی حاصل ہے' اس لیے علماء امت نے فیصلہ کیا ہے کہ جو شخص اس کلمہ کو بدوں تقلید رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کہے گا' اس کا ایمان صحیح نہیں' اس تفصیل سے دوسری وجہ حدیث میں حذف شہادت رسالت کی معلوم ہوئی۔

(۳) صیغہ شہادت (اشھد ان لا الہ الا اللہ) پر جہت ایمان کا غلبہ ہے اور وہ عام اذکار میں سے نہیں ہے بخلاف کلمہ اخلاص لا الہ الا اللہ) کے کہ اس پر جہت ذکر بھی ہے' پس شہادت توحید در رسالت ذکر نہیں بلکہ ایمان ہے۔ اسی شہادت توحید کے ساتھ شہادت رسالت بھی ملائی جاتی ہے' کیونکہ ایمان بدوں اس کے مکمل نہیں ہو سکتا' اور کلمہ اخلاص (بدوں لفظ شہادت) میں دوسرا جز وکم بولا جاتا ہے' کیونکہ وہ اذکار میں شامل ہوتا ہے اور مقصود اصحاب ذکر ہوتے ہیں۔

پس حضوراکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جوحق تعالیٰ سے کلمہ گولوگوں کے بارے میں اجازت طلب کی تھی اس سے بھی مقصوداس ذکروالے تھے جنھوں نے شہادت توحید ورسالت دی تھی۔ یہاں اصحاب ذکر سے مراد وہ لوگ نہیں ہیں جو بطور ورد اس کلمے کو پڑھتے ہیں کیونکہ وہ اصحاب الاعمال ہیں غرض قول بالکلمہ مسلمانوں کے لیے بطورعنوان ہے اورعنوان مشہور بول کر معنون ومصداق مخصوص مرادلیا کرتے ہیں پھر یہ عنوان یہاں اس لیے بھی اختیار کیا گیا تا کہ ان لوگوں کے جہنم سے بغیر کسی عمل وخیر کے نکلنے کی وجہ کی طرف بھی اشارہ ہوجائے۔

(۴) کلمہ اخلاص (لا الہ الا اللہ) کا دور دورہ ابدالآباد تک باقی رہے گا (کیونکہ اذکار جنت میں بھی رہیں گے) اوپر ذکر ہوا کہ مذکورہ بالا کلمہ میں جہت ذکر بھی ہے بخلاف ''محمد رسول اللہ'' کے کہ اس میں صرف جہت ایمان ہے جہت ذکر نہیں ہے ذکر کی صورت حضوراکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں بصورت درودوسلام ہے کلمہ مذکورہ (محمد رسول اللہ) کی صورت میں نہیں ہے لہٰذا اس کلمہ کا دور بھی اس دنیوی زندگی کے دور کے ساتھ پورا ہوجاتا ہے اس زندگی کے بعد نہیں رہتا اور کلمہ توحید کا معاملہ مستقبل میں بھی رہتا ہے۔ غرض جنت میں صرف اذکار رہیں گے اور محمد رسول اللہ اذکار میں سے نہیں ہے۔

چونکہ حدیث میں ذکر محشر کا ہے اس لیے وہاں کے حسب حال بھی صرف ذکر کلمہ اخلاص ہے جس کا سکہ اس وقت اور بعد کو بھی چالو رہے گا اور شہادت رسالت کا ذکر حذف کر دیا گیا کہ نہ وہ اس وقت کے حسب حال ہوگا نہ بطور ذکر اس کا اجراء ہوگا ''لمن الملک الیوم۔ للہ الواحد القھار''

ضروری فائدہ: اوپر کی تفصیلات سے معلوم ہوا کہ سب سے آخر میں نکالے جانے والے لوگوں کے متعلق حضوراکرم صلی اللہ علیہ وسلم جانتے ہوں گے کہ ان کے پاس کوئی عمل خیر نہیں ہے صرف قائلین توحید ہیں چنانچہ آپ رب العزت سے ان کو نکالنے کی بھی اجازت طلب فرمائیں گے جس پر اللہ تعالیٰ بوجوہ مفصلہ بالا ''لیس ذلک لک'' (یہ حق آپ کا نہیں ہے) یا (یہ کہ یہ کام آپ کے لیے مقدر نہیں ہے کیونکہ اس کو خود ارحم الراحمین انجام دیں گے) فرمائیں گے اس کے بعد یہ نظریہ قائم کرنا کہ ''ان لوگوں کا ایمان اس قدر مضمحل ہوگا کہ سیدالانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی عمیق نظر بھی اس کو نہ دیکھ پائے گی درست نہیں معلوم ہوتا۔

اس کے علاوہ یہ کہ گو ظاہر بینوں کی نظریں اعمال جوارح پر پڑتی ہیں مگر باطن کی نگاہیں تو اعمال قلوب کو دیکھتی ہیں پھر خدا کے نائبین عالی مقام پیغمبران عظام سے ایمان کی روشنی کیونکر چھپ سکتی ہے اس چیز پر تو ان کی نظر سب سے پہلے اور سب سے زیادہ ہوتی ہے اور ہم یہ تحقیق بھی اہل کشف سے نقل کر چکے ہیں کہ تمام مومنین کے انوار ایمانی نور معظم مرکز نبوت علی صاحبہا الف الف تحیات وتسلیمات کے اجزاء ہیں تو کیا باپ یا اصل سے اس کی اولاد وفروع چھپ سکتی ہے؟ غرض یہ بات عقلاً ونقلاً درجہ اعتبار سے ساقط ہے اور اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے علم غیب کی نفی پر استدلال کرنا اور بھی زیادہ عجب اور بے محل ہے البتہ علم غیب کی نفی کے دوسرے دلائل محکمہ موجود ہیں جو اپنے موقع پر ذکر ہوں گے۔ ان شاء اللہ . و منہ التوفیق السداد الصواب.

تنبیہ مہم: حضرت شاہ صاحب قدس سرہ نے جو توجیہات شہادت رسالت کے ذکر نہ کرنے کے بارے میں ارشاد فرمائی ہیں ان سے یہ بات واضح ہے کہ بغیر شہادت رسالت کے ایمان مکمل نہیں ہوتا اور حدیث ''من قال لا الہ الا اللہ دخل الجنۃ'' کے ضمن میں علماء امت کی یہ تصریح بھی سامنے آچکی کہ توحید کے ساتھ اقرار رسالت اور ان تمام باتوں پر عقیدہ ضروری ہے جن کا ثبوت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے امت کو ضروری طور سے پہنچ گیا ہے اسی طرح یہ امر بھی سب کو معلوم ہے کہ حق تعالیٰ کی طرف سے ادیان انبیاء کی آمد حسب ضرورت وقت وزمانہ ہوتی رہی ہے اور بعد کے ادیان سابقہ ادیان کے لیے ناسخ ہوتے آئے ہیں پھر سب سے آخر میں خاتم الانبیاء علیہم السلام کا سب سے زیادہ مکمل اور آخری دین آیا جس نے اس سے پہلے کے تمام ادیان کو منسوخ کر دیا اور اعلان کر دیا گیا۔ الیوم اکملت

لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا"۔اورومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ و ھو فی الآخرۃ من الخاسرین (جو شخص اسلام کے سوا کوئی اور دین چاہے گا وہ ہرگز قابل قبول نہ ہوگا اور ایسا شخص آخرت میں ناکام ونامراد ہوگا) اسی لیے کسی کا یہ خیال کرنا قطعاً غلط اور گمراہ کن ہوگا کہ "دنیا کے موجودہ دین سب حق پر ہیں' اور اگر ہر دین والا اپنے دین کے صحیح اصولوں پر عمل کرے تو وہ ناجی ہے"۔اول تو ادیان سابقہ میں سے کوئی دین اپنی اصل حالت پر باقی نہیں رہا' اور بالفرض اگر ہو بھی تو وہ آخری دین خاتم الانبیاء کے ذریعہ منسوخ ہو چکا' پھر اس بات کی کیا قدر و قیمت ہے کہ اپنے اپنے دینوں کی صداقتوں پر عمل کر لینا نجات آخروی کے لیے کافی ہے ایسے ہی غلط نظریات کے تحت شہنشاہ اکبر کے زمانے میں "وحدت ادیان" کا خاکہ بنا کر اس کو عملی منصوبہ بنانے کی سعی ناکام ہوئی تھی۔

ترجمان القرآن کا ذکر

ہمارے زمانہ میں اسی کی ایک شکل کو مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی تفسیر "ترجمان القرآن" میں آیت "اھدنا الصراط المستقیم" کے تحت اپنے خاص انداز میں پوری قوت کے ساتھ پیش کیا' جس کو پڑھ کر گاندھی جی نے لکھا تھا کہ "مجھے مولانا کی تفسیر پڑھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ صداقت تمام ادیان میں مشترک ہے' یہی نظریہ میرے نزدیک بھی صحیح ہے"۔لیکن چونکہ مولانا آزاد کی اس[1] قسم کی تعبیر اصول ونظریات

---

[1] چند تعبیرات ملاحظہ ہوں:۔ (۱) صفحہ ۱۸۰ (مطبوعہ زمزم کمپنی لاہور) میں "الھدیٰ" کے تحت ایک سرخی دی گئی ہے۔
"وحدت دین کی اصل عظیم اور قرآن حکیم" پھر لکھا:۔"یہ اصل عظیم قرآن کی دعوت کی سب سے پہلی بنیاد ہے' وہ جو کچھ بھی بتلانا چاہتا ہے۔تمام تر اسی حاصل پر مبنی ہے' اگر اس اصل سے قطع نظر کر لی جائے تو اس کا تمام کارخانہ دعوت درہم برہم ہو جائے' لیکن تاریخ عالم کے عجائب تصرفات میں سے یہ واقعہ بھی سمجھنا چاہیے کہ جس درجہ قرآن نے اس اصل پر زور دیا تھا' اتنا ہی زیادہ دنیا کی نگاہوں نے اس سے اعراض کیا' حتی کہ کہا جا سکتا ہے آج قرآن کی کوئی بات بھی دنیا کی نظروں سے اس درجہ پوشیدہ نہیں ہے جس قدر کہ یہ اصل عظیم" سوچا جائے کہ دنیا کے عجائبات تصرفات میں سے مولانا آزاد کا تصرف مذکور ہے یا ہر زمانے کے ان لاکھوں ہزاروں علماء دین کا جنہوں نے وحدت ادیان کی اصل عظیم کو قرآن حکیم کا مدلول ومصداق اس طرح نہیں سمجھا' ہمارے نزدیک فہم قرآن کے لئے سب سے پہلی شرط عربی زبان کی کما حقہ واقفیت ہے' مولانا آزاد نے اپنی مذکورہ بالا تفسیر میں آیت قرآنی "واللہ فضل بعضکم علی بعض فی الرزق فما الذین فضلو ابرادی رزقھم علی ما ملکت ایمانھم فھم فیہ سواء" میں فھم فیہ سواء کا ترجمہ فا کو حالیہ بنا کر "حالانکہ وہ برابر ہیں" کیا ہے' تا کہ "معاشی مساوات" قرآن مجید سے بہ صراحت تام ثابت ہو مگر یہ بھی عجائب تصرفات عالم میں سے ہی ہے کہ نہ کسی مفسر نے اس فا کو حالیہ سمجھا اور نہ عربی زبان میں فا کا استعمال واو حالیہ کی طرح ہوا ہے' کیا یہ ضعیت کا ذوق نہیں ہے کہ سلف وخلف علماء امت کے خلاف اور عربیت سے بھی آزاد ہو کر نئے معنی وضع کیے جائیں' دوسروں کو ضعیت کا الزام دینا اور خود اس میں اس درجہ استغراق کہاں کا انصاف ہے؟ کیا ضعیت کی کوئی مثال اس سے بڑی مل سکتی ہے؟ ہمارے ایک محترم عالم دین نے بھی اپنی ایک تصنیف میں آیت مذکورہ کا ترجمہ اس طرح کر دیا تھا مگر حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا سید سلیمان ندوی کی بروقت رہنمائی اور اپنی فطری حق پسندی کے باعث انہوں نے کتاب کے دوسرے ایڈیشنوں میں اس غلطی کی اصلاح فرمادی تھی (وللہ الحمد)

(۲) صفحہ ۱۸۳/۱ میں "ہدایت ہمیشہ ایک ہی رہی اور وہ ایمان وعمل صالح کی دعوت کے سوا کچھ نہ تھی" کا عنوان دے کر لکھا کہ یہ عالمگیر قانون سعادت کیا ہے؟ ایمان اور عمل صالح کا قانون ہے یعنی ایک پروردگار عالم کی پرستش کرنی اور نیک عملی کی زندگی بسر کرنی' اس کے علاوہ اور اس کے خلاف جو کچھ بھی دین کے نام سے کہا جاتا ہے۔دین حقیقی کی تعلیم نہیں ہے"۔

(۳) صفحہ ۱۹۳/۱ میں تحت عنوان "سچائی اصلاً سب کے پاس ہے مگر عملاً سب نے کھودی" لکھا:۔قرآن کہتا ہے سچائی اصلاً سب کے پاس ہے' مگر عملاً سب نے کھودی ہے سب کو ایک ہی دین کی تعلیم دی گئی تھی اور سب کے لئے ایک ہی عالمگیر قانون ہدایت تھا' لیکن سب نے اصل حقیقت ضائع کر دی اور "الدین" پر قائم رہنے کی جگہ الگ الگ گروہ بندیاں کر لیں۔"

(۴) صفحہ ۲۰۱/۱ میں بڑی سرخی "قرآن کی دعوت" کے تحت دوسری سرخی اس طرح ہے "سب کی یکساں تصدیق اور سب کے متفقہ دین کی پیروی اس (قرآن) کی دعوت کا اصل اصول ہے"۔پھر لکھا:اسی لئے اس کی دعوت کی پہلی بنیاد ہی یہ ہے کہ تمام بانیان مذاہب کی یکساں طور پر تصدیق کی جائے یعنی یقین کیا جائے کہ سب حق پر تھے سب خدا کی سچائی کے پیغامبر تھے' سب نے ایک ہی اصل وقانون کی تعلیم دی اور سب کی اس متفقہ تعلیم پر کاربند ہونا ہی ہدایت وسعادت کی تنہا راہ ہے۔

(۵) صفحہ ۲۰۸/۱ میں "قل اسلام" کے تحت لکھا "وہ کہتا ہے خدا کا ٹھہرایا ہوا دین جو کچھ ہے یہی ہے اس کے سوا جو کچھ بنالیا گیا ہے وہ انسانی (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اسلام کے خلاف تھی' اس کی مفصل تردید رسالہ معارف اعظم گڑھ میں شائع ہوگئی تھی پھر ایک ندوی عالم نے ہفتہ وار اخبار ''الفتح'' مصر میں ایک مضمون عربی میں شائع کیا' جس میں تفسیر مذکور کی ضرورت سے زائد مداح سرائی کی' تو اس کی تلافی کے لیے رفیق محترم حضرت مولانا سید محمد یوسف صاحب بنوری شیخ الحدیث وناظم جامعہ عربیہ نیوٹاؤن کراچی نے مقدمہ مشکلات القرآن میں تفسیر مذکور پر محققانہ تنقید کی' جو عربی زبان میں بہت عرصہ ہوا مجلس علمی ڈابھیل سے شائع ہوئی تھی۔ مولانا موصوف نے نہ صرف اس نظریہ کی غلطی پر کافی لکھا تھا بلکہ تفسیر مذکور کی دوسری بہت سی اغلاط کی بھی نشان دہی کر دی تھی' جس کو پڑھ کر حضرت حکیم الامت مولانا تھانویؒ نے مولانا بنوری کو تائید وتحسین کے طور پر ایک مکتوب بھی لکھا تھا' اس محققانہ تنقید کا اردو ترجمہ چند سال قبل ایک عالم دین نے رسالہ دارالعلوم دیوبند میں شروع کیا تھا' جس کی اشاعت مولانا آزاد مرحوم نے رکوادی تھی۔ واللہ اعلم و علمہ اتم واحکم۔

مولانا آزاد کی سیاسی خدمات

مولانا آزاد مرحوم کے بارے میں اوپر کی تحریر سے صرف مذہبی وعلمی لحاظ سے ''نا معیاری شان'' کا اظہار ہوتا ہے' اس کے علاوہ ان کی سیاسی ملکی وقومی خدمات کی نہایت ''اعلیٰ معیاری شان'' کا انکار کسی طرح نہیں' بلکہ ان کی گراں قدر خدمات کا نہ صرف اعتراف بلکہ زیادہ سے زیادہ ہمارے دل میں قدر ومنزلت بھی ہے۔ حق تعالیٰ ان کی زلات کو معاف فرمائے گاندھی جی کی طرح ہمارے بہت سے مسلمان بھائی بھی خصوصاً کانگریسی تعلیم یافتہ حضرات ان کی شائع شدہ تفسیر وغیرہ سے غلط تاثرات لیتے ہیں اس لیے اتنی صراحت یہاں ذکر کر دی گئی' حسب ضرورت آئندہ بھی لکھا جائے گا تاکہ دینی وعلمی تحقیق کا بلند معیار شخصیت کے غلط دباؤ سے آزاد رہے۔ واللہ الموفق۔

وزن اعمال

حدیث الباب میں جو ایمان کے وزن وتجسد کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے اور اسی طرح قرآن مجید میں بھی اعمال کے وزن وتجسد کی طرف اشارات ملتے ہیں' تو اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ یہاں کے بہت سے اعراض ومعانی محشر میں مجسد ہو کر محسوس کرائے جائیں گے' یا بقدر اعمال ان کو جسم دے دیا جائے گا تاکہ وزن ہو سکے۔

علامہ قسطلانی نے لکھا کہ قیامت میں اعمال کو جواہر کی شکل میں متمثل کیا جائے گا' پس نیکیوں کے پلڑے میں سفید روشن جواہر ہوں گے۔ اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) گروہ بندیوں کی گمراہیاں ہیں پس اگر تم خدا پرستی اور عمل صالح کی اصل پر جو تم سب کے یہاں اصل دین ہے' جمع ہو جاؤ اور خود ساختہ گمراہیوں سے باز آ جاؤ تو میرا مقصد پورا ہو گیا' میں اس سے زیادہ اور کیا چاہتا ہوں؟''

(۶) صفحہ ۱/۲۱۳ میں ''خلاصہ بحث'' کی سرخی کے بعد لکھا۔ اس (قرآن) نے صاف صاف لفظوں میں اعلان کر دیا کہ اس کی دعوت کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ تمام مذاہب سچے ہیں' لیکن پیروان مذہب سچائی سے منحرف ہو گئے ہیں' اگر وہ اپنی فراموش کردہ سچائی از سر نو اختیار کر لیں تو میرا کام پورا ہو گیا اور انہوں نے مجھے قبول کر لیا' تمام مذاہب کی یہی مشترک اور متفقہ سچائی ہے جسے وہ ''الدین'' اور ''الاسلام'' کے نام سے پکارتا ہے''۔

(۷) صفحہ ۱/۲۱۸ میں ایک سرخی ''صراط مستقیم کے تحت لکھا''۔ ان گروہ بندیوں میں سے کوئی گروہ بندی بھی ایسی ہے جو اپنے بوجھل عقیدوں' نا قابل فہم عقیدوں اور نا قابل برداشت عملوں کی ایک طویل وطویل فہرست نہ رکھتی ہو' آگے لکھا کہ عقائد واعمال کی پوری فہرست صرف دو لفظوں میں ختم کر دی جا سکتی ہے ایمان اور عمل صالح' اس (قرآن) کے عقائد میں عقل کے لئے کوئی بوجھ نہیں اس کے اعمال میں طبیعت کے لئے کوئی سختی نہیں' ہر طرح کے پیچ وخم سے پاک' ہر معنی میں اعتقاد وعمل کی سیدھی سے سیدھی بات''۔

(۸) آخر میں سورۂ فاتحہ کی تعلیمی روح کے تحت لکھا:۔ ''وہ راہ جو دنیا کے تمام مذہبی رہنماؤں اور تمام راست باز انسانوں کی متفقہ راہ ہے' خواہ کسی عہد اور کسی قوم میں ہوئے ہوں''۔ (صفحہ ۱/۲۵۳)

یہ چند نمونے ہیں' اسلامی عقائد واعمال کے بارے میں مولانا کا ایک خاص نظریہ تھا' جس کی جھلک یہاں دیکھی گئی' اور بعض اہم امور دینی کے متعلق خود راقم الحروف کی مولانا مرحوم سے مکاتبت بھی رہی ہے اور مولانا کی تحریریں محفوظ ہیں' حسب ضرورت ان کی بھی اشاعت ہو سکتی ہے۔ (مؤلف)

برائیوں کے پلڑے میں سیاہ تاریک جواہر ہوں گے' یا محض تمثیل کے طور پر ہمیں یہاں سمجھنے کے لیے ایک معیار دیا گیا ہے' حقیقۃً وزن بتلانا نہیں ہے' مگر تحقیقی بات وہی ہے جو اوپر ذکر ہوئی ہے' آج سائنس کی ایجادات بھی اس کی تائید کرتی ہیں' یورپ میں ہوا بھی تولی جاتی ہے اور ٹائر ٹیوب میں وزن کر کے بھری جاتی ہے' اور اسی وزن کے حساب سے اس کی قیمت ہوتی ہے' جرمنی میں ایسے کانٹے ایجاد ہوگئے' جن میں انسانی اخلاق بھی تولے جاتے ہیں۔

علامہ طنطاویؒ نے اپنی تفسیر صفحہ ۴/ ۱۳۸ میں لکھا کہ حق تعالیٰ نے اس دنیا میں سارا نظام نہایت صحیح وزن و مقدار سے قائم کیا ہے' حتیٰ کہ تمام ذرات اور حرکات و سکنات کو بھی وزن کیا ہے؟ اور جس شخص نے علم الفلک' علم طبیعت و علم کیمیا کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتا ہے کہ پانی جو آکسیجن اور ہائیڈروجن سے بنتا ہے ان دونوں کے ذرات بھی نہایت ہی صحیح وزن و مقدار کے ساتھ ملائے جاتے ہیں' اگر مقررہ مقدار سے ایک ذرہ بھی دونوں میں سے کم وبیش ہو جائے تو پانی نہیں بن سکتا' اسی طرح سے نباتات و حیوانات وغیرہ کا ترکیب بھی خاص متعین مقدار ذرات و عناصر سے ہوتا ہے و کل شیء' عندہٗ بمقدار ' عالم الغیب و الشھادۃ الکبیر المتعال' جس قادر مطلق علیم و خبیر نے باریک ترین ذرات عالم اور حرکات و سکنات تک کا وزن یہاں دنیا میں قائم کیا ہے وہ اشرف المخلوقات'' انسان کے اعمال زندگی کو بھی آخرت میں تولنے کا انتظام فرما دیں گے تو اس کے ماننے میں کیا تامل ہو سکتا ہے؟!

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ محشر میں اچھے اعمال کو اچھی صورت میں اور برے اعمال کو بری صورتوں میں لایا جائے گا اور ان کو ترازو کے پلڑوں میں رکھ دیا جائے گا' علامہ بغوی نے بعض علماء کی رائے نقل کی کہ عمل کرنے والوں کو تولا جائے گا کہ صحیحین میں ایک حدیث ہے قیامت کے روز ایک شخص قد آور خوب موٹا آئے گا مگر خدا کے یہاں اس کا وزن ایک مچھر کے پر کے برابر بھی نہ ہوگا'' دوسرے حضرات کی رائے ہے کہ اعمال تولے جائیں گے' لیکن ہر عمل کا وزن خدا کو معلوم ہے' ترمذی و مسند احمد کی روایت ہے کہ'' قیامت کے روز میری امت کے ایک شخص کی گلوخلاصی عجیب طریقہ سے ہوگی' اس کے اعمال بد کے ۹۹ دفتر ہوں گے اور ہر دفتر خوب طویل ہوگا' سب دفتر اس کو کھول کھول کر دکھلائے جائیں گے کہ اچھی طرح دیکھ کر بتلاؤ' کہ یہ سب تمہارے ہی اعمال ہیں یا نہیں؟ اور ہمارے لکھنے والے فرشتوں نے کوئی غلطی تو نہیں کی؟ وہ عرض کرے گا! یارب سب صحیح لکھا ہے غلطی کچھ نہیں کی' حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ کوئی عذر ہو تو کہہ سکتے ہو! عرض کرے گا یارب! عذر بھی کچھ نہیں ہے۔ اس پر حق تعالیٰ کی رحمت خاصہ اس پر مبذول ہوگی' ایک بطاقہ (کاغذ کا پرزہ) نکالیں گے جس پر کلمہ شہادت لکھا ہوگا جو اس شخص کے ایمان کا وثیقہ ہوگا' حق تعالیٰ کے حکم سے اس بطاقہ کو ترازو کے پلڑے میں اور ان تمام دفتروں کو دوسرے میں رکھ دیا جائے گا' وہ سب دفتر ہلکے ہوں گے اور مذکورہ بطاقہ بھاری ہوگا' اور حق تعالیٰ جل ذکرہ کے اسم مبارک کے مقابلہ میں تو دنیا و مافیہا بھی بھاری نہیں ہو سکتے۔ واضح ہو کہ ہر عمل کا وزن جدا ہوگا' جس کی بڑی وجہ اخلاص کی کمی و زیادتی ہوگی' اور عمل جوارح و عمل قلب میں بھی فرق ہوگا'' نیۃ المومن خیر من عملہ اور عمل و ایمان کے وزن میں بھی بڑا فرق ہوگا' جس کو نمایاں کرنے کے لیے اس شخص کے بطاقہ کا وزن کیا جائے گا' اور بظاہر وہ شخص ان ہی لوگوں میں سے ایک ہوگا جو سب سے آخر میں جہنم سے نکالے جائیں گے۔ جن کے پاس کوئی عمل خیر نہ ہوگا' صرف کلمہ اخلاص کے ساتھ رابطہ ہوگا۔ ایمان و عقیدہ صحیح ہوگا' جس کو حدیث میں قول لا الہ الا اللہ کے عنوان سے تعبیر کیا گیا' اور ان کے بطاقہ میں بھی پورا کلمہ شہادت لکھا ہوا ہوگا' ایسے لوگوں کا عمومی اخراج اور جہنم سے آزادی اسی وقت ہوگی' جب ارحم الراحمین کی مشیت ہوگی۔

امام غزالی کا استنباط

امام موصوف نے اخرجوا من النار من کان فی قلبہ سے استنباط کیا کہ وہ شخص بھی ناجی ہوگا' جو دل سے ایمان لایا مگر کلمہ پڑھنے کا وقت نہ ملا کہ موت آگئی' البتہ جس کو وقت و قدرت کلمہ پڑھنے کی ملی پھر بھی زبان سے اقرار نہ کیا تو ہو سکتا ہے کہ وہ تارک صلوٰۃ کے حکم میں

رہے کہ مخلد فی النار نہ ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس کا ایمان ناقص قرار پائے اور نجات نہ پائے' امام غزالیؒ کے علاوہ دوسرے حضرات نے اسی دوسری صورت کو ترجیح دی ہے' منشاء ان دونوں احتمال کا وہی خلاف ہے کہ نطق بالا یمان شطر ایمان ہے یا محض شرط اجراء احکام ہے' جس کی تفصیل پہلے گذر چکی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

(۲۲) حدثنا محمد بن عبید اللہ قال ثنا ابراھیم بن سعد عن صالح عن ابن شھاب عن ابی اما مۃ بن حنیف انہ سمع ابا سعد ن الخدری یقول قال رسو ل اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بینا انا نا ئم رایت الناس یعرضون علی و علیھا قمص منھا ما یبلغ الثدی و منھا ما دون ذلک و عرض علی عمر بن الخطاب و علیہ قمیص یجرہ قالو ا فما اولت ذلک یا رسول اللہ قال الدین.

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں سو رہا تھا خواب میں دیکھا لوگ میرے سامنے پیش کئے جا رہے ہیں' اور وہ کرتے پہنے ہوئے ہیں' کسی کا کرتہ سینے تک ہے اور کسی کا اس سے نیچا ہے' (پھر میرے سامنے عمر بن الخطاب لائے گئے' ان کے (بدن) پر (جو) قمیض ہے اسے گھسیٹ رہے ہیں (یعنی زمین تک نیچا ہے) صحابہؓ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! آپ نے اس کی کیا تعبیر لی؟ آپ نے فرمایا کہ (اس کا مطلب) دین ہے۔

تشریح: ''یجر قمیصہ'' (اپنا پیراہن زمین پر گھسیٹتے تھے) حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہ خواب کا واقعہ ہے' اس لیے اس کو بیداری کے مسائل میں نہ گھسیٹنا چاہئے کہ اسبال مکروہ ہے۔

''تاولت'' تاول کے معنی سلف میں طلب مال اور اخذ مراد و مصداق کے ہیں' جیسا کہ '' ھذا تاویل رؤیای'' میں لہٰذا متاخرین کی اصلاح پر کسی بات کو ظاہر سے پھرانے کا معنی یہاں نہیں ہے۔

''الدین'' یعنی جس طرح قمیض لباس حیا و زینت ہے اور گرمی و سردی سے بچنے کا سبب بھی' اسی طرح دین بھی دنیوی عزت و وقار کا ضامن اور آخرت کے عذاب و عقاب سے بچنے کا سبب ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں لوگوں کی دینی حالت دکھلائی گئی' اور جو لوگ پیش ہوئے' ان میں حضرت عمرؓ کا دین سب سے بڑھا ہوا دیکھا۔

بحث و نظر: امام بخاری کا مقصد دین کے لحاظ سے لوگوں کا باہمی تفاضل و تفاوت بتلانا ہے اور چونکہ دین و ایمان ان کے نزدیک مترادف ہیں' اس لیے گویا ایمان کی زیادتی و نقصان کا ثبوت ہوا۔ لیکن ہم تفصیل سے بتلا آئے کہ دین کا اطلاق ایمان و اسلام کے مجموعہ پر آتا ہے' اس لیے ایمان میں کمی و زیادتی کا ثبوت نہیں ملا۔ اور اعمال کے سبب دین کے تفاضل و تفاوت سے کسی کو انکار نہیں ہے۔

دوسری کسی قدر اہم بحث یہاں یہ ہے کہ حدیث مذکور سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فضیلت دوسرے تمام لوگوں پر معلوم ہوتی ہے حالانکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ باجماع امت و آثار قطعیہ سب میں افضل ہیں' اس کے بہت سے جوابات دیے گئے ہیں' مگر سب سے بہتر یہ ہے کہ اس سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فضیلت جزوی ثابت ہوتی ہے' جو حضرت صدیق اکبرؓ کی فضیلت کلی کے مخالف نہیں جزئی بسا اوقات چھوٹوں کو بڑوں پر حاصل ہو جاتی ہے' جس کی نظائر بکثرت ہیں۔ اسی لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض انبیاء علیہم السلام کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ مجھے ان پر فضیلت مت دو۔ اس سے آپ کا مقصد ان حضرات کے جزوی فضائل کو نمایاں کرنا تھا' ورنہ ظاہر ہے کہ آپ تمام انبیاء علیہم السلام پر فضیلت کلی رکھتے ہیں' بلکہ تمام انبیاء اپنے کمالات و فضائل میں آپ سے مستفید ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جس جزوی فضیلت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے' وہ بعض اکابر کے ارشاد کے موافق آپ کے عہد خلافت کی نمایاں و کثیر اسلامی فتوحات ہیں' اگرچہ ان فتوحات کثیرہ کے لیے بھی بنیادی طور سے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہی نے زمین ہموار کی تھی' اگر وہ اپنے

دور میں فتنہ ارتداد کو اپنی اعلیٰ قابلیت اور نہایت بلند حوصلگی سے روک نہ دیتے تو قریب و بعید ممالک میں اسلامی شوکت کا وہ بے نظیر رعب و دبدبہ قائم نہ ہو سکتا جس سے تمام اعداء اسلام کے پتے پانی ہو گئے اور سب اپنی اپنی جگہ سہم ٹھٹک کر رہ گئے گویا جن قلوب کو حضرت صدیق اکبرؓ نے اپنے مختصر دور خلافت کے دو سال اور چار ماہ میں فتح کر لیا تھا ان ہی کے ظاہری ہیاکل و متعلقات کو اسلامی لشکروں کی بے پناہ یلغار کے ذریعہ حضرت عمرؓ نے اپنے طول طویل دور خلافت میں فتح کیا' اس لیے دونوں کے کارناموں میں ظاہر و باطن کی نسبت معلوم ہوتی ہے' ایک کا طرۂ امتیاز باطنی فتوحات تھیں تو دوسرا ظاہری فتوحات کی خصوصیت سے نوازا گیا' اور شاید پیراہن سے اسی طرف اشارہ بھی ہو۔ و العلم عند اللہ

بظاہر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بڑے بڑے ممالک اور ایک ہزار سے زائد شہروں کو اسلام کا زیر نگیں کیا' ساری دنیا پر ان کا رعب و جلال چھا گیا مگر کیا یہ حقیقت نہیں کہ ان سے پہلے اسی نسبت و وسعت کے ساتھ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے ساری دنیا کے قلوب و ارواح کو اسلام کی عظمت و شوکت کے سامنے جھکنے پر مجبور کر دیا تھا' اس لیے زیادہ گہرائی میں جانے سے معلوم ہوگا کہ اس بارے میں بھی فضیلت کی حقداری دونوں حضرات کو برابر درجہ کی حاصل ہے بلکہ داخلی فتنوں کی روک تھام کا درجہ بیرونی فتنوں کے استیصال سے کئی لحاظ سے بڑھا ہوا بھی ہے' لہٰذا کوئی اشکال ہی یہاں پیدا نہیں ہوتا۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

باب الحیآء من الایمان۔ (حیاء ایمان کی علامت ہے)

۲۳۔ حدثنا عبد اللہ بن یوسف قال اخبرنا مالک بن انس عن ابن شہاب عن سالم بن عبد اللہ عن ابیہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مر علیٰ رجل من الانصار و ھو یعظ اخاہ فی الحیآء فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعہ فان الحیآء من الایمان۔

ترجمہ: حضرت سالم بن عبد اللہ اپنے باپ (عبد اللہ بن عمر) سے روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک انصاری شخص کی طرف سے گزرے آپ نے دیکھا کہ وہ انصاری اپنے بھائی کو حیاء کے بارے میں کچھ سمجھا رہے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ اس کو چھوڑ دو' کیونکہ حیاء ایمان ہی کا ایک حصہ ہے۔

تشریح: ایک انصاری دوسرے انصاری بھائی کو حیاء و شرم کے بارے میں سمجھا رہا تھا کہ اس کو کم کرو' جس سے تم کو اس قدر نقصان اٹھا رہے ہو' حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو فرمایا کہ حیاء سے مت روکو' وہ تو ایمان سے ہے' وعظ کے معنی نصیحت کرنا اور برائی سے روکنا ہے' دوسری روایت میں یعظ کی جگہ یعاتب ہے یعنی عتاب کے لہجہ میں سمجھا رہے تھے' انصاری کا مقصد یہ تھا کہ حیاء کا غلبہ اس قدر ٹھیک نہیں کہ جس سے اپنے حقوق بھی وصول نہ کر سکے وغیرہ' مگر نبی رحمت (ارواحنا فداہ) صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر اصول و کلیات پر تھی فرمایا کہ حیاء کے بارے میں کچھ مت کہو وہ تو بہت اچھی خصلت ہے جو انسان کو بہت سی برائیوں اور معاصی سے باز رکھتی ہے' اسی لیے وہ ایمان کی تکمیل کرنے والی چیز ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ امام بخاری چونکہ اعمال کو اجزاء ایمان مانتے ہیں اس لیے من کو یہاں تبعیضیہ لیا ہے کہ حیاء ایمان کا جزو ہے اور ہم کہتے ہیں ابتدائیہ ہے کہ حیاء کا منشاء ایمان ہے' اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ حیا امانت کی طرح ایسا وصف حسن ہے جو مقدمہ ایمان بنتا ہے۔ حدیث میں ہے "لا ایمان لمن لا امانۃ لہ اسی طرح حیاء بھی ان اخلاق حسنہ میں سے ہے جو ایمان کے لیے بطور مبادی و مقدمات ہیں' پس جس طرح وصف امانت ایمان پر مقدم ہے وصف حیا بھی مقدم ہونی چاہئے"۔ امانت وہ وصف ہے جس کی وجہ سے اس وصف والے پر سب کو اپنے احوال و انفس کے بارے میں اعتماد و اطمینان کلی حاصل ہوا اور چونکہ یہ وصف حق تعالیٰ نے صرف انسان کو عطا فرمایا تھا' اسی لیے آسمانوں' زمینوں نے امانت کا بوجھ اٹھانے سے عذر و انکار کیا' کیونکہ وہ ایسے اوصاف کے حامل نہیں تھے اور انسان نے باوجود اپنے ضعف کے بھی ایسے اوصاف کا حامل ہونے کے باعث سبقت کر کے ایمان کا بوجھ اٹھالیا' دوسری عبارت میں اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں

کہ ہر چیز کو اپنے محل میں رکھنا اور ہر مستحق کو اس کا پورا حق دے دینا "امانت" ہے اور اس کی ضد "غش" ہے یعنی کسی چیز کو اس کے مرتبے سے گرانا' اسی لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو فرمایا۔ یا بنی! ان قدرت ان تصبح و تمسی و لیس فی قلبک غش لا حد فافعل' (برخوردار)! اگر تم ہر صبح وشام اس طرح گذار سکو کہ تمہارے دل میں کسی کے حق و مرتبے کو کم کرنے کا ارادہ و تصور نہ آئے تو ایسا ضرور کرو) اللہ اکبر! یہ تھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تزکیہ نفس کی شان بعثت لا تمم مکارم الا خلاق کیا بڑے سے بڑا ولی بھی اس سہل ممتنع اعلیٰ معیار پر اپنی زندگی ڈھال سکتا ہے؟ الا ما شاء اللہ۔

سہل ممتنع کا لفظ اس لیے عرض کیا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت اور منعم حقیقی کے فضل و انعام سے ایسے اعلیٰ معیار کے اخلاق جو ہمارے لیے ممتنع و دشوار معلوم ہوتے ہیں' صحابہ کرام کے لیے نہایت آسان ہو گئے تھے اور اسی لیے ان سب کی زندگی ہم سب کے لیے تمثالی و معیاری بن گئی۔ و لہ الحمد و المنۃ۔

باب فان تابوا و اقاموا الصلوٰۃ و اتوا الزکوٰۃ فخلوا سبیلھم
(اگر وہ لوگ تائب ہو کر نماز و زکوٰۃ کی ادائیگی کریں تو انہیں چھوڑ دو)

۲۴۔ حدثنا عبد اللہ بن محمد ن المسندی قال حدثنا ابو روح ن الحرامی بن عمارۃ قال حدثنا شعبۃ عن و اقد بن محمد قال سمعت ابی یحدث عن ابن عمر ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال امرت ان اقاتل الناس حتیٰ یشھد و آ ان لا الہ الا اللہ و ان محمدا رسول اللہ و یقیمو االصلوٰۃ و یؤ توا الزکوٰۃ فاذا فعلوا ذلک عصموا منی دمآء ھم و اموالھم الا بحق الاسلام و حسابھم علی للہ

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے جنگ کروں اس وقت تک کہ وہ اس بات کا اقرار کرلیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں اور نماز ادا کرنے لگیں اور زکوٰۃ دیں' جس وقت وہ یہ کرنے لگیں تو مجھ سے اپنے جان و مال کو محفوظ کرلیں گے سوائے اسلامی حقوق کے اور ان کا حساب اللہ کے ذمہ ہے۔

تشریح: اسلام دین فطرت ہے' اس لیے اللہ کے نزدیک کسی انسان کے لیے یہ ہرگز روا نہیں کہ وہ اپنے فطری راستے کو چھوڑ کر کسی دوسری غلط راہ پر چلے دعوت و تبلیغ سے اتمام حجت کرنے کے بعد اب صرف دو ہی راستے رہ جاتے ہیں یا اسلام کی چوکھٹ پر دل جھکے یا سر جھکے دل کی تبدیلی کسی جبر سے نہیں ہو سکتی" لا اکراہ فی الدین "لیکن نظام عالم کی قیادت و رہنمائی اور اجتماعی زندگی پر بہر حال اسلام قبضہ کیے بغیر نہیں رہ سکتا' اس لیے اگر کسی کا دل اسلام کی حقانیت کا قائل نہیں ہوتا تو نہ ہو مگر بہر صورت اسے اسلامی قوانین کے سامنے سر اطاعت خم کرنا پڑے گا۔

معلوم ہوا کہ اسلامی جہاد و قتال کا مقصد وحید یہ ہے کہ تمام انسانوں کی زندگی پر امن ہو جائے اور فتنہ و فساد یا دنیوی اغراض و مقاصد کے لیے قتل و خونریزی کا پوری طرح سد باب ہو جائے۔

اس مقصد کا یقینی حصول اسی وقت ہو سکتا ہے کہ حق تعالیٰ کے بھیجے ہوئے دین فطرت کو اس کے رسول معظم کے اعتماد و اطمینان پر قبول کرلیا جائے۔ ایسا کرنے لینے پر لوگوں کی جان و مال اور عزت دنیا و آخرت دنوں جہان میں محفوظ و مامون ہو گی نہ یہاں ان کو گزند نہ وہاں ان کو آنچ۔ سب اپنے دل ٹھنڈے کر کے دنیا میں بھی جنت جیسی زندگی گزار سکتے ہیں۔

بہشت آں جا کہ آزارے نباشد   کسے رابا کسے کارے نباشد

اس کے بعد اگر کسی سے کوئی غلطی یا خطا بہ تقاضائے بشریت ہو گی تو دنیا میں اس کا ظاہری تدارک مطابق اصول شریعت ہو گا' اور آخرت میں اس کا کامل و مکمل تصفیہ عالم السر و الخفی کی بارگاہ سے ہو گا۔

بحث ونظر: علامہ محقق حافظ عینیؒ نے اس حدیث کے تحت "بیان استنباط الا حکام" کی سرخی قائم کر کے بارہ نہایت اہم ومفید مسائل ذکر کیے ہیں۔

(۱) امام نوویؒ نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ تارک صلوٰۃ کو قتل کرنا جائز ہے اور اس کو جمہور کا مذہب بتلایا' حافظ عینیؒ نے لکھا کہ یہ استدلال غلط ہے' کیونکہ حدیث میں قتال کا ذکر ہے' قتل کا نہیں ہے اور دونوں میں بڑا فرق ہے' حدیث ترمذی میں آیا ہے کہ جو شخص نمازی کے سامنے سے گذرے نمازی اس سے قتال کرے' اسی طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعدؓ کو فرمایا اقتالا یا سعد؟ دونوں جگہ قتال سے مراد جدال ونزاع ہے' قتل کر دینا مراد نہیں' حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ امام نوویؒ نے نماز کے سامنے گذرنے پر قتل کر دینے کا مسئلہ تک لکھ دیا ہے کہ قاتل پر دیت ہوگی یا نہیں' جس سے وہم ہوتا ہے کہ وہاں بھی مقاتلہ سے قتل سمجھ گئے ہیں' حالانکہ یہ غلط ہے' اس لیے ایسے موقع پر غیر متعلق مسائل کا لکھنا ہی مناسب نہیں ہوتا۔

شیخ تقی الدین بن دقیق العید نے بھی یہی تحقیق کی ہے کہ قتال اور قتل الگ الگ ہیں اور شرح العمدہ میں بڑے شدومد سے اس پر نکیر کی ہے۔ جس نے اس حدیث سے قتل پر استدلال کیا ہے اور فرمایا کہ اباحت قتال سے اباحت قتل ہرگز لازم نہیں آتی' کیونکہ مقاتلہ باب مفاعلہ سے ہے جو جانبین سے وقوع قتال کو چاہتا ہے' قتل میں یہ صورت نہیں ہے۔ نیز حافظ بیہقی نے امام شافعیؒ کا قول نقل کیا کہ قتال قتل سے الگ ہے' اسی لیے تو بعض مواقع میں قتال جائز ہے مگر قتل جائز نہیں ہوتا۔ (شروح البخاری صفحہ ۱۶۵)

اس موقع پر حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ بھی فرمایا کہ امام محمد سے منقول ہوا کہ امام وخلیفہ وقت ان لوگوں سے بھی قتال کرے جو ختنہ یا اذان کو ترک کر دیں اس سے بعض حضرات نے سمجھا کہ اذان' امام محمد کے نزدیک واجب ہے' حالانکہ ایسا نہیں' بلکہ قتال کی وجہ اسلامی شعائر کا ترک ہے' کیونکہ اذان وختنہ شعائر اسلام میں سے ہیں۔

پس جب امام محمد سے ترک اذان وختنہ پر باوجود ان کے سنت ہونے قتال جائز ہوا تو ترک صلوٰۃ پر بدرجہ اولیٰ ہوگا امام نوویؒ نے لکھا کہ اس حدیث سے مانعین صلوٰۃ وزکوٰۃ وغیرہ واجبات اسلام کے ساتھ قتال کا وجوب ثابت ہوا' علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا کہ اسی سے امام محمد نے یہ فیصلہ فرمایا کہ اگر کسی شہر یا قصبہ کے لوگ سارے آدمی اذان ترک کر دیں تو امام وقت ان سے قتال کرے گا اور یہی حکم تمام شعائر اسلام کا ہے' پھر علامہ عینیؒ نے یہ بھی لکھا کہ اس حدیث پر حنفیہ بھی عامل ہیں کیونکہ جب ترک اذان پر قتال کرنا جائز ہوا تو ترک نماز پر بدرجہ اولیٰ ہوگا۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ بھی فرمایا کہ محدث نوویؒ مفیدین میں ہیں' محققین میں سے نہیں ہیں' دوسرے یہ کہ وہ حنفیہ کے بارے میں عدل وانصاف سے کام نہیں لیتے' پھر فرمایا کہ محدثین وفقہاء میں سے جو حضرات اہل طریقہ اور اصحاب باطن ہیں وہ ہر ایک کے ساتھ عدل وانصاف کا معاملہ کرتے ہیں (کیونکہ ان کے نفوس زیادہ مزکی ہو جاتے ہیں) مثلاً شیخ تقی الدین ابن دقیق العید جن کو شافعی ومالکی کہا گیا ہے' بڑے محقق ومصنف دقیق النظر ومتبحر عالم' اہل طریقت میں سے صاحب کرامات باہرہ معتدل المزاج تھے۔

حافظ ابن تیمیہؒ کے معاصر تھے' حافظ ابن تیمیہ نے ایک مدت مصر میں گزاری ہے اور شیخ مذکور بھی وہاں تھے' لیکن ان دونوں کی ملاقات کا ذکر کہیں نہیں دیکھا' اگر دانستہ ملاقات نہیں کی تو ممکن ہے کہ شیخ نے اس کو پسند نہ کیا ہو' واللہ اعلم' شیخ موصوف باوجودیکہ شافعی ومالکی تھے' جس بات سے حنفیہ کو فائدہ پہنچ سکتا ہو اس کو قصد وارادہ سے اہتمام کر کے ذکر کرتے ہیں' یہ ان کی منصف مزاجی کی بڑی دلیل ہے' جس طرح حافظ ابن حجر کی غیر منصف مزاجی کی دلیل یہ ہے کہ حنفیہ کے فائدہ کی بات کو جان بوجھ کر موقع سے ہٹا دیتے ہیں۔ اور کہیں کسی بات سے فائدہ بھی پہنچا ہے تو ان کے بغیر ارادہ کے ایسا ہوا ہے' حالانکہ علم وفضل' تیقظ ومتانت کلام وغیرہ کے لحاظ سے وہ نہایت بلند پایہ محقق ہیں' اس کے بعد فرمایا کہ شیخ تقی الدین ہی کی طرح ہمارے حنفیہ میں سے محدث شہیر حافظ زیلعی (صاحب نصب الرایہ) بھی ہیں وہ بھی اہل طریقت میں سے تھے' اور وہ بھی سب کے ساتھ نہایت عدل وانصاف کا معاملہ کرتے تھے' اسی طرح دوسرے اہل طریقت علماء کے عدل وانصاف کا تجربہ ہوا ہے

اوران حضرات اہل اللہ سے اس سے بھی زیادہ توقع کی جاسکتی ہے' پھر فرمایا کہ شیخ ابن ہمام حنفی اہل طریقت میں سے ہیں' اور منصف بھی ہیں' مگر کبھی کبھی اپنے مذہب کی حمایت کے جذبہ میں کچھ اعتدال سے ہٹ جاتے ہیں۔

پھر فرمایا: مفید وہ ہے جو کسی مسئلہ میں سب حضرات اہل تحقیق کے اقوال کو بہتر اسلوب سے وضاحت و تفصیل کے ساتھ جمع کردے۔ اور محقق وہ ہے جو دریائے علم کی غواصی کرے' دقائق معانی و مطالب کا کھوج لگائے' دشوار ترین مسائل کا حل نکالے' اقوال علماء سلف و خلف کی تنقیح کرے' اوران میں سے افراط و تفریط کو الگ الگ نکھار دے' ایسے عالم میرے نزدیک محقق ہیں اور ایسے علماء امت میں بہت کم ہیں۔

حکم تارک صلوٰۃ

اس کے بعد ائمہ اربعہؒ کے اقوال مختلف ہیں' امام ابو حنیفہؒ امام مالکؒ و امام شافعیؒ تینوں کی رائے ہے کہ نماز کے فرض ہونے کا عقیدہ رکھتے ہوئے' جو شخص عمداً نماز ترک کرے گا وہ کافر نہیں ہوگا' امام احمد کا قول بروایت اکثر اصحاب اور بعض اصحاب امام شافعی کی رائے ہے کہ وہ کافر اور ملت سے خارج ہوگیا لہٰذا اس کا حکم مرتد کا ہوگا کہ اس کی بیوی اس کے نکاح سے نکل جائے گی' اس کو کفر کی وجہ سے قتل کیا جائے گا' اور مرنے کے بعد نہ اس کو غسل دیں' نہ اس پر نماز جنازہ پڑھیں گے''۔ نہ اس کے مال کا کوئی مسلمان وارث ہوگا۔ دوسرا اختلاف تارک صلوٰۃ کی سزا میں ہے۔ اس بارے میں امام اعظمؒ' آپ کے اصحاب اور امام مزنی شافعی کی رائے یہ ہے کہ اس کو سزا کے طور پر قید کردیں گے' اگر تین دن کے اندر توبہ کرکے نماز شروع نہ کرے تو اس کے جسم کو کوڑوں کی مار سے لہولہان کیا جائے گا۔ حتی کہ نماز شروع کردے۔ اس کی سزا یا حد شرعی قتل نہیں ہے' البتہ امام وقت چاہے تو بطور سیاست و تعزیر اس کو قتل کرسکتا ہے' جس طرح مبتدع کو کرسکتا ہے' امام مالک و امام شافعی و امام احمد تینوں کے نزدیک اس کو قتل کیا جائے گا' فرق اتنا ہے کہ امام احمد اس کا قتل کفراً (یعنی بوجہ کفر و ارتداد) اور امام مالک و شافعی (بطور حد شرعیؒ)

حداً مانتے ہیں' پھر قائلین قتل کے اقوال مختلف ہیں۔

(۱) تارک صلوٰۃ کو تین روز کی مہلت دی جائے یا فوراً قتل کیا جائے' یہ آخری قول زیادہ صحیح ہے

(۲) دو یا چار نمازیں عمداً ترک کرنے پر قتل کیا جائے یا صرف ایک نماز چھوڑنے پر بھی جب کہ وقت گزر جائے' ان میں بھی آخری قول زیادہ صحیح ہے

(۳) قتل تلوار سے ہو یا گردن ماردی جائے' یا لکڑی لوہے وغیرہ سے کچوکے دیے جائیں حتیٰ کہ وہ مرجائے

(۴) قتل کے بعد اس کا حکم مقتول حداً کا ہوگا' جیسے زانی محصن رجم کیا ہوا ہوتا ہے کہ غسل کفن نماز جنازہ کے بعد مقابر مسلمین میں دفن ہوگا اور اس کی قبر بھی عام مسلمانوں کی طرح ایک بالشت زمین سے اونچی ہوگی' اس کی وراثت بھی جاری ہوگی' یہی قول صحیح ہے' دوسرا قول یہ ہے کہ اس کی تحقیر اور دوسروں کی زجر و تنبیہ کے لیے نہ مقابر میں دفن کیا جائے' نہ اس کی قبر کو ایک بالشت اونچا کیا جائے۔

حکم تارک زکوٰۃ: یہ ہے کہ ترک زکوٰۃ پر اس کو تعزیری سزا دی جائے' اور زکوٰۃ اس سے جبراً وصول کی جائے' اگر انکار کرے تو اس

---

[۱] راقم الحروف نے مقدمہ انوارالباری جلد دوم میں بعض علماء کو محقق فاضل لکھا ہے' جس پر ہندوپاک کے بعض احباب اہل علم نے توجہ دلائی' اور اب خود بھی اس بے احتیاطی کا افسوس ہے' خصوصاً حضرت شاہ صاحبؒ کی تحقیق مذکورہ بالا کے پیش نظر اگرچہ اس وقت اردو زبان کے عام محاورہ و اصطلاح کے لحاظ سے اتنا لکھنا زیادہ بے محل نہ تھا' دوسرے اس خیال سے بھی لکھا تھا کہ آخر بڑی نسبتوں کو اس سے کم کیا لکھا جائے۔

تاہم اپنی غلطی کا اعتراف ہے اور معیار فضل و تحقیق کو گرانا کسی طرح مناسب نہیں اور اس کی خوشی ہے کہ ہمارے ناظرین اور علماء زمانہ میں صحیح علمی اقدار کا جائزہ لینے والے موجود ہیں۔ و کثر اللہ امثالھم (عاجز مؤلف)

[۲] حضرت شاہ صاحبؒ نے اس موقع پر حد و تعزیر میں فرق بھی بتلایا کہ حد شرعی کو قاضی اپنی رائے و اختیار سے رد نہیں کرسکتا کیونکہ وہ حقوق اللہ میں سے ہے بخلاف تعزیر کے کہ وہ اس کی رائے پر محمول ہے' واضح ہو کہ مولانا عبیداللہ صاحب سندھیؒ حد و تعزیر میں فرق نہیں کرتے تھے' اسی لیے ان کی رائے تھی کہ سرقہ و زنا کی سزا قطع ید و رجم بھی امام وقت کی رائے پر محمول ہے' اسی کے ساتھ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ چار مرتبہ سے کم ارتکاب سرقہ و زنا پر سزا لازم نہیں ہے۔ و غیر ذلک و للذکرہ محل آخر ان شاء اللہ تعالیٰ۔

سے قتال کیا جائے' حضرت شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے یہاں فرمایا ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ باوجود اس صریح حدیث کے حضرت عمرؓ نے قتال مانعین زکوٰۃ کے بارے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کیوں اختلاف کیا؟ میں نے اس کا حل اپنے رسالہ "اکفار الملحدین" میں پیش کیا ہے' جس کا خلاصہ یہ ہے کہ شیخین کا اختلاف درحقیقت غرض وسبب منع زکوٰۃ کے باعث تھا' حضرت عمر اس کا سبب بغاوت وسرکشی سمجھتے تھے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ردۃ کو سمجھتے تھے' اس حیثیت سے کہ ایمان پورے دین کے التزام واختیار کا نام ہے' جس نے نماز وزکوٰۃ میں فرق کیا گویا وہ پورے دین پر ایمان نہیں لایا' اور جو پورے دین پر ایمان نہیں لایا۔ وہ قطعاً کافر ہے۔

نظریہ حنفیہ کی تائید: یہاں حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ بھی فرمایا کہ اس سے حنفیہ کے نظریہ کی اصابت وحقیقت معلوم ہوتی ہے کہ ایمان زیادہ وکم نہیں ہوتا' کیونکہ التزام مذکور میں کوئی تشکیک نہیں ہے اور اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نزدیک بھی یہ بات محقق ہوتی کہ وہ لوگ زکوٰۃ کا بالکل ہی انکار کر رہے ہیں تو وہ بھی ان کی تکفیر ہی کرتے اور ان کے قتال میں کوئی تردد نہ فرماتے۔

نصب الرایۂ یلعی صفحہ ۳/۳۵۲ باب الجزیہ میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ان لوگوں کے ارتداد کا یقین نہیں تھا' اس لیے انہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ یہ لوگ مومن ہیں' مومن بخل مال کے باعث ادائے زکوٰۃ سے رک گئے اور یہ بھی فرمایا کہ یہ لوگ خود بھی کہتے ہیں کہ واللہ! ہم اسلام سے نہیں پھرے' بخل مال کی وجہ سے زکوٰۃ نہیں دی مگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنی رائے پر قائم رہے اور قتال کے بعد جو گرفتار ہوئے' ان کو قید کر دیا۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں ان کے معاملہ پر نظر ثانی فرما کر سب کو رہائی دے دی۔ اسی طرح مستدرک حاکم صفحہ ۲/۳۰۲ میں بھی ایک روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا "مجھے سرخ اونٹوں سے زیادہ یہ امر محبوب تھا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تین باتیں معلوم کر لیتا' اور ان میں سے یہ بات بھی ذکر کی کہ جو لوگ اپنے اموال میں زکوٰۃ فرض ہونے کا اقرار کرتے ہیں لیکن ادا نہیں کرتے کیا ان سے قتال جائز ہے؟

معلوم ہوا کہ وہ لوگ زکوٰۃ سے بالکل منکر نہیں تھے' ورنہ ان کے کفر میں کون شک وتردد کر سکتا تھا' زکوٰۃ ضروریات دین سے ہے' جن کا انکار کفر ہے' ان لوگوں نے سمجھا کہ زکوٰۃ ایک مالی ٹیکس ہے' جو بادشاہ اپنی رعایا سے وصول کرتے ہیں لہٰذا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے زمانے میں ادا کی گئی' اب چونکہ ہم ہی میں سے والی وحاکم ہو گئے ہیں وہ ٹیکس بھی ختم ہو گیا اور دوسرے ٹیکسوں کی طرح والی کی رائے پر محمول ہو گیا' خواہ ہم اس کو دیں یا نہ دیں۔

خلفاء راشدین کا منصب

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ خلفاء راشدین کا منصب میرے نزدیک اجتہاد سے اوپر اور تشریع سے نیچے ہے کیونکہ صاحب شریعت نے ہمیں اس کی اقتداء مطلق کا حکم فرمایا ہے اور اسی سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی نماز جمعہ کے لئے اذان[1] اول کی زیادتی' اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا تراویح کے لئے ایک امام[2] کے پیچھے لوگوں کو جمع کر دینا ہے' لہٰذا ان حضرت کے باہمی اختلاف کو مسائل اصول سے وابستہ کرنا مثلاً کہنا کہ شیخین کا اختلاف حکم میں تعارض عموم وخصوص کے ہے درست نہیں' اور غالباً اس سلسلہ میں ہماری تنقیح مذکور ہی اقرب الی الصواب ہے۔

علامہ محقق حافظ عینیؒ نے لکھا کہ جن لوگوں نے اس حدیث سے تارک صلوٰۃ کے قتل پر استدلال کیا ہے ان پر اعتراض پڑتا ہے کہ وہ مانع زکوٰۃ کے لئے قتل کا حکم کیوں نہیں کرتے جب کہ حدیث ایک ہی ہے' علامہ کرمانی نے یہ بھی صراحت کی کہ دونوں کا حکم ایک ہی ہے تو اگر دونوں کا حکم مقاتلہ ہے تو مسلم' اور اگر قتل ہے تو مانع زکوٰۃ کے قتل کا حکم تو شوافع وغیرہ ہم نہیں مانتے دوسرے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے

---

[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں صرف ایک اذان خطبہ جمعہ کے وقت ہوتی تھی یہی طریقہ حضرت ابوبکر صدیقؓ حضرت عمرؓ کے پورے دور میں حضرت عثمان غنیؓ کے ابتدائی دور خلافت میں بھی رہا' پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اذان اول کا اضافہ فرمایا جو اب تک موجود ہے۔

[2] اس سے قبل الگ الگ پڑھتے تھے' جو نوافل وسنن کا طریقہ ہے اور اذان وجماعت نماز فرض وواجب کے ساتھ خاص ہے اسی لئے فقہاء نے لکھا کہ "نفل کی جماعت مکروہ ہے بجز رمضان کے اور اس سے مراد سنن تراویح ہیں حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ فقہا کی اس عبارت سے جس نے مطلق نوافل رمضان سمجھا' غلطی کی' لہٰذا تہجد کی جماعت تین سے زیادہ کی رمضان میں بھی مکروہ ہوگی۔ اس کی مکمل ومدلل بحث آگے آئے گی۔ ان شاء اللہ۔

بھی قتال ومقاتلہ ہی منقول ہے یہ کسی نے نہیں لکھا کہ آپ نے مانعین زکوٰۃ میں سے کسی کو قتل کی سزا دی ہے۔

حکم تارک صوم

روزہ نہ رکھنے والے کی سزا یہ ہے کہ اس کو قید کر دیا جائے' اور دن کے اوقات میں اس کو کھانے پینے کے لئے کچھ نہ دیا جائے' کیونکہ بظاہر وہ روزہ کی نیت کریگا' جبکہ روزہ کے وجوب وفرضیت کا معتقد ہے۔

(۲) اس حدیث سے ثابت ہوا کہ واجبات وشعائر اسلام کے ترک پر قتال کرنا واجب ہے۔

(۳) جو شخص اسلام ظاہر کرے اور ارکان کی ادائیگی کرے اس سے کوئی تعرض نہیں کرنا چاہئے۔

(۴) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ زندیق کی توبہ قبول ہو سکتی ہے اس کی تفصیل مغازی میں آئے گی اور اصحاب امام شافعیؒ کے اس شخص کے بارے میں پانچ قول ہیں جو اسلام ظاہر کرے اور کفر پوشیدہ رکھے ہو' جس کا علم خود اس کے اقرار یا دوسروں کی شہادت سے ہو جائے۔

(۱) قبول توبہ مطلقاً اور یہی قول امام شافعیؒ سے منقول اور صحیح ہے' جس کی دلیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول **افلا شققت قلبہ** ہے

(۲) اس کی توبہ ورجوع الی الاسلام قبول نہیں' البتہ اگر وہ اپنی توبہ میں واقعی سچا ہے تو اس کو عنداللہ نفع ہوگا۔ امام مالکؒ کا بھی یہی قول ہے اور امام اعظم رحمہ اللہ سے مذکورہ ہر دو قول کے موافق دو روایت ہیں۔ (۳) اگر ایسا شخص اس قسم کی گمراہی کا مبلغ بھی ہے تو اس کی توبہ قبول نہیں' لہٰذا عوام کی توبہ قبول ہوگی (۴) اگر خود بخود ابتداء ہی تائب ہو کر آئے اور آثار وقرائن بھی اس کی صداقت ظاہر کریں تو اس کی توبہ قبول ہوگی لیکن اگر قتل ہونے کے لئے گرفتار ہو کر آیا اور اس وقت توبہ کی تو قبول نہ ہوگی' یہ قول امام مالک سے بھی منقول ہے۔ (۵) ایک مرتبہ قبول ہوگی' پھر اگر اسی طرح حرکات کفریہ کرے تو نہ ہوگی۔

حضرت امام اعظم رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ جو حقیقۃً زندیق ہو اور ظاہر اسلام کرے اس سے مرتد کی طرح توبہ کرائی جائے گی۔ امام ابو یوسف (قاضی القضاۃ دولت عباسیہ) کی بھی ایک زمانہ تک یہی رائے رہی' مگر پھر یہ دیکھ کر ملحدین وزنادقہ محض اپنی جان بچانے کے لئے توبہ کر لیتے ہیں اور اسلام ظاہر کرنے کے بعد پھر زندقہ کی باتیں کرنے لگتے ہیں آپ نے فرمادیا تھا کہ میرے پاس جو زندیق لایا جائے گا اس سے توبہ کا مطالبہ نہیں کروں گا بلکہ ثبوت زندقہ کے بعد حکم قتل کروں گا اس کے بعد اگر اس نے خود ہی توبہ کی (اور قتل سے پہلے اس کی صداقت کا اطمینان ہو گیا' تو اس کو چھوڑ دوں گا' اس کے علاوہ ایک قول امام ابو یوسفؒ کے واسطے سے حضرت امام اعظم رحمہ اللہ کا یہ بھی نقل ہوا ہے کہ چھپا ہوا زندیق قتل کیا جائے' اس کی توبہ قابل اعتماد نہیں۔

(۵) اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نجات کے لئے پختہ اعتقاد کافی ہے اور یہی جمہور امت کا مسلک مختار ہے معتزلہ اور بعض متکلمین وامام الحرمین وغیرہ کہتے ہیں کہ صرف اتنا کافی نہیں بلکہ دلائل حقانیت اسلام کا علم حاصل کر کے علی وجہ البصیرت اسلام لانا ضروری ہے امام نووی نے لکھا کہ بکثرت احادیث صحیحہ کے عموم سے علم قطعی اس امر کا حاصل ہو جاتا ہے کہ صرف قطعی تصدیق ہونا کافی ہے۔

(۶) معلوم ہوا کہ حکم اسلام لگانے اور قتال سے بچنے کے لئے زبان سے کلمہ شہادت کہنا ضروری ہے۔

(۷) معلوم ہوا کہ اہل بدعت میں سے اہل شہادت کی تکفیر نہیں کی جائے گی۔

(۸) ہر شخص کے ظاہری اعمال اسلام ہی قبول ہوں گے اور ان ہی پر نظر ہوگی۔

(۹) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد ائمہ دین نے ظاہری اعمال پر حکم کیا اور پوشیدہ امور کا فیصلہ حق تعالیٰ جل ذکرہ پر محول کیا' مخلوق کو ان کی کھود کرید کا حق نہیں دیا گیا۔

(۱۰) یہ حدیث ان تمام احادیث مطلقہ کی مقید اور مبین ہے جن میں صرف کلمہ اخلاص پر نجات اخروی وعصمت دنیوی بتلائی گئی ہے مثلاً

مانعین زکوٰۃ سے حضرت صدیقؓ نے قتال کا ارادہ فرمایا تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ آپ ان سے قتال کس طرح کر سکتے ہیں جبکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد موجود ہے کہ "مجھے قتال کا حکم ہوا ہے تا آنکہ لوگ کلمہ اخلاص (لا الہ الا اللہ پڑھیں جو ایسا کریں گے وہ اپنی جان و مال کو محفوظ کر لیں گے) بجز حق اسلام کے اور ان کا حساب خدا پر ہے"۔

اس پر حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں ضرور ان لوگوں سے قتال کروں گا جو نماز و زکوٰۃ میں فرق کریں گے اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ واللہ! اتنا سنتے ہی مجھے اللہ تعالیٰ نے حضرت صدیق کی بات کے لئے شرح صدر کر دیا اور میں جان گیا کہ وہی حق ہے۔ یہاں سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ ایسا بھی مستبعد نہیں بلکہ واقع ہوا ہے کہ بعض اکابر صحابہ کو کوئی حدیث معلوم نہ ہوئی اور دوسرے صحابہ کو معلوم تھی انہوں نے روایت کی جیسے یہی حدیث الباب حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کو معلوم نہ تھی اور نہ وہ اس موقع پر حضرت عمرؓ کی مذکورہ بالا حدیث کے مقابلہ میں پیش کرتے قیاسی استدلال نہ کرتے یا جس طرح جزیہ مجوس یا طاعون والی حدیثیں بعض صحابہؓ سے مخفی رہیں اور بعد کو ان کا علم ہوا ہے ایک جواب یہ بھی ہے کہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے صرف قیاس سے استدلال نہیں کیا بلکہ یہ جملہ بھی فرمایا تھا کہ زکوٰۃ اسلام کا حق ہے گویا حدیث کے جملہ الابحق الاسلام سے استدلال فرمایا۔

ایک خدشہ کا جواب

ایک خدشہ یہاں یہ بھی ہے کہ جب اس حدیث الباب کے راوی حضرت ابن عمرؓ ہیں تو انہوں نے حضرت ابوبکر و عمر کے مذکورہ مناظرہ و بحث کے وقت اس حدیث کو کیوں نہیں بتلایا۔ بعض حضرات نے تو اس خدشہ کے تحت اس حدیث ابن عمر کی صحت پر بھی شبہ کیا ہے مگر یہ خدشہ و شبہ بے محل ہے کیونکہ اول تو ممکن ہے حضرت ابن عمر اس موقع پر موجود نہ ہوں اور بعد کو بتلایا ہو دوسرے یہ کہ روایت مذکورہ حضرت ابن عمر ہی کی طرح زیادہ صلوٰۃ و زکوٰۃ کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔

(۱۱) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اقرار شہادتین اور اقامت صلوٰۃ و ایتاء زکوٰۃ کے بعد اگرچہ وہ معصوم و محفوظ ہو گیا مگر حقوق الاسلام (قصاص، حد وغیرہ) کا مواخذہ اس سے ضرور ہوگا۔

(۱۲) اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب مسلمانوں کو طاقت حاصل ہو تو ان پر قتال کفار واجب ہے تا آنکہ وہ اسلام قبول کریں یا جزیہ دیں۔

چند سوال و جواب

علامہ محقق حافظ عینیؒ نے مذکورہ بالا بارہ حدیثی فوائد ذکر فرما کر لکھا کہ اس حدیث سے متعلق چند سوال و جواب بھی ہیں جن میں ایک زیادہ اہم یہ ہے کہ بظاہر حدیث الباب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شہادتین اور نماز و زکوٰۃ کے بعد قتال کا حکم ختم ہو جائے گا، خواہ وہ شخص باقی تمام ضروریات دین سے منکر و کافر بھی ہو حالانکہ ایسا نہیں ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اقرار و شہادت رسالت میں وہ تمام چیزیں آ جاتی ہیں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ہمیں پہنچی ہیں اس لئے ان سب کی تصدیق بھی ہمیں لازم و ضروری ہے چنانچہ دوسری حدیث میں "ویو منوا بی وما جئت به" بھی مروی ہے دوسرا سوال یہ ہے کہ حکم تو تمام ہی فرائض کا یکساں ہے پھر صرف نماز و زکوٰۃ کا ذکر کیوں ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں ایک عبادت بدنی اور ایک مالی ذکر کی تا کہ اسی پر دوسری عبادات کو قیاس کر لیا جائے دوسرے اس لئے بھی کہ یہ دونوں زیادہ اہم ہیں کیونکہ نماز دین کا ستون ہے اور زکوٰۃ اسلام کا پل ہے تیسرا سوال یہ ہے کہ شہادتین کے بعد تو اسلامی اصول سے قتال ختم ہو جاتا ہے اور نماز و زکوٰۃ وغیرہ کا انتظار نہیں کیا جاتا پھر یہاں نماز و زکوٰۃ کا ذکر کیوں ہوا اور اس کا فائدہ الابحق الاسلام سے بھی حاصل ہو رہا تھا۔

جواب یہ ہے کہ ان دونوں کا ذکر محض ان کے اہتمام و تعظیم کے لئے کیا گیا اور یہ دکھلانے کے لئے کہ ان کا مرتبہ شہادتین کے قریب ہی

ہے یا ترک قتال مستمر و مستقل طور سے مراد ہے کہ وہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ شہادتین کے ساتھ سارے واجبات بھی ادا کئے جائیں ترک قتال عارضی طور سے مقصود نہیں جس کا اعادہ ترک صلوٰۃ و زکوٰۃ پر بھی ہو سکتا ہے۔ (عمدۃ القاری صفحہ ۲۱۱ تا ۱/۲۱۴)

تبلیغ دین کی ضرورت اور اس کا کامیاب عملی پروگرام

اوپر بیان ہوا کہ جمہور علماء امت کے نزدیک نجات اخروی کے لئے اعتقاد جازم ضروری و کافی ہے دلائل و براہین کے ساتھ حقانیت اسلام کا یقین ضروری نہیں، تاہم اتنا تو سب ہی کے نزدیک ضروری ہوا کہ عقائد و ایمانیات سے پوری طرح واقفیت ہو، صرف شہادتین کا پڑھ لینا بغیر اس کا معنی و مطلب سمجھے ہوئے کافی نہیں ہوگا پھر اگر اس کے ساتھ شریعت کے فرائض و واجبات پر عمل بھی نہ ہو تو وہ نقص در نقص ہوگا۔

لہٰذا نہایت ضروری ہے کہ واقف شریعت حضرات اپنے اپنے قریب کے اس قسم کے مسلمانوں کو عقائد و اعمال شریعت سے واقف کریں، اور ان کی تعلیم دین و اصطلاح حال کے لیے پوری طرح منظم ہو کر سعی و توجہ کریں ان کو آخرت کے عذاب و ثواب سے آگاہ کریں، یہ اس وقت کے اہم ترین واجبات اسلام میں سے ہے، اس کے لیے طریقہ کار وہی بہتر ہوگا جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اختیار کیا تھا کہ سب سے پہلے اپنے کنبہ و قبیلہ میں، پھر محلہ میں پھر اپنی بستی میں تبلیغ و اصلاح کا فرض انجام دیا جائے، پھر اپنی قریبی بستیوں تک جا کر یہ خدمت ادا کی جائے، اور اس طرح اگر کچھ عرصہ میں ہم پورے ملک میں تبلیغ و اصلاح کا جال پھیلا چکیں تو اس کے بعد دوسرے قریب اور پھر دور کے ممالک میں کام کریں اپنے قریبی حلقوں کو چھوڑ کر اگر دور دراز کے خطوں میں کام کرنے کو ترجیح دی گئی تو اس میں مظاہرہ و نمائش تو زیادہ ہے مگر بہتر کام و کامیابی کی توقعات بہت کم ہیں واللہ اعلم۔

قتال و جہاد

اسلام میں جہاد فی سبیل اللہ کا بہت بڑا مرتبہ ہے کیونکہ اس کا مقصد وحید خدائے برتر کا بول بالا کرنا ہے جس کو اعلاء کلمۃ اللہ کہا جاتا ہے، بخاری شریف کی جس حدیث پر یہ بحث چل رہی ہے، اس میں تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے حکم ربی ہے، جب تک لوگ خدائے برتر کی وحدانیت، میری رسالت، اور میری لائی ہوئی شریعت سچے دل سے نہ مان لیں اور واجبات اسلام پر عمل نہ کریں، ان سے برسر پیکار رہوں، یعنی تبلیغ کے بہترین رسالتی طرز و طریق سے لے کر جہاد و قتال تک سے بھی اتمام حجت کردوں، رحمت دو عالم، سراپا شفقت و رافت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بتلاتا ہے کہ کسی بڑے مقصد و مفاد کو حاصل کرنے کے لیے نرم و گرم سب ہی وسائل اختیار کئے جا سکتے ہیں، جس طرح کسی مریض کے زیادہ خطرناک مرض کے ازالہ کے لیے زیادہ سے زیادہ کڑوی دوائیں، سخت سے سخت پرہیز، اور خطرہ کے وقت آپریشن تک جائز بلکہ مستحسن ہو جاتے ہیں پس اگر کم قیمت اور فنا پذیر اجسام کی صحت کے لیے جسمانی ڈاکٹروں و معالجوں کے ایسے اقدامات مستحسن ہو جاتے ہیں تو روح جیسی گرانقدر اور ہمیشہ باقی رہنے والی چیز کے لیے روحانی ڈاکٹر و معالج انبیاء علیہم السلام کی تجویز و تشخیص اور معالجاتی طریقوں سے توحش کا اظہار کیوں ہو؟ اور یہ حکم قتال بھی رحمۃ العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کو اس ذات اقدس جل ذکرہ کی طرف سے ملا ہے، جس کے فضل و رحمت کی کوئی حد و انتہا ہی نہیں، دنیا کی ہر چیز اس کی شان رحمت پر گواہ ہے اور اسی نے قرآن مجید میں یہ بھی فرمایا کہ جو کوئی انسانی جانوں میں سے ایک جان کو بھی بغیر بدلہ جان یا فساد کے ہلاک کردے گا تو اس نے اتنا بڑا جرم عظیم کیا کہ گویا ساری دنیا کے انسانوں کو ہلاک کر دیا۔ اور جس نے کوئی ایک معصوم جان بھی بچائی تو گویا ساری دینا کے انسانوں کی جانیں بچادیں، لیکن اگر خدا ہی کے قانون کو دوسرے دنیوی قوانین کے نیچے کر دیا گیا ہو اور خدا کے کچھ برگزیدہ بندے، خدا کے حکم سے اس کے قانون کو اوپر کرنا چاہیں تو کیا ایسے مقدس مقصد کے حصول میں مزاحمت و رخنہ اندازی کرنے والوں کی سرکوبی ضروری نہ ہوگی؟

اس کے بعد امام بخاری دوسری حدیث لائے ہیں، جس میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کونسا عمل سب سے افضل ہے آپ نے فرمایا اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانا، سائل نے عرض کیا کہ اس کے بعد؟ آپ نے فرمایا اللہ کے راستے میں جہاد کرنا،

اس نے پھر سوال کیا اس کے بعد؟ تو آپ نے فرمایا حج مبرور۔ اس کے بعد صفحہ ۳۵ پر ایک حدیث باب الجهاد من الا یمان کے تحت لائے ہیں اور کتاب الجہاد کا مستقل عنوان قائم کر کے جو احادیث ذکر کریں گے وہ تو گویا اس سلسلہ کی تکمیل ہوگی۔ انشاء اللہ۔

حج پر جہاد کا تقدم

امام نوویؒ نے شرح بخاری میں اس پر بحث کی ہے کہ حج تو فرض عین ہے اس کے مقابلہ میں جہاد کو کیوں مقدم کیا گیا جب کہ وہ فرض کفایہ ہے؟ پھر اس کا جواب یہ دیا کہ جہاد اگرچہ عام حالات میں فرض کفایہ ہوتا ہے مگر بعض مواقع میں فرض عین بھی ہو جاتا ہے پھر کسی وقت بھی فرض کفایہ سے تو اس کا مرتبہ کم ہی نہیں ہوتا جب کہ حج فرض ساری عمر میں صرف ایک بار ہوتا ہے باقی جتنے ادا کرے گا وہ سب نفل ہوں گے اس لیے جہاد کا مرتبہ بڑھ گیا اور اگر صرف حج فرض اور جہاد فرض عین میں مقابلہ کیا جائے تو جہاد اس لیے بڑھے گا کہ اس میں علاوہ فرضیت کے ایک نفع عظیم ساری امت مسلمہ کے لیے ہے۔ اور اس سے ناموس اسلام کی حفاظت ہوتی ہے اور اس میں جان و مال کا گرانقدر ایثار ہوتا ہے۔ وغیر ذلک۔

فرض کفایہ کی اہمیت

امام الحرمین نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہر فرض کفایہ فرض عین کے مقابلہ میں اس حیثیت سے افضل ہے کہ کچھ لوگوں کی ادائیگی سے ساری امت کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے اگر وہ بھی ادا نہ کریں تو امت کے جتنے لوگ بھی اس فریضہ کو ادا کرنے پر قادر ہیں سب ہی گنہگار ہوں گے اور بلاشک ایسی صفت کا فریضہ نہایت عظیم القدر ہے بعض حضرات نے لکھا کہ جہاد کو اس لیے حج پر مقدم کیا کہ ابتداء اسلام میں ہی جہاد کی ضرورت سامنے آگئی تھی اور ظاہر ہے کہ اس سے اسلام کو بڑی قوت حاصل ہوئی اور آخر زمانے تک بھی جہاد کا حکم باقی ہے کہ حدیث میں ہے "الجهاد ما ض الى يوم القيامة" (جہاد کا حکم روز قیامت تک جاری رہے گا۔)

اسلام جہاد کا مقصد

معلوم ہوا کہ اسلام جہاد کا مقصد صرف اعلاء کلمۃ اللہ یا ناموس اسلام کی حفاظت ہے ان اغراض سے ہٹ کر تمام دنیاوی اغراض کے لیے یا محض کسی قومی و ملکی عداوت کے سبب جو جدال وقتال ہوگا وہ اسلامی نقطہ نظر سے پسندیدہ نہیں۔

اسلامی جہاد چونکہ ایک خدائی قانون ہے اس لیے اس کی ادائیگی نہایت اہم شرائط اور کڑی احتیاطوں پر موقوف ہے وہ سب شرائط و احتیاطیں کتب فقہ اسلامی میں موجود ہیں دنیوی لڑائیوں کے لیے کوئی تعلیمی معیار مقرر نہیں بلکہ علم و حکمت سے غافل لوگوں کو ترجیح دی جاتی ہے مگر اسلامی جہاد کے لیے علوم نبوت سے واقفیت تزکیہ نفوس اور کم سے کم واجبات اسلام کی مکمل پابندی اور خشیہ خداوندی ضروری ہے۔ انبیاء علیہم السلام اور ان کے صحابہ کرام کے غزوات اور خصوصیت سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہ کے غزوات و سرایا پر ایک نظر ڈال لی جائے تو ہماری بات بخوبی روشن ہو سکتی ہے۔ ان حضرات کی شان عین میدان جہاد میں بھی یہ ہوتی تھی کہ دن کے وقت مشغول جہاد ہیں تو رات کے وقت مصروف نوافل ہر اسلامی لشکر تقویٰ و طہارت کا پیکر مجسم ہوتا تھا شام فتح ہوا تو عیسائیوں نے آزمائش کے لیے بازار سجائے اور دوکانوں پر نوجوان خوبصورت لڑکیوں کو بٹھایا تا کہ اسلامی لشکر کا حال معلوم کریں مسلمانوں کو معلوم ہوا تو امیر وقت نے سب کو جمع کر کے سورہ نور کی آیات غض بصر سنائیں اور نزاکت حال کا بطور احتیاط احساس کرا دیا۔ اس کے بعد پورا اسلامی لشکر ان بازاروں سے گزر گیا اور تاریخ میں ہے کہ کسی ایک سپاہی نے بھی دوکانوں کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔

مکی و مدنی زندگی: یہی وجہ ہے کہ مکی زندگی کے ۱۳ سال مسلمانوں نے سخت سے سخت تکالیف میں گزارے اور بار بار خواہش کی کہ کفار و مشرکین سے قتال و جہاد کی اجازت مل جائے مگر حق تعالیٰ کی طرف سے یہی تاکید ہوتی رہی کہ پہلے اپنے تقویٰ کے ہتھیاروں سے مسلح ہو لو اپنی

نمازوں اور زکوٰۃ وغیرہ واجبات کی پوری پابندی کر کے دکھاؤ اس کے بعد جہاد کی صلاحیت پیدا ہوگی۔ قال تعالیٰ: **الم تر الی الذین قیل لھم کفوا ایدیکم و اقیموا الصلوٰۃ و آتوا الزکوٰۃ** (کیا آپ نے ان لوگوں کا حال نہیں دیکھا جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھوں کو (جہاد وقتال) سے روکے رہو۔ اور نمازوں کی پوری پابندی اور زکوٰۃ کی صحیح ادائیگی کا اہتمام کرو) مفسرین کے اشارات کچھ اس قسم کے بھی ملتے ہیں کہ دار بدلنا بھی اس جہادی تیاری کا ایک جزو تھا اس لیے ہجرت فرض ہوئی پھر تو فوراً ہی مدنی زندگی میں غزوات وسرایا کا ایک مسلسل وطویل سلسلہ بندھ گیا۔

سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے حیرت انگیز فیض تربیت وتزکیہ نفس سے ایک لاکھ چوبیس ہزار انسان صورت جم غفیر مکمل طور سے فرشتہ سیرت بن چکا تھا' اسی لیے نہایت تھوڑے عرصہ میں سارا عرب انوار الٰہی وعلوم نبوت سے جگمگا اٹھا' حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ اول حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے مختصر دور خلافت میں داخلی فتنوں کو پوری کامیابی سے ختم کر دیا گیا' اور خلیفہ دوم حضرت عمرؓ کے دور میں بڑے پیمانہ پر بیرونی ممالک میں فتوحات ہوئیں۔ اور اس شان سے کہ مصر کی فتح میں کچھ دیر ہوئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر بن العاصؓ سپہ سالار جیش کو لکھا کہ دیر کیوں ہو رہی ہے جب کہ میں نے تمہارے ساتھ ایسے لوگ بھیجے ہیں کہ ان میں سے ایک ایک آدمی ایک ایک ہزار کے مقابلہ میں کافی ہے' غرض جہاد مع النفس اور واجبات اسلام کے کامل اتباع کی برکت سے روحانی قوت اس قدر قوی ہو جاتی ہے کہ اب بھی اس کے معجزانہ کرشمے دیکھے جا سکتے ہیں' اور تا قیام قیامت جب تک صحیح اسلامی جہاد باقی ہے اس کے نمونے دیکھے جائیں گے۔

فضائل جہاد وشہادت

جہاں اسلامی جہاد کی شرائط سخت اور احکام اس کے اعلیٰ مقصد کے ساتھ بہت اونچے ہیں وہیں اس کے فضائل ومناقب بھی بہت زیادہ ہیں' چند احادیث یہ ہیں'

(۱) جہاد کے وقت ایک رات ساحل بحر پر جاگ کر حراست کرنا اپنے گھر پر ایک ہزار برس کی عبادت سے افضل ہے (جمع الفوائد من الموصلی ملبین)

(۲) اس کے میدان میں جم کر کھڑا ہونا گھر بیٹھ کر ساٹھ برس کی عبادت سے افضل ہے (جمع الفوائد کبیر اوسط بزار)

(۳) اس میں جاگنے والی آنکھ پر دوزخ کی آگ حرام ہے (ترمذی)

(۴) خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے کے لیے حق تعالیٰ نے دو چیزوں کی ذمہ داری لی ہے' اگر شہید ہو گیا تو سیدھا جنت میں پہنچے گا کہ اس کا جنت میں داخلہ دوسروں کا طرح روز جزا پر موقوف نہیں ہے' اور اگر شہادت کی بلندی نہ مل سکی بلکہ گھر واپس آ گیا تو بصورت فتح مال غنیمت واجر اخروی دونوں سے سرفراز ہوگا' اور فتح نہ ہوئی تب بھی اجر جہاد تو ضرور ہی حاصل ہوا (ترمذی)

(۵) بعض روایات سے یہ بھی ثابت ہے کہ شہید حور کی گود میں گرتا ہے

(۶) شہادت کے بعد[1] دن بھر جنت کی سیر وسیاحت اور اس کے پھل کھانے میں گزارتا ہے اور رات کے وقت عرش الٰہی کی قندیلوں میں بسیرا لیتا ہے۔ (ابوداؤد)

(۷) راہ جہاد میں غبار آلود ہونے والے قدم دوزخ کی طرف نہ جائیں گے (بخاری' ترمذی' نسائی)

(۸) خدا کے راستے میں ایک دن ملکی سرحد کی حفاظت ایک ماہ دن کے روزوں اور رات کے قیام سے افضل ہے (مسلم وترمذی)

---

[1] شہیدوں کی زندگی حضرت ابن عباسؓ سے روایت اس طرح ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ جب غزوہ احد میں تمہارے بھائی شہید ہوئے تو حق تعالیٰ نے ان کی ارواح کو سبز پرندوں کے قالب میں ڈال دیا' وہ جنت کی نہروں اور باغات میں سیر کرتیں اور ان کے پھل کھاتیں اور رات کے وقت عرش خداوندی کے طلائی قندیلوں میں بسر کرتیں' جب اس طرح عیش ومسرت کی زندگی پائی تو انہیں تمنا ہوئی کہ ہمارا یہ حال اور جنت کی زندگی ہمارے بھائیوں کو بھی دنیا میں معلوم ہو جائے تا کہ وہ جنت سے بے رغبتی اور میدان جہاد میں بزدلی اختیار نہ کریں اس پر حق تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم تمہاری اس تمنا کو پورا کریں گے اور قرآن مجید کی یہ آیت و **لا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتا بل احیاء عند ربھم یرزقون' فرحین بما آتاھم اللہ من فضلہ و یستبشرون بالذین لم یلحقوا بھم من خلفھم** (آل عمران)

بخاری و مسلم کی روایت میں ہے کہ دنیا اور دنیا کی تمام چیزوں سے بہتر ہے۔

(۹) جہاد فی سبیل اللہ میں ایک صبح یا ایک شام کا نکلنا دنیا و مافیہا سے افضل ہے (مسلم و نسائی)

(۱۰) میدان جہاد فی سبیل اللہ میں ایک ساعت کھڑا ہونا گھر میں ستر سال نماز پڑھنے سے بہتر ہے۔ پھر فرمایا کہیں تمہیں یہ بات نہایت محبوب و پسندیدہ نہیں کہ خدا تمہاری مغفرت کر کے جنت میں داخل کر دے۔ صحابہ نے عرض کیا کیوں نہیں۔ فرمایا خدا کے راستے میں غازی و مرد مجاہد بن کر نکلو جو شخص اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے بقدر فواق[1] ناقہ بھی قتال کرے گا اس کے لیے جنت واجب ہوگئی (ترمذی)

(۱) جو شخص خدا کے رب اسلام کے دین اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہونے سے راضی ہو گیا' جنت اس کا حق ہوگئی۔ راوی حدیث ابو سعید یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات کا پھر اعادہ کرایا' آپ نے فرمایا ایک عمل اور بھی ہے جس سے اللہ تعالیٰ بندے کو ایک سو درجے بلند فرما دیتا ہے' جن کے دو درجوں کے درمیان زمین و آسمان کا فاصلہ ہے' عرض کیا وہ کیا ہے؟ فرمایا جہاد فی سبیل اللہ' جہاد فی سبیل اللہ' جہاد فی سبیل اللہ' تین بار فرمایا (مسلم' نسائی)

(۱۲) جنت تلواروں کے سایہ میں ہے (مسلم نسائی)

(۱۳) جس کو خدا کے راستے میں ایک تیر لگا' وہ قیامت کے دن اس کے لیے نور ہوگا (بزار)

(۱۴) حق تعالیٰ ان دو شخصوں کے عجیب حال پر ضحک فرماتے ہیں (کما یلیق بشانہ و لیس کمثلہ شیء) کہ وہ باہم قتال کرتے ہیں' پھر بھی دونوں جنت میں داخل ہو جاتے ہیں' اس طرح کہ ایک خدا کے راستے میں لڑ کر شہید ہو جاتا ہے' اور دوسرا کافر قاتل توبہ کر کے اسلام قبول کر لیتا ہے اور وہ بھی خدا کے راستے میں جہاد کر کے شہید ہو جاتا ہے (بخاری و مسلم و نسائی)

(۱۵) جو مومن خدا کے وعدوں پر یقین رکھ کر جہاد فی سبیل اللہ کے لیے گھوڑا پالتا ہے' تو اس گھوڑے کا پیٹ بھرائی چارہ' پانی' اس کی لید و پیشاب بھی اس مومن کا وزن اعمال بڑھانے کے لیے اس کی میزان میں رکھا جائے گا' یعنی حسنات کے قائم مقام ہوگی (بخاری و نسائی)

(۱۶) جو شخص گھر میں رہتے ہوئے' مجاہدین کے مصارف کے واسطے کوئی رقم دے گا' اس کو ہر روپیہ کے عوض سات سو روپیہ صرف کرنے کا اجر ملے گا اور جو شخص خود میدان جہاد میں شرکت کے ساتھ کچھ صرف کرے گا اس کو ہر روپے کے عوض سات لاکھ روپے صرف کرنے کا ثواب ملے گا (جمع الفوائد من القزوینی بجهول وارسال)

(۱۷) شہادت فی سبیل اللہ سے بجز دین (قرض) کے ہر قسم کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں (ترمذی)

(۱۸) ہر شہید اپنے اہل بیت میں سے ۷۰ گناہ گاروں کی شفاعت کر سکے گا۔ (ابوداؤد)

(۱۹) ایک صحابی نے عرض کیا یا رسول اللہ! اس کی کیا وجہ ہے کہ سارے مومن فتنہ قبر سے دو چار ہوں گے بجز شہید کے؟ فرمایا تلواروں کی باڑ کا فتنہ جو اس کے سر پر منڈلا چکا ہے کافی ہو گیا۔ (نسائی)

(۲۰) شہید کو قتل ہونے کے وقت صرف اتنی تکلیف ہوتی ہے جتنی چونٹ لینے یا پسو کے کاٹنے سے ہوتی ہے (ترمذی۔ نسائی) یہ جہاد و قتال کے خوفناک منظر اور اس کی ہیبت دلوں سے کم کرنے کے لیے فرمایا کہ جب شہید کو خدا کے خصوصی فضل و انعام کے باعث قتل کے وقت تکلیف بھی نہیں ہوتی' تو پھر اس سے مرعوب و خوفزدہ ہونا کیسا؟ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اگر موت مقدر نہیں تو کتنے ہی میدان کارزار دیکھے گا۔

اور ان کو فاتحانہ سر کرے گا' مگر موت پاس نہ آسکے گی' چنانچہ مشہور عالم' شیر دل' اسلامی جرنیل حضرت خالد بن ولیدؓ نے بیسیوں میدان میں داد شجاعت دی سینکڑوں بلاد اور کتنے ہی ممالک فتح کیے' مگر موت مقدر نہ تھی اور آخر میں آئی تو گھر کے بستر پر' خود ہی موت کے وقت فرمایا میں نے اتنے معرکوں میں شرکت کی اور میرا کوئی عضو نہیں بچا جس میں تلوار اور تیر کے زخم نہ ہوں اور اب مجھے افسوس ہے کہ اپنے بستر پر مر رہا ہوں۔ خدا

---

[1] دو دفعہ دوہنے کے درمیان کا وقفہ یا دوہنے والے کے ہاتھ کے بند کرنے اور کھولنے کے درمیان کا وقت' مقصود کم سے کم وقفہ ہے (مؤلف)

کرے بزدلوں نامردوں کو کبھی خواب راحت نصیب نہ ہو۔ (تفسیر ابن کثیر صفحہ ۱/ ۵۲۶) مطلب یہ تھا کہ بزدلی ونامردی اور خوف موت ہی جہاد و قتال سے روکتا ہے' ایسے لوگوں کو میرے حال سے سبق لینا چاہئے' اور اس پر بھی اگر ان سے موت کا بے جا خوف دور نہ ہو سکے تو وہ بدنصیب بددعا کے مستحق ہیں' کچھ اسی ذہن وفطرت کے لوگوں نے میدان جہاد کا رخ کرنا مرادف موت سمجھا تھا تو حق تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی تھی:۔ **و لا تلقوا بایدیکم الی التهلکة** کہ تم اپنی بزدلی کے باعث غلط خیال میں ہو' درحقیقت جہاد کی تیاری نہ کرنا اور ضرورت کے وقت جہاد سے پہلوتہی کرنا ہی اپنے کو ہلاکت وتباہی' ذلت ونامرادی کے غار میں دھکیلنا ہے' قوموں کی ذرا سی غفلت و بزدلی سے دشمن کو بڑے فائدے پہنچ جاتے ہیں' اور اس کے حوصلے بڑھ جاتے ہیں۔" **واعد وا لهم ما استطعتم من قوة و من رباط الخيل تر هبون به عدو الله وعد و كم۔**

جہاد وشہادت کے اقسام

جہاد کا مضمون بہت طویل اور پوری تفصیلات چاہتا ہے' اور یہ جلد اسی مضمون پر ختم ہو رہی' مختصراً چند باتیں اور لکھی جاتی ہیں۔ اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے اقدامی جہاد سب سے اعلیٰ اور اونچا درجہ ہے' جس کو انبیاء علیہم السلام کے غزوات اور صحابہ کرام کے مجاہدانہ کارناموں میں پڑھنا چاہئے' اور سمجھ کر اس سے روشنی لینی چاہئے اس کے بعد دفاعی جہاد کا مرتبہ ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **من قتل دون ماله فهو شهيد. من قتل دون دمه فهو شهيد. من قتل دون دينه فهو شهيد. من قتل دون اهله فهو شهيد** (سنن اربعہ) **من قتل دون مظلمة فهو شهيد** (نسائی) یعنی اپنے دین' مال' اہل وعیال' اپنی عزت وحق کی حفاظت کرتے ہوئے مرجائے تو وہ بھی شہید ہے' مگر یہ جب ہی ہے کہ جہاد کی روح اس حالت مظلومی میں بھی فوت نہ ہو' یعنی اپنی سعی وکوشش میں کمی نہ کرے اور بزدلی ونامرادی کا کسی نہج شائبہ نہ آئے اور حق مدافعت ادا کرے' اس کے بعد تیسرا اور آخری درجہ شہادت کا اور بھی ہے کہ اس کو بھی شارع علیہ السلام نے فی الجملہ شہادت کے اعلیٰ مقام سے ربط دے دیا ہے اور بڑے ثواب کا مستحق گردانا ہے' فرمایا (۱) طاعون کی بیماری سے (۲) ہیضہ کی بیماری سے (۳) نمونیہ کی بیماری سے اور عورت نفاس کی حالت میں مرجائے تو شہید ہے' اسی طرح ڈوب کر' جل کر' دیوار وغیرہ کے نیچے دب کر مرجائے تو وہ بھی شہید ہے' یہ تیسری قسم گویا جہاد اضطراری ہے اور تیاری ومستعدی تینوں ہی قسم کے جہادوں کے لئے ہونی چاہئے تا کہ جس سے بھی سابقہ پڑے مردانہ وار اس کو انگیز کرے' اور غفلت وناتیاری کی ندامت وخفت اٹھانی نہ پڑے۔

ہمت بلند دار کہ پیش خدا و خلق   باشد بقدر ہمت تو اعتبار تو

مسئلہ قتال تارکین واجبات اسلام

مذکورہ حدیث الباب میں تارکین صلوٰۃ وزکوٰۃ سے قتال کا وجوب صراحۃً اور دوسرے تارکین واجبات سے اشارۃً معلوم ہوا لیکن ظاہر ہے کہ ایسے احکام کا اجراء دار السلام ہی میں ہو سکتا ہے' دار الحرب میں جہاں غیر اسلامی احکام کا اجراء ہو کس طرح ممکن ہے؟ اس لئے بدرجہ مجبوری انفرادی واجتماعی حیثیت سے جتنا بھی زیادہ سے زیادہ اثر ودباؤ قانونی حدود کے اندر رہ کر ان لوگوں پر ڈالا جا سکتا ہو اس سے ضرور کام لینا چاہئے' تا کہ احکام اسلام سے غفلت وبے اعتنائی کا سدباب ہو' اس کے لئے مؤثر تدابیر اختیار کرنے کی ضرورت ہے' اسلامی شریعت کی نظر میں جو لوگ مستحق قتال ہیں اور ترک صلوٰۃ عمداً پر تو تمام ائمہ مجتہدین نے قتل وحبس کے سخت ترین احکام جاری کئے ہیں' اسلئے ان کی اصلاح معاشرہ مسلمین کی اہم ترین ذمہ داری ہے۔

لہٰذا ایسے تمام لوگوں کی تادیب واصلاح حال ہر دیندار مسلمان کا فرض ہے خصوصاً اپنے متعلقین اعزہ واحباب کی' **كلكم راع و كلكم مسؤل عن رعيته**' اس اصلاح کے چند درجات ہیں' سب سے پہلے وعظ وتلقین' ترغیب وترہیب کے ساتھ احکام اسلام کی ضروری تعلیم دی جائے جن لوگوں پر وہ کارگر نہ ہو' ان کا عملی طور سے عمومی مقاطعہ' ترک تعلق وغیرہ کیا جائے تا کہ وہ مجبور ہو کر ترک صلوٰۃ وغیرہ

اورارتکاب منکرات وفواحش سے باز آئیں یہ مقاطعہ کی صورت ان کی اصلاح حال کے لئے کم سے کم درجہ کا علاج ہے اور جس کا روزانہ عہد و اقرار ہم دعاء قنوت میں بھی کرتے ہیں "ونخلع ونترک من یفجرک" (اے خدا! ہم آپ کے نافرمان بندوں سے بیزاری وقطع تعلق کرتے ہیں) اس طریق کار کی کامیابی کا انحصار ہر شہر وقصبہ کی منظم تبلیغی جماعتوں پر ہوگا۔ ۹ھ میں غزوہ تبوک کے متخلفین کے ساتھ جو مقاطعہ ترک تعلق وترک کلام کی صورت میں خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اختیار فرمایا تھا اور اس سے خاطر خواہ کامیابی بھی ہوئی۔ وہ ہمارے لئے اسوہ حسنہ ہے اور موجودہ حالات میں وہ ایک ہی موثر علاج ہے سورہ توبہ کی تفسیر میں اس کا واقعہ تفصیل سے ملتا ہے اور ہم بھی آئندہ کسی موقع پر لکھیں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

دارالاسلام ودارالحرب کے متعلق علامہ کشمیریؒ کی تحقیق

احکام اسلام کے اجراء وعدم اجراء اور بہت سے مہمات اسلامی کا تعلق ہر دو دار کے اصولی فرق سے وابستہ ہے اس لئے اس کی بھی یہاں بقدر ضرورت شرح وایضاح مناسب ہے اس کے ضمن میں یہ بات بھی آجائے گی کہ ہمارا ہندوستان دارالحرب ہے یا نہیں؟ محقق عصر حضرت علامہ کشمیری قدس سرہ نے اس سلسلہ میں ایک نہایت عمدہ تحقیق بہت مدت ہوئی اپنے خطبہ صدارت آل انڈیا جمعیت علماء ہند (منعقدہ پشاور) میں لکھی تھی جو شائع شدہ ہے اس کے بعد ایک مستقل تحریر اسی موضوع پر تحریر فرمائی جواب تک قلمی یادداشت کی شکل میں "کتب خانہ رحمانی مونگیر" میں محفوظ تھی جس کو چند ماہ قبل محترم ومخدوم جناب مولانا منت اللہ صاحب رحمانی فاضل دیوبند ورکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند امیر شریعت بہار واڑیسہ نے نہایت عمدہ آرٹ پیپر پر فوٹو آفسٹ سے طبع کرا کر شائع کردیا ہے در حقیقت اس کی اشاعت سے مولانا موصوف نے علمی دنیا پر بہت بڑی منت فرمائی ہے۔ **ولہم الاجر والمنۃ۔**

حضرت شاہ صاحبؒ کی تحریر فارسی زبان میں ہے، نہایت مفید ہوتا اگر اس کے ساتھ اردو ترجمہ بھی شائع ہو جاتا بہر حال اسی تحریر کا ضروری خلاصہ پیش ہے۔

کسی شہر یا ملک کے درالسلام یا دارالحرب ہونے کا مدار محض غلبہ وشوکت پر ہے، اگر وہاں مسلمانوں کا غلبہ ہے تو وہ دارالاسلام ہے اور کفار ومشرکین کا غلبہ ہے تو دارالحرب "جامع الرموز میں ہے" کہ دارالاسلام وہ ہے، جس میں امام المسلمین کا حکم جاری ہو اور مسلمان وہاں مامون ہوں اور دارالحرب وہ ہے جس میں مسلمان کافروں سے خوفزدہ ہوں"۔

اگر کسی جگہ دونوں کے احکام جاری ہوں اور بعض وجوہ سے اہل اسلام کا بھی غلبہ ہو تو اس کو بھی بحکم "**الاسلام یعلو ولا یعلی**" دارالاسلام کہہ سکتے ہیں، مگر صرف اس وجہ سے کہ کسی جگہ مسلمان بھی رہتے ہوں (بغیر کسی غالبانہ حیثیت کے اس کو دارالاسلام نہیں کہہ سکتے۔ ورنہ جرمنی، فرانس، روس وچین وغیرہ کو بھی دارالاسلام کہا جائے گا۔

اس کے بعد حضرت شاہ صاحب نے ایک طویل محققانہ بحث اس امر پر کی ہے کہ ایک دارالاسلام کن صورتوں میں دارالحرب بن جاتا ہے اور امام صاحب وصاحبین کے نظریات کی تنقیح وتوضیح فرمائی ہے جو اہل علم کے لئے بہت قیمتی ہے، پھر فرمایا کہ اجراء احکام اسلام کا مطلب بطور غلبہ اظہار حکم اسلام ہے محض اداء جماعت وجمعہ مراد نہیں ہے، کیونکہ فقہانے تصریح کی ہے اور بتلایا ہے کہ اجراء احکام کفر اشتہاراً سے مراد یہ ہے کہ حاکم کفار کے حکم جاری کرے اور وہ لوگ قضاۃ مسلمین کی طرف رجوع نہ کریں یعنی قضاۃ مسلمین کی کوئی شوکت ووقعت نہ ہو اور جن بلاد میں

لہ فقہانے دارالحرب ہی کی ایک قسم دارالامان بھی لکھی ہے جس کی وضاحت حضرت شاہ صاحبؒ نے خطبہ صدارت مذکورہ میں کی ہے اور اس وقت کے انگریزی دور کو دارالامان قرار دیا تھا اس کے مقابلہ میں دارالخوف ہے جہاں مسلمانوں کو پوری طرح جان، مال، عزت ومذہب کا تحفظ بھی حاصل نہ ہو، اس وضاحت اور فقہاء کرام نیز حضرت شاہ صاحبؒ کے ارشادات کی روشنی میں یہ بات صاف ہے کہ کسی غیر دارالسلام کو "دارالمسلمین" نام دینے کا کوئی محل وموقع نہیں ہے، خصوصاً جبکہ اس اصطلاح کا پہلے سے وجود بھی نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

کفار قابض ہو جائیں اور ان کے احکام نافذ نہ ہوں بلکہ قضاۃ مسلمین ہی کے احکام چلیں تو اس وقت تک ان کو بھی دارالاسلام کہیں گے۔

غرض فقہاء نے سارا مدار نفاذ احکام پر رکھا' اس پر نہیں رکھا کہ اس شہر یا ملک کے لوگ آزادی سے باجماعت نمازیں ادا کرتے ہیں یا نہیں اور نماز جمعہ پڑھ سکتے ہیں یا نہیں وغیرہ' کیونکہ ان امور یا دوسرے شعائر اسلام کی ادائیگی دارالحرب میں بھی کفار کی اجازت سے ہوتی ہے جس طرح دارالاسلام میں اہل ذمہ کفار اپنی تمام مذہبی رسوم آزادی سے ادا کرتے ہیں' مگر ان کی وجہ سے ان کو دارالحرب نہیں کہہ سکتے۔

آخر بحث میں حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ" اہل فقہ میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ اگر ملک کفار میں ان کی اجازت سے مسلمان شعائر اسلام ادا کرتے ہیں تو وہ ملک دارالاسلام بن جاتا ہے' حاشا وکلا: یہ بات تفقہ سے بہت دور ہے اور جب یہ بات منقح ہو گئی تو ہندوستان کے بارے میں خود ہی فیصلہ کیا جا سکتا ہے' ظاہر ہے کہ یہاں کفار نصاریٰ کے اجراء احکام کا اس درجہ غلبہ ہے کہ اگر ایک ادنیٰ حاکم ضلع بھی حکم جاری کر دے کہ مساجد میں نماز جماعت ادا نہ کی جائے تو کسی غریب یا امیر مسلمان کی طاقت وقوت نہیں ہے کہ مسجد میں جا کر نماز ادا کر سکے۔

اسی طرح یہاں جو جمعہ وعیدین کی ادائیگی ہوتی ہے یا عدالت میں بھی بعض قوانین فقہ پر عمل ہوتا ہے وہ بھی محض کفار کے اس حکم کے تحت ہے کہ جس سے ہر شخص کو اپنے دین کے موافق عمل کرنے کی اجازت دی گئی ہے (یعنی جب چاہیں وہ اس حکم کو منسوخ بھی کر سکتے ہیں' رہی یہ دلیل کہ ہم لوگ ابھی تک اسی سابق امن سلاطین اسلام کے تحت امان میں ہیں' یہ بھی غلط ہے کون عاقل کہہ سکتا ہے کہ جو امن شاہ عالم نے عطا کیا تھا ہم اسی کی وجہ سے اسوقت مامون بیٹھے ہوئے ہیں' بلکہ ظاہر ہے کفار نصاریٰ کے جدید امن سے ہمیں موجودہ امان ملا ہوا ہے' رہی دارالحرب کی یہ شرط کہ وہ کسی طرف سے کسی دارالاسلام کے حصہ سے ملحق ومتصل نہ ہو' وہ شرط بلا دوقری کے اندر ہے ممالک واقالیم میں نہیں ہے۔ کیونکہ ایک شہر وقریہ کے لوگ اپنے قریبی شہر وقریہ والوں کی مدد کر سکتے ہیں مگر ممالک میں یہ بات دشوار ہے کون کہہ سکتا ہے کہ افغانستان ہندوستان سے ملحق ہے تو اس کے لوگ یہاں آ کر کفار کو ملک سے نکال سکتے ہیں' حاشا وکلا۔ بلکہ ان کا نکالنا نہایت دشوار ہے بہر حال! ہندوستان پر کفار کا تسلط اس درجہ ہے کہ کسی وقت بھی اس سے زیادہ مستحکم تسلط وغلبہ کفار کو کسی دارالحرب میں نہیں ہوا۔ اور مسلمانوں کی مراسم اسلام کی ادائیگی محض ان کی اجازت پر ہے' مسلمانوں سے زیادہ عاجز ترین رعایا کوئی نہیں ہے' ہنود کو بھی اس سے زیادہ رسوخ حاصل ہے البتہ رام پورہ' ٹونک' بھوپال وغیرہ (اسلامی ریاستوں) میں باوجود کفار کے ماتحت ہونے کے چونکہ مسلمان نواب کی طرف سے احکام اسلام جاری ہیں' ان کو" دارالاسلام" کہہ سکتے ہیں جیسا کہ ردالمختار کی روایات سے مستفاد ہوتا ہے۔ **واللہ اعلم و علمہ احکم**

میں مولانا منت اللہ صاحب کا نہایت شکر گزار ہوں کہ ان کی وجہ سے حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کے ارشادات گرامی کا مذکورہ بالا خلاصہ پیش کر سکا۔ **سبحانک لاعلم لنا الا ما علمتنا' انک انت السمیع العلیم.**

ختم شد

معذرت: مقدمہ انوار الباری کے دونوں حصوں میں صرف ان محدثین کے تذکرے لکھنے کا اہتمام کیا گیا تھا جن کی علم حدیث میں کوئی تصنیف یا نمایاں درس ہوتا ہم بہت سے قابل ذکر حضرات اس لئے رہ گئے کہ بوقت تالیف ان کے حالات کا علم نہ ہو سکا' کتاب کے دونوں حصے شائع ہو چکے تو بہت سے بزرگوں اور احباب کے خطوط آئے' جس میں باقی ماندہ حضرات کی نشاندہی کی گئی ان میں واقعی بڑے بڑے حضرات ایسے ہیں' جن کے ذکر سے مقدمہ مذکور کا خالی ہونا' طبیعت پر بہت بار ہے' اس لئے ارادہ کیا ہے کہ ایسے حضرات کا ذکر کسی جلد کے ساتھ بطور ضمیمہ شامل کر کے پورا کیا جائے گا' یا حجم زیادہ ہونے کی صورت میں ایک جلد ہی مستقل شائع کر دی جائیگی۔

جن حضرات نے ایسے محدثین کے حالات ناقص بھیجے ہیں وہ کسی وقت ان کی تکمیل بھی فرما دیں میں ان سب حضرات کی توجہ وکرم کا نہایت ممنون ہوں کہ میری کوتاہی پر متنبہ کیا۔ وعند اللہ فی ذاک الجزاء" "مولف"

مکاتیب گرامی حضرات اکابر وافاضل دامت فیوضہم

''مبارک خواب'' مقدمہ انوارالباری جلد دوم کے آخر میں ایک خواب کا ذکر ہو چکا ہے' جس میں حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کی منامی زیارت وتاثرات کا بیان ہوا ہے' انوارالباری کے افتتاح مبارک پر ایک نہایت مبارک خواب جو ایک مدارسی بزرگ نے دیکھا اور محترم ومخلصم مولانا ذاکر حسن صاحب پھلتی دامت برکاتہم نے لکھ کر' راقم الحروف کو بھیجا' یہاں درج کیا جا رہا ہے جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا تھا' عاجز راقم ان برکات کی اہلیت اپنے اندر نہیں دیکھتا' جو کچھ سامنے ہے' وہ سب محض خدائے تعالیٰ جل ذکرہ کا فضل وانعام ہے' اور صرف بطور تحدیث نعمت ان کو پیش کرنے کی جرأت کرسکا (و ما بکم من نعمة فمن الله)

پہلا مکتوب

وہ عظیم الشان خوشخبری یہ ہے کہ میرے ایک دوست وشریک حلقہ تفسیر جناب عبدالرشید صاحب نہایت متقی پرہیزگار آدمی ہیں' اگرچہ علوم عربیہ سے عامی ہیں۔ مگر علم وعلماء سے بہت دلچسپی رکھتے ہیں' آپ کی مؤلفہ کتاب انوار الباری شرح بخاری شریف کے ممبر خریداری بھی ہیں (جن کا نام فہرست مرسلہ میں جا چکا ہے' اور احقر کی ترغیب پر ممبر بنانے کے لیے بڑے ساعی ہیں چنانچہ کئی ممبر وہ اپنے حلقہ احباب سے بنا چکے ہیں) اس اثناء میں جب کہ بندہ کتاب مذکورہ کی جلدوں کی پیشگی قیمت وصول کرنے کی تحریک کر رہا تھا اور وہ ممبر سازی میں ساعی تھے' انہوں نے ایک نہایت مبارک خواب دیکھا ہے جو اگرچہ دلیل قطعی نہیں مگر انوارالباری کی مقبولیت عنداللہ کے قرائن میں سے ضرور ہے۔

رویاء صالحہ کی کیفیت یہ ہے کہ نماز فجر کے وقت سے ذرا پہلے انہوں نے خواب میں دیکھا کہ ''میں چند ساتھیوں کے ساتھ سفر کرتے ہوئے مدینہ منورہ پہنچا اور مسجد نبوی میں جا قیام کیا' اس وقت ٹھیک نماز کا وقت تھا' غالباً نماز عصر کا' میں نے وضوء کی تیاری کی' ہاتھ میں مسواک تھی پشت قبلہ کی طرف تھی اور سامنے حوض تھا جس کے کنارہ پر ایک بزرگ ہستی مسواک لیے ہوئے وضو کر رہے تھے' اسی وقت کچھ لوگوں نے مجھ سے باہر چلنے پر اصرار کیا اور میں نے یہ کہہ کر انکار کیا کہ نماز کا وقت ہے اور کہا کہ سامنے یہ جو بزرگ شخصیت ہے' وہ ہمارے آقائے نامدار محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اتنا سننا تھا کہ وہ حضرت میری نظروں سے غائب ہو گئے' پھر دیکھا کہ میرے پاس ایک کاغذ تھا جس میں انوارالباری کے ممبروں کی فہرست تھی اور میں مسجد کے راستے میں تھا مسجد کے راستہ میں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے تھے۔ یہ میری دوسری نظر تھی' حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ فہرست مجھ سے طلب فرمائی' میں نے پیش کر دی۔ ساتھ ہی کتاب کا ایڈریس بھی دیا' پھر دیکھا کہ ہم نماز سے فارغ ہوئے تو ایک اعرابی مجھے مہمان بنا کر اپنے گھر لے گیا' جہاں بہت سی پوشاک لٹکی ہوئی تھیں انہوں نے مجھے سو روپیہ بھی دیئے' میں نے لیے پھر نہ معلوم کیوں میں روپیہ واپس کرنے گیا (غالباً اس خیال سے کہ ان کو تکلیف دینا مناسب نہیں) تو انہوں نے صرف آدھی رقم مجھ سے یہ کہہ کر لے لی کہ میں مسجد ہی میں پہچان گیا تھا کہ تم پریشان حال ہو' انتہی بلفظہ واضح ہو کہ یہ صاحب پہلے بھی کئی بار زیارۃ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرف ہو چکے ہیں' اس منام میں انوارالباری کے ممبروں کی فہرست طلب فرمانا ممبران کے لیے عموماً اور جناب کی مؤلفہ کتاب کے لیے خصوصاً مقبولیت بارگاہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے قرائن ہیں اور یہ وہ بشارت ہے' جس پر آپ جس قدر بھی خوشی محسوس فرمائیں کم ہے' دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری اور آپ کی خدمات کو شرف قبولیت بخشے۔ احقر ذاکر حسن عفی عنه

دوسرا مکتوب گرامی

آج صبح ایک لفافہ مشتمل بر بشارۃ عظمیٰ لکھ چکا ہوں جس میں ایک گوشہ رہ گیا تھا' شام کو صاحب رویاء سے مل کر اس کی تشریح دریافت کی' اور اطلاع کے لیے یہ خط لکھ رہا ہوں وہ یہ کہ رائی نے دیکھا کہ حضور نے فہرست طلب فرمائی اور ایڈریس بھی' میں نے فہرست مع ایڈریس پیش کی' اس ایڈریس (پتہ) سے مراد آپ کا پتہ ہے یعنی کتاب انوارالباری ملنے کا پتہ بھی حضور نے طلب فرمایا پس مبارک ہو اور پھر مبارک ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی گویا آپ سے یہ کتاب طلب فرمانا چاہتے ہیں اور کتاب ملنے کا پتہ طلب فرمارہے ہیں' اور بندہ نے کتاب کا پتہ آپ کے اسم گرامی کے ساتھ سب کو دیا ہے نہ صرف مکتبہ کا' کیا اس تصریح کے بعد بھی آپ کی خدمات اور انوارالباری کی قبولیت بارگاہ نبوی میں کوئی ریب باقی رہ سکتا ہے۔ پس کمر ہمت باندھیں اور عوائق وموانع سے مقابلہ کی ٹھان کر اس کام کو جلد از جلد مکمل کرنے کا عزم بالجزم کریں اور یقین کریں کہ ان شاء اللہ آپ کی یہ خدمت آپ کو دنیا اور آخرۃ میں نافع اور تجارۃ لن تبور ثابت ہوگی احقر ذاکر حسن عفی عنہ۔

مکتوب گرامی حضرت شیخ الحدیث مولانا العلام محمد زکریا سہارنپوری رحمہ اللہ

چند روز ہوئے ہدیہ سینہ مرسلہ سامی ایسے وقت پہنچا کہ میں اس وقت بہت مشغول تھا' مگر اس کے باوجود اس کی مجمل نظر اور ورق گردانی تو اسی وقت شروع کر دی تھی' دوسرے ہی دن رسید وشکریہ لکھنے کا ارادہ تھا مگر حضرت اقدس رائپوری کے سفر پاکستان کی وجہ سے بے ارادہ رائپور جانا پڑ گیا' اس لیے عریضہ میں تاخیر ہوئی حق تعالیٰ شانہ اپنے فضل وکرم سے دارین میں اس کی جزائے خیر اپنے شایان شان عطا فرمائے اور اس کے ذریعے سے دین ودنیا کے منافع سے تمتع عطا فرمائے' سرسری نظر میں جتنی اب تک دیکھی اس میں تو صرف ایک ہی چیز گراں ہوئی' اس میں کوئی مبالغہ یا تصنع نہیں ہے کہ اس ناکارہ کا ذکر اس میں بے محل تھا' نیز یہ بھی درخواست ہے کہ آئندہ جلدوں میں ہدایا کا سلسلہ ختم فرما کر ہر جلد بے تکلف قیمتاً ارسال فرمادیا کریں کہ اس طرح ہدایا میں تو اس سلسلہ لمبا ہو جائے گا۔ اور اس ناکارہ کو قیمتاً خریدنا بار نہیں ہے۔ (زکریا مظاہر علوم ۲۹ ذیقعدہ ۸۱ھ)

مکتوب گرامی حضرت المحدث العلام مولانا المفتی سید محمد مہدی حسن شاہجہانپوری رحمہ اللہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بعد الحمد ہر آن چیز کہ خاطر میخواست آخر آمد زپس پردۂ تقدیر پدید

محترم بندہ زادت افادا تہم' عرصہ سے دل ودماغ میں یہ امر جاگزیں تھا کہ اردو زبان میں حدیث کی کسی کتاب کی خصوصاً صحیح بخاری کی شرح حنفی مکتب خیال کی طرف سے ہوتی تو بہت ہی مفید ہوتی' کتب متداولہ حدیث کے ترجمے اور شروح اردو میں دوسرے حضرات نے کئے ہیں جو آج موجود ہیں' لیکن پھر ضرورت تھی کہ کوئی اللہ کا بندہ اس کی طرف توجہ کرتا۔ قابل صد مبارکباد ہیں۔

کہ آپ نے اس اہم فریضہ کی ادائیگی کی سعی فرمائی' اور صحیح بخاری جیسی اہم کتاب کی اردو میں شرح لکھنی شروع کی خصوصاً امام العصر حضرت رئیس المحدثین فی عصرہ مولانا السید انور شاہ صاحب قدس سرہ کے افادات کو پیش کرنے کا قصد فرمایا ہے تا کہ مجھ جیسے نااہل طلبا کو بھی استفادہ کرنے کا موقع ہاتھ آجائے' خدائے وحدہ لاشریک کا شکر ہے کہ آپ نے انوارالباری شرح صحیح البخاری کا مقدمہ جو دو حصوں میں پیش کیا ہے اور جو اس میں کاوش کی ہے اس کی داد نہ دینا مستقل ظلم ہے' برسہا برس سے جو امور زاویہ خمول اور پردۂ گمنامی میں پڑے تھے یا ڈال دیے گئے تھے' ان سے پردہ ہٹا دیا ہے' مقدمہ کے دونوں حصوں کو پڑھا اور زبان سے یہ نکلتا رہا ہے ع "اللہ کرے زور قلم اور زیادہ" دونوں حصوں میں علم فقہ

وحدیث اور فقہا ومحدثین خصوصاً امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور ان کے تلامذہ اور تدوین فقہ اور حدیث دانی کی مکمل ومختصر تاریخ پیش کردی اور بڑی جانکاہی اور کاوش سے ان امور سے پردہ اٹھادیا جواب تک پردہ خفا میں تھے مقدمہ بہت قیمتی اور بیش بہا معلومات پر مشتمل ہے حقیقت یہ ہے کہ یہ مقدمہ اردودان طبقہ کے لیے ہی نہیں بلکہ طلبائے علم حدیث اور علماء کے لیے بھی مفید اور نادر تحفہ ہے اب تک امام صاحب اور ان کے تلامذہ اور حنفی مذہب کے خلاف اور اہل الرائے ہونے کا جو پروپیگنڈہ کیا جارہا ہے اس مقدمہ نے اس کی اصلی صورت پیش کردی اور اس کے پردوں کو چاک کردیا' شواہد ونظائر پیش کر کے ان توہمات وشبہات اور اعتراضات کو دور کردیا' جن پر اغیار نے بنیادیں کھڑی کررکھی ہیں۔ جزاکم اللہ عناو عن جمیع الاحناف دلی مسرت ومبارکباد پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہو کہ انوار الباری کی تکمیل اسی کوشش وکاوش کے ساتھ ہو جائے کہ علمی طبقہ اس سے مستفید ہو' آمین۔ مقدمہ نایاب تحفہ ہے اور کافی مواد کا جامع' اوہام کا دافع اور اعتراض وغلط پروپیگنڈے کا قاطع وقالع ہے' مسلسل بیماری کی حالت آپ نے دیکھی ہے' انہیں امراض میں مبتلا ہوں' پھر بھی مقدمہ کو پڑھتا رہا اور مستفید ہوتا رہا۔ والسلام۔

سید مہدی حسن مفتی دار العلوم دیوبند

مکتوب گرامی حضرت المحدث العلام مولانا المفتی محمد شفیع دیوبندی رحمہ اللہ

کرم فرماء محترم مولانا احمد رضا صاحب دام فضلہ'

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

امید کہ مزاج گرامی قرین عافیت ہوگا' سب سے پہلے تو یہ معذرت پیش کرنا ہے کہ آپ کے دوگرامی نامے اس عرصہ میں وصول ہوئے ہیں کسی کا بھی جواب نہ دے سکا کیونکہ سرسری دیکھ کر کچھ لکھنا مناسب نہ سمجھا' تفصیلی مطالعہ کے انتظار وفرصت میں وقت گذرتا رہا اب کچھ وقت ملا تو سطور ذیل لکھ رہا ہوں۔

انوار الباری شرح اردو صحیح بخاری کا پہلے اشتہار نظر پڑا اس کا شاندار مقدمہ جلد اول مرسلہ آں محترم پہنچا' اشتہار دیکھ کر ایسی مسرت ہوئی کہ جیسے کسی کی دیرینہ آرزو پوری ہوجائے' میرے نزدیک یہ وقت کی اہم ضرورت ہے کہ صحیح بخاری کی شرح معتدل اور مناسب انداز میں اردو زبان میں آجائے' استاذ محترم حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی قدس سرہ نے اپنے آخری درس بخاری کی تقریر کو بڑے اہتمام سے ضبط کرا کر اور اس پر نظر ثانی فرما کر اسی مقصد کے لیے تیار کرایا تھا کہ اس کے ذریعہ ایک حد تک یہ مقصد پورا ہو سکے گا' مگر افسوس کہ وہ مسودہ ہی باہمی اختلافات کی نذر ہو کر رہ گیا۔

آپ نے اس کام کو شروع کیا' حضرت استاذ العلامہ حضرت شاہ صاحب قدس سرہ سے آپ کی خصوصیت اور مجلس علمی کی خدمات پہلے سے معلوم تھیں اس لیے بہت ہی مسرت ہوئی کہ یہ کام باحسن اسلوب انجام پاجائے گا اور دعا ہے کہ حسب مراد نافع ومقبول صورت میں انجام پائے' مقدمہ کے دیکھنے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس معاملہ میں آپ نے ماشاءاللہ کافی محنت کر کے معلومات کا بہت بڑا مواد کتب حدیث سے جمع فرمادیا ہے۔

دوسرے مکتوب گرامی میں تحریر فرمایا:۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

عنایت نامہ پھر مقدمہ انوار الباری جلد ثانی وصول ہوئی ابھی تک تفصیلی مطالعہ کا وقت نہیں ملا' سرسری انداز میں نظر ڈالی ماشاء اللہ ہر حیثیت سے بہتر نظر آئی' آپ نے بڑی محنت شاقہ برداشت فرمائی' اللہ تعالیٰ جزا خیر عطا فرمائے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کی نظر اس پر مرکوز رہے کہ اس زمانے کا فتنہ اہل حدیث نہیں بلکہ منکرین حدیث ہیں اساطین امت اکابر محدثین کو کسی ایسے انداز سے پیش کرنا جس کی بناء پر منکرین حدیث کو نفس حدیث پر جرح کرنے میں بہانہ مل جائے' اس تصنیف میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وقت کا سب سے بڑا خطرہ اہلحدیث کی

مخالفت اور حنفیت پر اعتراض کو بجھ کراسی کی مدافعت پر زور دیا گیا ہے حالانکہ اس وقت دنیائے اسلام کو دوسرے فتنوں نے گھیر رکھا ہے' ہمارے کسی حرف سے ان فتنوں کو سہارا ملنا ایک مصیبت ہے' بس اس کا خیال ہر قدم پر رکھا جائے' نفس حدیث کی خدمت اس کے ذریعے موجودہ دور کے فتنوں کی مدافعت کو بحث وتحقیق کا اصل محور قرار دینا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو توفیق مزید عطا فرمائے' یہ ناکارہ خلائق تو اب کسی کام کا رہا نہیں' آپ حضرات کی مساعی جمیلہ کو دیکھ کر خوش ہولیتا ہے۔

والسلام بندہ محمد شفیع عفا عنہ ۲۹۔۱۱۔۸۱ھ

مکتوب گرامی حضرت المحدث العلام مولانا ابوالوفا افغانی مدیر احیاء المعارف النعمانیہ حیدرآباد دکن

زبدۃ الخلان واخلص الاخوان سیادت مآب مولانا سید احمد رضا صاحب دام مجدہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ ۵ ذی الحجہ کو مکتوب مبارک شرف صدور لایا موجب مسرت ہوا' اس کے قبل مقدمہ انوار الباری کا حصہ ثانیہ بھی وصول ہوا' دیکھ کر آنکھوں کے لیے نور دل کے لیے سرور ہوا و ای سرور لا یمکن تعبیرہ سچ ہے کم ترک الاول للآخر جلد اول کے مطالعہ سے میں فارغ ہوا' طباعت کی غلطیوں پر نشانات کرتا گیا' نیز جہاں کچھ کلام تھا' اس پر بھی نشانات کرتا گیا' لیکن اب فرصت بھی کہاں کہ دوبارہ مراجعت کرکے اپنے تاثرات کی اطلاع دے سکوں' البتہ اتنا ضرور کہوں گا کہ یہ صرف آپ ہی کے لیے مقدر کہ اتنا کام کیا' اس کے قبل کسی بڑے سے بڑے عالم سے نہ ہو سکا البتہ تراجم کی ترتیب جیسے چاہئے نہ ہوسکی' مکررات بھی ہوئے' اگرچہ اس کے بھی وجوہات ہیں' لیکن حروف معجم یا طبقات پر اسماء کو مرتب کرنا چاہئے تھا' دوسرے حصہ کا مطالعہ تو ابھی شروع نہیں کیا' کیونکہ مواقع موجود ہیں' لیکن نشان زدہ مقامات کے کئی تراجم کا مطالعہ کر چکا ہوں' بخاریؒ کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے زائد لکھنے کا حق تھا' جو بھی لکھا ہے بہت ہی احتیاط سے لکھا ہے' ہاں ان ہی بزرگوں کی وجہ سے ہم کو ہمیشہ شکست ہی ہوتی رہی' ان کو تو گالیاں سننے ہی میں مزہ آتا ہے اور السن بالسن و الجروح قصاص کو بھول گئے ہیں' آپ سے کوئی تیزی نہیں ہوئی قال ابو عبد اللہ خالف رسول اللہ واجاز الخداع بین المسلمین دیکھ کر سر نیچے کرکے گزرنے سے ہی تیزی دفع ہوتی ہے اور بخاری کے متعلق کچھ نہ کہنا چاہئے کیونکہ وہ تو معصوم ہیں' آپ تو بہت سے واقعات سے چشم پوشی کرکے گذر گئے، سقاًسقاً کی روایت تو کی ہی نہیں' نہ اس کا ذکر آیا' بخارا سے اخراج کے کیا اسباب تھے' اس کا بھی ذکر کہاں کیا' نسائی سے امام صاحب کی روایت کے اخراج کا قیاس صحیح نہیں' سنن کے رواۃ کے اختلاف کی بناء پر ایسا ہوا ہے' ابوعلی السیوطی اور مغاربہ کی روایت میں امام صاحب کی روایت ہے' حمزہ بن سنی اور ابن حیوۃ کی روایت میں نہیں' رواۃ کتاب کی وجہ سے زیادتی کمی کتب میں ہوا ہی کرتی ہے۔ موطا کو لیجئے' سنن ابوداؤد کو لیجئے' ضرورت اس کی ہے کہ متعدد نسخ کو جمع کرکے اختلافات جمع کرکے اس کی اشاعت ہونا چاہئے تو تمام روایات ظہور میں آجاتی ہیں' جیسے بخاری وابوداؤد کے لیے اہتمام کیا گیا ہے' ابن تیمیہ کے متعلق بھی آپ نے بہت ہی نرمی سے کام لیا ہے' مولوی نذیر حسین دہلوی کو ترکی حکومت کی جانب سے مکہ مکرمہ میں تائب کیا گیا اور انہوں نے اقرار کیا کہ میں حنفی ہوں اس کا ذکر بھی کرنا چاہئے تھا' توبہ نامہ اسی وقت ان کے دستخط سے مکہ میں شائع ہوا تھا' نیز شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے متعلق بھی بہت کم لکھا گیا' حنفی مذہب پر جتنی ان کی کاری ضربیں ہیں کچھ کم نہیں' کیا مولانا اسماعیل دہلوی حنفی تھے' ان کے اقوال وافعال حنفیت کی ضد کے حامل نہیں؟ نہ معلوم ان کی حنفیت کی کون سی دلیل موجود ہے؟ پشاور کے علماء سے ان کی حنفیت کی تصدیق کرانا چاہئے' مولوی نذیر حسین کا قول ہدایہ پڑھاتے وقت وہ ابوحنیفہ کو گولی لگی وہ ابو یوسف کو وہ محمد کو وہ زفر کو' مالک کو شافعی کو گولی لگی سن کر ان بعض بزرگوں کو بڑی خوشی ہوئی ہوگی' صدیق حسن نے تو احناف کے گھر پر قبضہ کرکے ان کے مال سے ان کے خلاف اس میں دکان لگائی تھی' لیکن اللہ جل شانہ کے فیصلوں کا مقابلہ کون کرسکتا ہے' ایسا مٹا دیا کہ لاکھوں روپیہ جو صرف ہوئے تھے دریا برد ہوگئے کانہ لم یکن شیئا

مذکور ا۔ غرضیکہ آپ نے جو بھی کچھ لکھا ہے حق لکھا ہے' اس میں کسی کی پروانہیں کرنا چاہئے' زبانی جمع و خرچ مجالس میں رہ جائے گا' اور آپ کی کتاب صدیوں یادگار زمانہ ہوگی' ان شاء اللہ یہ فضیلت آپ ہی کے لیے لکھی گئی تھی ع ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں' احناف بزرگوں کو صدیوں سے گالیاں کھاتے کھاتے سننے کی عادت ہوگئی' اس میں لذت محسوس کرتے ہیں اس لیے ان کو ناگوار ہے کہ سب وشتم کرنے والے کو دبی زبان سے بھی جواب دیا جائے' منکرین حدیث تو اس سے پہلے بھی آپ کے جوابات دینے سے فائدہ اٹھائے ہوئے ہیں آپ کے اقوال کو پیش کرتے رہتے ہیں اس کا کیا جواب ہے کوئی نئی بات نہیں' مسلم نے بخاری کے متعلق کیسے الفاظ استعمال کئے ہیں' حاکم نے تو دونوں پر ایسا مواخذہ کیا کہ ایک بڑی کتاب ہی ان کی فروگذاشت میں لکھ ڈالی' ابو حاتم نے تو بخاری کی تاریخ پر تاریخ اس لیے مرتب کی کہ اس میں ان کی غلطیاں اور فروگذاشتیں بتلائیں' ان پر کیوں نگاہ نہیں ہوئی پھر فقہاء احناف ہمیشہ ان کی تردیدیں کرتے ہی رہے ہیں' ابو بکر رازی' ابو بکر سرخسی' ابو الحسین قدوری' عینی ابن ہمام' امیر کاتب اتقانی اگر منکرین حدیث ان کے اقوال سے استدلال کریں تو اس کا کیا جواب ہوگا' خود امام احمد رحمہ اللہ نے امام مالک و اہل مدینہ پر کچھ کم نہیں لکھا' پھر امام شافعی نے کیا کمی کی' ابن حزم نے کسے چھوڑا' احناف نے تو اب تک مدافعت ہی کی ہے۔

حالانکہ کتب رجال ان کے ہاتھ میں ہیں۔ اس سے لے کر خود ان کی گالی کا رخ ان ہی طرف پھیرنا چاہیے تھا' جارحانہ کارروائی ان کی جانب سے ہو تو سر تسلیم خم ہے لیکن ہمارے جانب سے گناہ کبیرہ ہے میں اب دوسری جلد کا تھوڑا تھوڑا مطالعہ کروں گا اس کے بعد لکھوں گا' لیکن اب بھی فہرست کو دیکھ کر بہت سے مقامات کا مطالعہ کر چکا ہوں' آپ نے کہیں بھی تجاوز نہیں کیا' یہ اللہ کا فضل ہے آپ پر اور حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمہ کا فیض صحبت ہے۔ ابو الوفا

تبصرۂ گرامی مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی رحمۃ اللہ علیہ

جیسا کہ اس کتاب کی جلد اول کے تعارف میں ان صفحات میں آچکا ہے' اصل کتاب صحیح بخاری کی شرح انوار الباری ہے جو حافظ حدیث علامہ شیخ انور کاشمیری دیوبندی کے افادات کا مجموعہ ہوگی اور یہ ابھی اس کا مفصل دلچسپ اور بصیرت افروز مقدمہ ہے جو دوسری جلد میں ختم ہوا ہے' اور اس میں علاوہ امام بخاری' امام مسلم' امام ترمذی وغیرہ ائمہ حدیث کے چھوٹے بڑوں پچاسوں (بلکہ شاید سینکڑوں' علمائے حدیث کا تذکرہ آگیا ہے کتاب کے مرتب مولانا بجنوری علاوہ اپنے جلالت علم کے بڑے اچھے اہل قلم بھی ہیں اس لیے سارے فنی مباحث کے باوجود ان کے بیان میں خشکی کہیں سے نہیں آنے پائی ہے اور کتاب طلبہ فن اور عام شائقین دونوں کے ہاتھوں میں جانے کے قابل ہے۔

ایک بڑی اور بہت بڑی بات یہ ہے کہ ان کے قلم میں توازن ہے وہ احترام ائمہ حدیث وائمہ فقہ دونوں کا پورا ملحوظ رکھتے ہیں اور پھر بھی ان میں سے کسی کی بھی عصمت و معصومیت کے قائل نہیں "سوائے انبیاء علیہم السلام کے کوئی معصوم عن الخطاء نہیں' ائمہ صحاح وائمہ متبوعین کو بھی معصوم نہیں کہہ سکتے" (صفحہ ۲/۴۷)

اس مضمون کے فقرے جا بجا ملتے ہیں' اور فاضل مرتب نے اسے عملاً بھی خوب بنایا ہے' اس دور میں حدیث کی یہ خدمت حدیث ہی کی نہیں' بلکہ کل علم دین کی ایک اہم و قابل قدر خدمت ہے۔

مکتوب گرامی جناب مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی (صدر شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

محب محترم و مکرم! السلام علیکم و رحمۃ اللہ

کل قاری رضوان اللہ صاحب سے انوار الباری کا حصہ دوم آپ کے والا نامہ کے ساتھ موصول ہوا' فرط اشتیاق میں اسی وقت ادھر ادھر سے پڑھنا شروع کیا' جی باغ باغ ہوگیا' خدا آپ کو خوش رکھے' ماشاء اللہ خوب کام کر رہے ہیں حضرت الاستاذ رحمہ اللہ کی شاگردی اور ذات

گرامی کے ساتھ شرف انتساب کا حق ادا کردیا۔ ''ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند''

جی ہاں! واقعی تبصرہ میں کافی دیر ہوگئی' میں خود بھی شرمسار ہوں' مگر اول تو کتب برائے تبصرہ کا انبار اس کا عام سبب ہے اور دوسری خاص وجہ یہ ہے کہ میں اس کتاب کے بعض مباحث اور خصوصاً امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں امام بخاری کی ناانصافیوں اور ان پر آپ کے تبصرہ پر خالص علمی رنگ میں کسی قدر تفصیل سے کلام کرنا چاہتا ہوں اور اس کے لیے فرصت نہیں نکال سکا ہوں' کیونکہ سرکاری اور دفتری گوناگوں مصروفیتوں کے علاوہ اپنی ایک ضخیم کتاب کی تالیف وتسوید میں بھی مشغول ہوں' بہرحال اب زیادہ تاخیر نہ ہوگی' یا تو مئی کے برہان میں ورنہ جون میں یقیناً دونوں حصوں پر ایک ساتھ تبصرہ آ جائے گا۔

آپ نے غالباً ابن ابی حاتم الرازی المتوفی ۳۲۷ھ کی کتاب'' **بیان خطاء محمد بن اسماعیل البخاری فی تاریخہ**''نہیں دیکھی ورنہ امام بخاری کی تاریخ دانی پر تبصرہ میں اس سے بھی کافی مدد مل سکتی تھی' یہ کتاب دائرۃ المعارف حیدرآباد نے شائع کیا ہے۔ حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذہ میں آپ نے اس نابکار وسیاہ اعمال کا بھی تذکرہ فرمایا ہے' اپنی علمی اور عملی ہیچ میرزی کے باعث اس آفتاب علم وطہارت نفس سے اپنی نسبت کا اعلان کرتے ہوئے سخت ندامت اور شرم محسوس ہوتی ہے۔ چنانچہ یقین کیجئے' جب میں نے اپنی نسبت آپ کی سطور پڑھیں تو شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ **و فقنا اللہ لما یحبہ و یرضاہ**

والسلام:۔ مخلص سعید احمد ۱۹ اپریل ۶۲ء

مکتوب گرامی محترم مولانا عزیز احمد صاحب بہاری دامت فیوضہم

استاد جامعہ اسلامیہ ڈابھیل اس دفعہ طباعت وکتابت' کاغذ' تصحیح کا ماشاء اللہ اچھا اہتمام رہا' مضامین تو ماشاء اللہ نور علیٰ نور بہت ہی دلپسند ہیں اور طرز بہت اچھا ہے۔ دفاع عن الحنفیہ نہایت ہی ابلغ اور اوضح پیرایہ میں ہے' ادب واحترام کا لحاظ تو بہت ہی قابل داد ہے' الامن ظلم والی صورت سے استفادہ کیا جا سکتا تھا' مگر اللہ تعالیٰ نے بڑی ہی نوازش فرمائی ہے کہ قلم بے باک نہیں ہوا' واقعتہً ہر حیثیت سے محنت اور کتاب مستحق صد ستائش ہے۔ والسلام عزیز احمد غفرلہٗ۔

مکتوب گرامی محترم مولانا امتیاز علی صاحب عرشی رضا لائبریری رامپور

صدیق مکرم ومحترم' علیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مقدمہ انوارالباری کا تحفۂ ثمینہ اور دو کرم نامہ مل چکے ہیں' میں نے مقدمہ کو از اول تا آخر پڑھ بھی لیا ہے اس میں دو تین جگہ نشان بھی بنائے ہیں ان شاء اللہ ذرا فرصت ملے تو لکھوں گا۔

مجموعی طور پر آپ نے بے حد دلسوزی اور تحقیق سے کام کیا ہے' جی چاہتا ہے کہ انوارالباری کو دیکھنے کی بھی سعادت نصیب ہو جائے۔ کاش! امام طحاوی کے بعد بھی احناف نے احادیث پر کام کیا ہوتا' اور مشکوٰۃ سے پہلے کوئی کتاب استعمال میں آنے لگی ہوتی' اب بہت دیر میں ہمیں ادھر توجہ ہوئی ہے' بہرحال ابھی وقت بہت ہے' خدا آپ کو صحت عطا فرمائے اور فراغ خاطر بھی۔ والسلام۔ مخلص عرشی۔

مکتوب گرامی محترم مولانا محمد ایوب صاحب قادری رحمۃ اللہ

جناب محترم مولانا محمد عبدالرشید نعمانی صاحب کے یہاں بخاری کا مقدمہ دو جلدوں میں دیکھا بے اختیار زبان سے تحسین وآفریں کی صدا نکلی' اللہ تعالیٰ آپ کو دارین میں جزائے خیر دے' اور آپ کے مراتب بلند فرمائے۔ خاکسار کی کتاب (ترجمہ تذکرہ علماء ہند) کے جو اکثر

جگہ حوالے ہیں اس کے لیے دل سے شکر گذار ہوں میں خواہش مند ہوں کہ اس کی دونوں جلدیں انتہائی رعائتی قیمت پر مجھے بھیج دی جائیں۔ پاکستان میں قیمت ادا کردوں گا۔ امید ہے کہ جواب سے مشرف فرمایا جاؤں۔

فقط والسلام:۔ خاکسار محمد ایوب قادری کراچی نمبر ۵ ۳۱ اگست ۱۹۶۲ء۔

مکتوب گرامی شیخ التفسیر مولانا ذاکرحسن صاحب پھلتی بنگلور (مدارس) دام فضلہم وفیوضہم

مقدمہ انوارالباری ہر دو جلد بنظر غائر مطالعہ کرنے کے بعد میرے قلبی تاثرات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ تدوین فقہ کے وقت امام اعظمؒ کے پاس ذخیرہ حدیث کی قلت کے گمان کی تردید کس قدر واضح طور پر سیدنا امام بخاری کے ان حالات میں اس حقیقت سے ہو رہی ہے کہ انہوں نے طلب علم حدیث میں متعدد بلاد کا متعدد مرتبہ سفر کیا لیکن کوفہ اور بغداد کا سفر اتنی بار فرمایا جس کی کوئی تعداد معین نہیں ہو سکی' یہ اس امر کی بین شہادت ہے کہ امام بخاری کے وجود سے پہلے ہی عراق مرکز علم حدیث بن چکا تھا اور یہی وہ مرکز ہے جس میں امام اعظم اور آپ کے اصحاب نے فقہ و اصول فقہ کے علوم مدون فرمائے۔

متاخرین کی تضعیف کے بارے میں مقدمہ صفحہ ۴/۲۱ پر جو آپ نے علامہ ابن امیر الحاج کا قول نقل فرمایا ہے وہ درایۃً اور واقعۃً بڑا وزن رکھتا ہے اور اس سے اصح الکتب بعد کتاب اللہ کی حقیقت واضح ہو جاتی' تاریخ حدیث کے مطالعہ سے یہ حقیقت بالکل کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ مذہب اربعہ کی بنیاد صحاح ستہ پر ہرگز نہیں ہے بلکہ اس عظیم ذخیرہ احادیث پر تھی' جس کا کچھ حصہ بروایت صحیحہ وضعیفہ از متقدمین اصحاب صحاح ستہ کو بھی بعد میں نصیب ہوا' اور کچھ فوت بھی ہو گیا جس کی وجہ سے متاخرین اہل حدیث کو متقدمین سے الگ راہ اختیار کرنی پڑی اور انہوں نے اپنی بساط بھر جو ذخیرہ حدیث جمع کیا تھا اسی پر ان کو اپنے اجتہاد کی اساس قائم کرنی پڑی۔

(۲) آپ کی عمیق تحقیقات سے جلیل القدر محدثین کا محدثین احناف کے ساتھ خطرناک حد تک تعصبات کا برتاؤ طشت از بام ہوا ہے جو بہت زیادہ قابل تحسین ولائق صد شکر ہے' عوام تو کیا اکثر علماء بھی محدثین کی جلالت سے اس قدر مرعوب ہیں کہ ان کے بعض لچر ملفوظات کو بھی عموماً قبول کرتے رہتے ہیں' اور پھر اپنی مذہبی تحقیقات کے بارے میں متردد ہو جاتے ہیں اس تردد کی جھلک ہندوستان کے بعض بڑے بڑے علماء کی تحریرات میں بھی پائی جاتی ہے' جزاک اللہ کہ آپ نے اس تردد کے رفع ہو جانے کا پورا سامان اس طرح مہیا فرما دیا ہے' امیر المومنین فی الحدیث علامہ ابن مبارک کا تلمذ امام اعظمؒ سے اس قدر اظہر من الشمس ہے کہ کوئی عالم حدیث اس سے ناواقف نہیں رہ سکتا اس کے باوجود ترجمہ ابن مبارکؒ مندرجہ تہذیب میں ان کا اس سے سکوت لاعلمی پر کسی طرح بھی محمول نہیں کیا جا سکتا جب کہ وہ مسلم ماہر علم اسماء رجال ہیں' پھر ان کا یہ سکوت جس امر کی غمازی کر رہا ہے اس کو زبان قلم پر لایا نہیں جا سکتا ہر شخص خود اپنے ضمیر سے دریافت کر سکتا ہے۔

۳۔ مقدمہ صفحہ ۲/۱۶ پر مولانا عبدالرؤف صاحب رحمانی کی یہ لغزش کہ انہوں نے تعلیقات بخاریؒ کو ایسے عظیم ذخیرہ سے ماخوذ بتایا جس میں سے بعض ذخائر کا وجود بھی امام بخاری کے زمانے میں نہ تھا' بڑی عجیب بات ہے' شاید وہ مدعی سست گواہ چست والا مقولہ ایسے ہی مواقع کے لیے کہا گیا ہے۔

۴۔ تاریخ کبیر میں سیدنا امام بخاری کے قول دربارہ ارجاء امام اعظمؒ وسکت الناس عنہ و عن رائیہ و حدیثہ۔ کو علامہ کوثری کے جوابات نے ہباءً منثوراً کر دیا ہے اور آپ کے نقد کا لہجہ اگرچہ بعض حضرات کے نزدیک تیز ہو لیکن احقر اس میں آپ کو بالکل معذور سمجھتا ہے کیونکہ ان کا یہ قول واقعہ کے بالکل خلاف ہے' جب کہ امت کا دو ثلث حصہ ان کے فقہ کو تسلیم کرتا ہے اور سینکڑوں اولیاء کرامؒ نے من جانب اللہ حق مانا ہے' شاید سیدنا امام بخاریؒ کے تنقیح کردہ شرائط ان کے ذہن میں روایت عن الرسول تک محدود تھے باقی افراد امت کے بارہ میں وہ ہر کہ ومہ کی روایت قبول کرنا جائز خیال فرماتے ہوں گے مگر یہ اصول محل نظر ہے جب کہ قرآنی آیت کریمہ۔ یایھا الذین امنوا ان جاء کم فاسق

بنباء فتبينوا الاية۔ یہ سب کے نزدیک اپنے عموم پر ہے واقعی بلامرعوبیت و برعایت حسن ادب' ان حقائق کو آپ نے درج فرما کر ہم جیسوں کم علموں پر بڑا احسان فرمایا ہے ان تحقیقات کو پڑھ کر دل سے دعا نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو عمر طویل و توفیق کارہائے جلیل عطا فرمائے۔

۵-جہمیہ کی اتالیقی اور اسمٰعیل بن عرعرہ کی روایت از امام اعظمؒ اور پھر ان سے امام اعظمؒ کی تضعیف و تنقیص اور جہمیت مفروضہ پر استدلال جو تاریخ صغیر کے محترم مؤلفؒ نے اختیار فرمایا ہے' تحقیق وریسرچ کا وہ عجیب شاہکار ہے' جس کی نظیر ملنی مشکل ہے کہ تار عنکبوت بھی شاید اس سے زیادہ قوی ہو' حمیدی کی روایت متعلق سنن حجامت کا جواب علامہ کوثریؒ نے اور روایت سفیان بطریق نعیم بن حماد کا جواب آپ نے خوب دیا ہے۔ کتاب الضعفاء الصغیر میں تضعیف امام ابو یوسفؒ کا جواب آپ نے خوب دیا ہے' عقل حیران ہے کہ ایسے جلیل القدر محدثین کے ان مسامحات کی آخر کیا تاویل کی جائے' ایسے ہی شیخ حمیدی کے الزامات کی حقیقت جو آپ نے واضح فرمائی ہے۔ جزء القراءۃ خلف الامام میں حضرت امام اعظمؒ پر بے بنیاد الزامات دربارہ جواز خزیر بحری و بری السیف علی الامۃ کے لئے حقیقت الزام کا جو جواب آپ نے دیا ہے بڑا مسکت ہے' جزء رفع الیدین میں اڑتے والی روایت از ابن مبارکؒ کے مزاحیہ واقعہ کو استدلال میں پیش کرنا اور وہ بھی ایسے مسلم امام امت کی ضلالت پر' نعوذ باللہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ جس طرح حبک الشیء یعمی ویصم۔ صحیح ہے اسی طرح بغضک الشیء یعمی ویصم۔ بھی امر واقعی ہے۔

غرض ترجمہ سیدنا امام بخاری کے ذیل میں آپ نے بڑے غور وفکر اور تدبر سے کام لیا ہے اور دفاع عن الاحناف کا حق ادا کر دیا ہے' این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔

۶-مقدمہ صفحہ ۲/۳۰ اور اس کے بعد کے صفحات' میں آپ نے جو حضرت علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے ارشادات ذکر فرمائے ہیں بہت ہی قیمتی ہیں جن سے سیدنا امام بخاریؒ کے بارے میں بڑی بصیرت حاصل ہوئی' اوہام امام بخاریؒ کے عنوان میں بہت سے حقائق کا انکشاف ہوا' جن تک ہم جیسے ناکارہ لوگوں کی نظر نہیں پہنچ سکتی تھی۔ کیونکہ اگر ان پر غور کا ارادہ بھی کیا جائے تو حضرت امام بخاری کا تقدس جو ہم سب کے قلوب میں راسخ ہو چکا ہے مانع...... ہے' مگر حقیقت پھر حقیقت ہے جس کو واضح ہونا ہی چاہئے۔ سیدنا امام بخاریؒ اور ائمہ متبوعین کے درمیان جو فرق مراتب ہے گو وہ محققین کے نزدیک ظاہر ہے لیکن عوام پر بالکل مخفی ہے اچھا ہوا کہ آپ نے اس کی خوب وضاحت فرما دی' اوہام امام بخاریؒ کا ذکر اور پھر اس پر آپ کا محاکمہ دونوں اہم اور قابل لحاظ ولائق مطالعہ ہیں۔

۷-مقدمہ صفحہ ۲/۴۷' ۴۸ پر جو آپ نے چند ضروری امور کی تنقیح نہایت مختصر طور پر کر دی ہے' وہ بڑی ضروری تھی' مثلاً علو احادیث بخاری پر دیگر احادیث پر ان صلاح کے دعوے کی رکاکت اور دعوائے قطعیت احادیث بخاری کی حقیقت وغیرہ۔

۸-امام طحاویؒ کی غباوۃ پر جو روایت عموماً دیکھی گئی ہے۔ آپ نے اس کی خوب قلعی کھول دی ہے اور ان کا اپنے ماموں سے ترک تلمذ اور شیخ کی طرف رجوع کی اصل وجہ صحیح تحریر فرما کر اس عظیم مغالطہ کو رفع فرما دیا۔

۹-توافق امام ترمذیؒ بمذہب امام اعظم کی جو چند مثالیں آپ نے تحریر فرمائی ہیں۔ وہ احناف کے لئے اطمینان قلبی کا باعث ہیں' لیکن اگر استقصار کر دیا جاتا تو زیادہ مفید تھا' شاید بخوف طوالت چند امثلہ پر اکتفا فرمایا گیا ہے۔

۱۰-امام اعظم کے بارہ میں امام نسائی کی تضعیف کا بڑا دندان شکن جواب دیا ہے۔

آفریں باد بریں ہمت مردانہ تو!

۱۱-امام محمد بن شجاع ثلجی پر ابن جوزی و ابن عدی کے حملوں کا علامہ کوثریؒ نے جو رد فرمایا ہے اس میں واقعی حق دفاع ادا کر دیا ہے۔

۱۲-ابن حزمؒ کی وسعت علمی کا رعب ان کی کتب کے ناظرین پر بہت زبردست پڑتا ہے' لیکن حافظ ذہبیؒ و ابن حجرؒ نے اس کی خوب قلعی کھول دی ہے اور ہمارے حضرت علامہ کشمیریؒ نے ان کے تعصب از احناف کو خوب واشگاف فرمایا' جس کے مطالعہ کے بعد ان کی متعصبانہ رائے کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی۔

۱۳- مقدمہ صفحہ۲/ ۹۷ امام بیہقیؒ کے خلافیات پر جو آپ نے حضرت علامہ کشمیریؒ کا ریمارک تحریر فرمایا ہے اسے دیکھ کر طبیعت پھڑک اٹھی بڑا قیمتی ریمارک ہے یاران عصبیت نے حنفیہ پر کیا کیا ستم ڈھائے ہیں اللہ اکبر دیکھ کر تعجب وحیرت کی انتہا نہیں رہتی۔

۱۴- مقدمہ صفحہ۲/۱۲۴ پر علامہ ابن تیمیہؒ کے طرز تحقیق واستدلال پر حضرت شاہ صاحبؒ نے جو نقد فرمایا ہے بڑا عجیب ہے تاوقتیکہ ان کے لٹریچر کا گہرا مطالعہ نہ کیا جائے عام اذہان اس کو نہیں پاسکتے خصوصاً وہ جوان کی وسعت علمی سے مرعوب ہوں اس ریمارک اور دوسرے شواہد سے اندازہ ہوتا ہے کہ باوجود بے پایاں وسعت علمی کے ان کی نظر جذباتی زیادہ تھی جوایک مجاہد کی شان ہے لیکن تحقیقی میدان ایک دوسری چیز ہے۔ یہاں معتدل فکر ونظر کی ضرورت ہے جذباتی رائے کا ہر قول قابل استدلال نہیں ہوتا لیکن ہمارے مہربان غیر مقلدین ان کے ہر قول کو مستدل سمجھتے ہیں اور ہماری تنقیدان کے تمام اقوال کے قابل استناد ہونے نہ ہونے تک ہے ورنہ ان کی جلالت علمی سبھی کو مسلم ہے احقر کا خیال ہے کہ علامہ میں جذباتی ابھار بدعات کے بکثرت شیوع کی وجہ سے بطور ردعمل پیدا ہوا ہوگا۔ جس میں آپ معذور تھے یہ معلوم ہوکر کہ علامہ کے اساتذہ میں جلیل القدر احناف محدثین بھی تھے۔ ان کے مقلدین کے اس طعن پر بڑا تعجب ہوتا ہے کہ احناف میں محدثین نہیں ہیں بہر حال علامہؒ کے محاسن ان کی زلات سے زیادہ ہیں لہٰذا قابل صد احترام اور ان ہستیوں میں سے ہیں جن کا وجود امت کے لئے مغتنمات سے شمار ہوتا ہے رحمہ اللہ رحمۃ واسعہ۔

۱۵- مقدمہ صفحہ۲ ۱۳۰ پر حافظ ابن قیم کا ترجمہ آپ نے نہایت اعتدال ہے ان کا امام اعظمؒ کی طرف سے دفاع قابل صد شکر ہے زیارۃ قبور وغیرہ مسائل میں امحاء بدعات واستاذ گرامی کی محبت وخدمت کے جذبات میں انہوں نے اپنے استاد کی حمایت فرمائی لیکن اگر وہ صرف دلائل سے فیصلہ فرماتے تو امت کے لئے بہت بہتر ہوتا بہر حال ان کی خدمات جلیلہ کا اعتراف ہمارا فرض ہے۔

۱۶- صفحہ۲ ۱۴۴ پر حافظ ابن حجر کے ترجمہ میں طبقہ علماء کو ان کے تعصبات سے آپ نے آگاہ فرما کر بڑا احسان فرمایا ہے کیونکہ آج متداول کتب رجال انہیں کی ہیں جن پر عموماً اعتماد کیا جاتا ہے ایک شخص کے تعصب مزاجی کی وجہ سے امت کی ایک عظیم جماعت کا گرایا جانا ایسا عظیم مغالطہ ہے جس کی جواب دہی آخرت میں سخت مشکل ہے اور یہ ایک ایسا فتنہ ہے جس کا تدارک سوائے ان کے تعصبات کو اجاگر کرنے کے اور کسی طرح نہیں کیا جاسکتا لیکن اس موقعہ پر آپ کے اختصار نے تشنگی باقی چھوڑ دی کاش مزید امثلہ دی جاتیں۔

۱۷- صفحہ۲/ ۱۴۹ پر حافظ عینیؒ کے ترجمہ اور ان کی عمدۃ القاری کے مزایا وفضائل سے احقر بہت ہی محظوظ ہوا
اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

۱۸- صفحہ۲/ ۱۵۳ پر علامہ قاسم بن قطلو بغا مصریؒ کا ترجمہ جس انداز سے آپ نے کیا ہے آج تک نظر سے نہیں گزرا تھا۔ ایسے جلیل القدر محدث سے دوسرے تو کیا خود عامۂ احناف بھی اکثر ناواقف ہیں ان کی جلالت شان کی شہادت اس سے زیادہ اور کیا ہوسکتی ہے کہ کوئی حنفی نہیں بلکہ حنبلی محدث صاحب شذرات نے ان کو حسنات الدہر میں شمار فرمایا ہے۔ فالحمد للہ و جزاکم اللہ خیراً۔

۱۹- صفحہ۲/ ۱۷۸ پر محدثین کی صفت میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کا ترجمہ ایک عمدہ اور ضروری اضافہ ہے جس کا سہرا آپ کے سر ہے ورنہ عموماً لوگ ایک شیخ طریقت کی حیثیت سے آپ کو پہچانتے ہیں اس سلسلہ میں شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اور مولانا سیالکوٹیؒ کی مخالفت کا اصلی سبب جو آپ نے واضح فرمایا بہت خوب ہے ذکر مخالفت تو سب نے کیا ہے مگر اسباب کی تہہ تک پہنچنے کی بہت کم سعی کی گئی ہے۔

۲۰- صفحہ۲/ ۱۹۳ پر حضرت شاہ ولی اللہؒ کے ترجمہ میں ان کی ابتدائی وانتہائی تحقیق کا فصل آپ نے واضح کر کے اس تردد کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا ہے جو ان کی ابتدائی تصانیف عقد الجید وغیرہ کے مطالعہ سے ناظرین کو پیدا ہوتا ہے واقعی شیخ ابوطاہر کردی کی صحبت وتلمذ کا اثر ان تالیفات میں نمایاں ہے اور ایسا تاثر فطری چیز ہے لیکن ہر محقق کی آخری رائے ہی قابل اعتماد ہوتی ہے جو فیوض الحرمین نے واضح کر دی ہے اور پھر خود حضرت شاہ صاحب موصوف کی تحریر آخری عملانے اس پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے آپ کی یہ تلاش وجستجو اور ان کے ترجمہ میں اس کا

اضافہ بڑا قیمتی ہے جس کی جس قدر بھی قدر کی جائے کم ہے بندہ اس سے بہت زیادہ محظوظ ہوا۔

۲۱- صفحہ ۲/۲۱۲ پر حضرت شاہ عبدالغنی مجددی حنفیؒ کے ترجمہ میں یہ حقیقت آپ نے خوب واشگاف کی کہ مولانا سید نذیر حسین صاحبؒ جن کی محدثیت کا ڈنکا بجایا جارہا ہے ان کو شیخ الکل حضرت شاہ اسحق صاحبؒ سے علم حدیث میں باقاعدہ تلمذ حاصل نہ تھا اوران کی سند سند برکت تھی نہ اجازت پھر صاحب تحفۃ الاحوذی وغایت المقصود کے ڈھول کا پول کو خوب واضح کیا ہے۔ تعجب ہے کہ یہ حضرات عمل بالحدیث کے مدعی ہو کر اس قدر غلط بیانی اور کذب صریح سے کیسے کام لیتے ہیں۔

۔ گرہمیں مکتب وہمیں ملا الخ اور مقدمہ صفحہ ۲/۲۲۴ پر خود ان کے ترجمہ میں ان کے اساتذہ کا پتہ خوب دیا ہے نیز ان کی اہل وطن کے خلاف انگریزوں سے وفاداری کا راز بھی معلوم ہوا جس کی تصدیق کمشنر دہلی کا سفارشی خط اور شمس العلماء کا خطاب اور حطام دنیا کا انعام کررہا ہے اور کمال یہ کہ یہ سب بھی خود الحیاۃ بعد الممات (سوانح صاحب موصوف) کے مصنف کے قلم سے سبحان اللہ واقعی صاحب موصوف کے یہ کمالات ان کی ولایت ومحدثیت کے ایسے معجزات وخوارق ہیں جو یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ تاہم حضرت امام اعظم کے ساتھ ان کے حسن ادب آج کل کے مدعیان اجتہاد کے لئے قابل صد عبرت ہے۔

۲۲- صفحہ ۲/۲۵۹ پر علامہ مبارک پوری کے ترجمہ میں ان کی جلالت کا ادب ملحوظ رکھتے ہوئے تعصبات کی جو چند مثالیں آپ نے دی ہیں' ان سے ان حضرات کے معیار تحقیق کا خوب اندازہ ہوتا ہے ان مثالوں اور دیگر امثلہ کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ واقعی حنفیہ مظلوم ہیں' ظالم ماخوذ اور مظلوم انشاء اللہ منصور ہیں اور ناصر مظلوم ماجور باجر عظیم ہوگا۔

۲۳- صفحہ ۲/۲۳۲ پر حضرت علامہ حجۃ اللہ فی الارض انور شاہ صاحب کشمیری قدس اللہ سرہ کے ترجمہ میں اگرچہ آپ نے ان کی خصوصیات وفضائل دو تین صفحات میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے لیکن احقر کے نزدیک یہ تذکرہ حضرت والا کی شان تقدس وعلم کو واضح کرنے میں ناکافی ہے' ذرا زیادہ وضاحت فرمادیتے تو بہتر ہوتا۔ تاہم تراجم سے جس قدر تعارف کرایا جاسکتا ہے اس کے لئے اس قدر بھی کافی ہے' حقیقۃً حضرت والاؒ کی عظیم شخصیت سے تعارف کرانے کے لئے مستقل تصنیف کی ضرورت ہے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی باہمت بزرگ کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ (انوار الباری میں حضرتؒ کے علوم وتحقیقات کا بہ کثرت ذکر اسی کمی کا تدارک کرے گا ان شاء اللہ۔

۲۴- احناف محدثین کا جس قدر آپ نے استقصار فرمایا ہے وہ قابل صد تحسین ہے۔ خصوصاً اس سے اور بھی زیادہ مسرت ہوئی کہ اکثر محدثین ہند کا ذکر بلاتفریق وجماعتی تعصب درج فرمایا گیا ہے' بیشک اہل حق کا مسلک بھی یہی ہونا چاہئے کہ تمام اہل کمال کا اعتراف کیا جائے۔ فجزاکم اللہ تعالیٰ احسن الجزاء۔

۲۵- تراجم محدثین کے بالاستیعاب مطالعہ سے ایک بات یہ محسوس ہوئی کہ بہ نسبت دیگر محدثین کے حنفی محدثین کی اکثریت صاحب زہد وقناعت مشتغل لعبادۃ فائز بمراتب قرب وولایت منقطع عن الدنیا اور راغب الی اللہ تعالیٰ نظر آئی جو جماعت حنفیہ کے لئے باعث صد افتخار ہے اور یہ وہ آثار مبارکہ ہیں جن سے حنفی مسلک کے مقبول عنداللہ ہونے پر استشہاد کیا جاسکتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

نوٹ:۔ یوں تو مجموعی حیثیت سے جلد ثانی جلد اول کی طرح ساری ہی سینکڑوں عجائب ونوادر علمیہ وتحقیقات عالیہ سے مملو ہے جس کا صحیح اندازہ پورے مطالعہ کے بعد ہر شخص کرسکتا ہے' فقیر نے صرف چند مقامات کے بارہ میں اپنے تاثرات عرض کئے ہیں' ورنہ ایک مستقل رسالہ اس جلد کے محاسن پر لکھا جاسکتا ہے۔

مکتوب گرامی مولانا حکیم محمد یوسف صاحب قاسمی بنارسی دامت فیوضہم

انوار الباری حصہ اول کے بعد حصہ دوم نظر افروز' نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول کا نقشہ آنکھوں میں پھر گیا۔ الحمدللہ جس طرح محاسن ظاہری سے آراستہ ہے اس سے بڑھ کر معنوی خوبیوں کا حامل ہے' مطالعہ سے مجھ ایسے ہیچمدان کو بیش بہا اور گراں قدر فوائد حاصل ہوئے' مولف محترم کے لیے ہر بن مو سے دعا نکلی کہ باری تعالےٰ ان کی حیات نافعہ کو اس خدمت جلیلہ کے لیے باقی رکھے تاکہ یہ خدمت اتمام تک پہنچے' اور اس تالیف کو حسن قبول سے نوازے اور باعث نجات ورفع درجات فرمائے' اور ان کے سینہ کو علوم و معارف کے لیے کھول دے۔

ہندوستانی مسلمانوں نے اپنے اسلاف کرام یعنی ہندی علماء کی خدمات پر جن میں اشاعت متون احادیث و تالیف شروح ہے ہمیشہ فخر کیا ہے' اب تک تمام خدمات عربی یا فارسی زبان میں ہوئی ہیں' قسام ازل نے اردو ایسی شستہ اور مقبول عام زبان میں بخاری شریف کی ایک نہایت ہی محققانہ اور بے نظیر شرح کے لیے (جو متقدمین کی تحقیقات عالیہ اور اکابر متاخرین کے افادات نادرہ پر مشتمل ہوگی ابھی ایک ہندوستانی عالم محب محترم حضرت مولانا الحاج سید احمد رضا عافاہ اللہ وابقاہ کو منتخب فرمایا' جو باعث صد ناز وافتخار ہے مقدمہ ہی سے اصل شرح کی افادیت کا اندازہ ہوگا۔

حضرت مصنف تمام احناف کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے حنفی مسلک کی تائید وتقویت کے لیے ہمت فرمائی اور قلم اٹھایا ہے' اللہ تعالےٰ ان کے عزم و ہمت میں برکت عطا فرمائے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم لوگ اس کی اشاعت میں کوشش کریں تاکہ پوری کتاب جلد از جلد منصۂ شہود پر ظاہر ہو' اس وقت حضرت مؤلف کی یہی قدردانی ہے' نہ صرف زبانی تحسین وتوصیف:

وانا العبد الضعیف

محمد یوسف قاسمی غفرلہ